

قَالَ مَا الْمُتَوَجِّعُ جُنَيْدٌ رَحِمَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ

(عِنْدَ ذِكْرِ الصَّالِحِينَ تَنَزَّلُ الرَّحْمَةُ)

بِرُخْلٍ جَمَاعَتٍ فِي عِزِّهِمْ وَكَرَمِهِمْ

(صَالِحِينَ كَاللَّاتِ بَيَانُ كَيْفِيَّتِهِمْ رَأْيِي نَازِلٌ هُوَ تِي هِي)

(بِنَاءٌ عَلَيْهِ)

حَالُ الْمَلِكِ

حَصْرًا (يَعْنِي) دَوْم

مُصَلِّحُ الْأَمَّةِ عَارِفٌ بِاللَّهِ حَضَرَتْ مُرْشِدُنَا مُقْتَدِرَانَا مُؤَلَانَا
شَاهِدُ اللَّهِ صَاحِبُ فَتْحِ بَوْرِي (عَظِيمِ) خَنْفِي حَشِي صَابِرِي شَرْفِي
نُورِ اللَّهِ مَرْقَدُهُ كَالْحَالِاتِ زَنْدُكِي

(بِحَسْبِكُمْ)

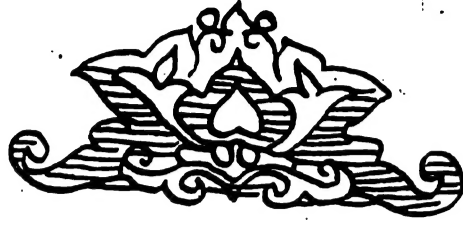
مُخْدُومٌ وَمُحْتَرَمٌ جَنَابُ مُؤَلَانَا حَافِظُ قَارِي مُحَمَّدٍ رُصْبِينَ صَاحِبِ ظِلِّ الْعَالِي

خَلِيفَةُ وَجَانِثِينَ حَضَرَتْ مُصَلِّحُ الْأَمَّةِ قَدَسَ اللَّهُ سِرَّهُ الْعَزِيزِ

(بِمَقَلَمِ)

عَاجِزٌ وَمُحِيطٌ بِعَبْدِ الرَّحْمَنِ جَاهِي عَفِي عَنِّي

مُقِيمٌ فَاثْقَاهُ وَيَكِي أَرْضَامُ حَضَرَتْ



نام کتاب حالات مصلح الائمۃ دوم

مرتب حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب جامی
علیہ الرحمۃ

ناشر دائرۃ الاشاعت خانقاہ مصلح الائمۃ
۲۳/۲۵ بخشی بازار الہ آباد۔

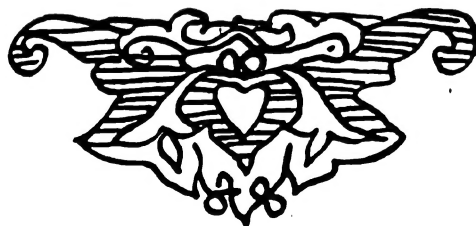
صفحات ۲۰۴

سن طباعت ۱۹۹۵ء

زیر نگرانی سعادت علی (گورینی)

قیمت حصہ اول ۱۵۰ روپے

قیمت حصہ دوم ۱۵۰ روپے



فہرست مضامین حالاً مصلح الامت (حصہ دوم)

صفحہ	فہرست مضامین	صفحہ	فہرست مضامین
۱۲۹	اسبابِ فتنہ فتح پور۔	۵	مسند ارشاد سے اصلاح امت کا کام
۱۴۰	ہجرت از وطن۔	۱۳	طلب کا معنی۔
۱۴۵	حاجی مطیع اللہ صاحب سے متعلق دو لطیفے	۱۷	طالبین اور غافلین دونوں محتاج اصلاح ہیں
۱۵۰	عالم اور عامی دونوں نائب ہو گئے	۲۱	طالبین کا امتحان بھی ہوتا تھا۔
۱۵۲	گورکھپور کا ۱۴ سالہ قیام۔	۲۶	تحریری امتحانات کے چند نمونے۔
۱۵۴	چند مخصوصین کا تذکرہ۔	۴۲	مرید صادق کی ایک صفت۔
۱۶۸	حضرت تھانویؒ کے ایک اصول پر اعتراض اور اس کا جواب۔	۴۵	بعض خواص کے مخصوص خطوط
۱۷۱	مولوی شکیل صاحب بستی حضرت والا کی خدمت میں۔	۵۴	عمومی ہدایت برائے اہل بمبئی
۱۷۳	مولوی صاحب موصوف کے خطوط۔	۶۱	دو بڑے علماء ہند کی حضرت سے پہلی ملاقات
۱۹۴	حضرت کی جدائی کا تاثر اہل گورکھپور پر۔	۶۲	”تجدیدِ نعمت“ از مولانا نعمانی مدظلہ
۱۹۷	خط حاجی ولی محمد صاحب۔	۷۵	”پرانے چراغ“ سے حضرت کے حالات
۱۹۸	خط حکیم وجیہہ اللہ صاحب۔	۹۳	از مولانا علی میاں مدظلہ
۱۹۹	خط جناب ماسٹر واجد حسین صاحب۔	۹۴	حضرت اقدس کی اصلاحی مساعی
۲۰۱	خط حکیم مولوی عبدالحق صاحب۔	۱۲۳	اصول تنظیم۔
۲۰۶	مولانا محفوظ الرحمن نامی کا مکتوب گرامی۔	۱۲۴	سب علماء کا اگر مدعا ایک ہے تو پھر ان میں اشتراک عمل کیوں نہیں ہوتا؟
۲۰۸	حضرت کے درس کے بعض شرکاء	۱۲۷	اسی نوع کا ایک اور سوال و جواب۔
			مولانا عبد الباقیؒ، مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ اور حضرت مصلح الامتؒ۔
			عود الی المقصود فتح پور کا دور زریں۔

فہرست مضامین	صفحہ	فہرست مضامین
بھائی ایتس احمد کی کہانی خود انکی زبانی۔	۲۰۹	حضرت کے مدرسہ کا اصل سبب۔
شاہ عبدالمعبود صاحب کا عجیب واقعہ۔	۲۱۱	گورکھپور میں شیطانی اسکیم اور
زمانہ قیام الہ آباد میں وطن کے حالات۔	۲۱۶	حضرت کی منتقلی کے اسباب
گورکھپور کے معاملات۔	۲۲۷	حضرت والا کی علالت اور سفر الہ آباد
بعض حالات اہل الہ آباد۔	۲۲۷	استقامت علی الدین کی تحیرت انگیز مثال
ایک اہم انتباہ۔	۲۴۳	الہ آباد میں حسن منزل کا قیام۔
اہل الہ آباد کا معافی طلب کرنا	۲۴۶	شرکار مجلس کے مخصوص حضرات۔
بمرولی کا قیام۔	۲۵۱	الہ آباد تشریف لانے والے
اُتراؤں کا سفر۔	۲۶۱	اکابر علماء۔
مہیوہ کا سفر۔	۲۶۲	حضرت کے معالج اطباء عظام۔
فتحپور مہسوہ کا سفر۔	۲۶۳	” ” ” ڈاکٹر صاحبان۔
الہ آباد کے علماء و مشائخ اور	۲۶۹	حکیم سید فخر الدینؒ کے بعض حالات۔
حضرت مصلح الامتؒ۔	۲۸۸	الہ آباد کے چند مخلصین کے حالات۔
بعض خواص الہ آباد کے حالات۔	۲۹۲	بخشی بازار کے مکان میں منتقلی کے اسباب۔
مولانا سراج الحق صاحب	۳۰۳	خریداری مکان میں رکاوٹ اور اسکا ازالہ
مچھلی شہریؒ	۳۰۷	حضرت کے ایک خادم کی امامت
مولوی عبدالقدوس رومی سلمہ	۳۱۰	عید گاہ پر ایک فتنہ۔
مولوی قاری حبیب احمد صاحب	۳۱۱	” آپکے شہر میں آکر مجھے ایک فیض ملا۔“
مظاہری	۳۱۲	حضرت کی زاہدانہ شان۔
		حضرت کے حسن خلق پر علامہ بلیاویؒ کی شہادت۔

حضرت مصلح الائمہؒ کے حالات کے سلسلہ میں حضرت کے طریق کار پر سطور گزشتہ میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے ناظرین کو حضرت کے مشاغل دینیہ اور مزاج والا کا فی الجملہ اندازہ ہو گیا ہو گا اب اسکے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسند ارشاد پر فائز ہو کر حضرت نے اصلاح امت کے سلسلہ میں جو کام کیا اور اس کے لئے جیسا کچھ تعب برداشت کیا اسکا بھی کچھ خاکہ پیش نظر کر دیا جائے تاکہ ناظرین کے سامنے سلف صالحین کے کارناموں اور اشاعت دین کے باب میں انکی محنتوں کا کچھ نقشہ اور اسکا کچھ نمونہ بھی آجائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی بندہ سے کام لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ اپنے ایک ایک بندے سے ایسا ایسا بڑا کام لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اسلاف کا طریقہ بھی یہی رہا ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے پہلے جماعت اور کمیٹی وغیرہ نہیں بناتے بلکہ خود کام کرنا شروع کر دیتے تھے اپنی ذات کو اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کیلئے وقف کر دیتے تھے اور پھر انکے اسی اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی اصلاح فرما دیتا تھا ایک مجمع کثیر کو ان حضرات کے گرد جمع فرما دیتا تھا حضرت اقدس مصلح الائمہؒ نے سب سے اہم اور اقدم جن امور کو سالک کے لئے ضروری گردانا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ صحیح دین پر لگنے کے لئے اور اصلاح نفس کیلئے ضروری ہے کہ انسان کسی کو اپنا مصلح رہبر اور شیخ تجویز کرے، اور شیخ تو بس ایک ہونا چاہیئے چنانچہ اسکی تفصیل ایک طالب کے مکتوب ذیل میں ملاحظہ فرمائیے انھوں نے حضرت اقدسؒ کو لکھا کہ :-

حال : حضرت والا اپنی کمی کا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن احساس کے موافق عمل میں دوام مشکل ہو جاتا ہے۔

تحقیق : عمل تو مشکل ہے ہی مگر طالب کیلئے نہیں طلب پیدا کرنا چاہیئے۔

حال : حالانکہ اسی کی بڑی ضرورت اور یہی بہت بڑی کمی ہے۔

تحقیق : ہاں کمی ہے اسکی وجہ میں نے لکھ دی (یعنی طلب کا نہونا)

حال : حضرت والا صحیح یہ ہے کہ شخصیت پرستی کو (غالباً شہرت عامہ کی بنا پر ان

مولوی صاحب نے یہاں پرستی کا لفظ استعمال کیا اور نہ مراد انکی اس سے یہاں تقلید شخصی ہوگی اور تقلید اور چیز ہے اور پرستی کا اور مفہوم ہوتا ہے ایک لازم اور ضروری ہے اور دوسری حرام ہے) پہلے میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا (بس) یہ ضرور سمجھتا تھا کہ بڑوں کے یہاں جانے سے کچھ اصلاح ضرور ہو جاتی ہے لیکن یہ کہ اصلاح انھیں (حضرات کے پاس جانے) میں منحصر ہے اسکے قطعی خلاف تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ائمہ اور اسکے رسول کی کتاب میں سارے اعمال موجود ہیں اور بزرگان دین بھی اسی (کتاب و سنت) پر چلکر خدا کے برگزیدہ بندے ہوئے ہیں لہذا اگر ہم بھی صحیح معنوں میں ان اعمال کی اتباع کریں تو ہم بھی اس درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اب میں نے کچھ تھوڑا سا حضرت کی کتاب وصیۃ الافلاص کا مطالعہ کیا تو معلوم یہ ہوا کہ صحیح معنوں میں اتباع ہی تو مشکل ہوتا ہے اور واقعی یہ کتاب ایک عالم کے لئے ایک بار نہیں ستر بار مطالعہ کرنے کی ہے اور اس پر عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے (یعنی اسکے مطابق عمل کرنے کی، تحقیق) بیشک صحیح سمجھتے ہو۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ مولوی صاحب نے آجکل کے نئے فارغین اور جدید اہل علم حضرات کے خیال کی خوب ترجمانی فرمائی اس مغالطہ میں آج ایک دنیا مبتلا ہے اور مبتلا کیسے انکو بتلایا گیا ہے اور یہیں سے دین کی شاہراہ سے انھیں گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ ہدایت و ضلالت خدا کے قبضہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے صالحین و مخلصین کو ضائع نہیں فرماتے) حال: ہم نے الفاظ بخاری تو ضرور ختم کر لیا ہے لیکن امام بخاریؒ نے کتاب کس مقصد کے لئے لکھی اس مقصد کی طرف نظر نہیں گئی۔ حضرت اس للہیت کی طرف متوجہ کرانے کی دو شخصوں کو ضرورت ہے اول اول تو استاد ہی کا حق ہے کہ الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی کی طرف بھی توجہ دلائیں اسلئے کہ طالب بحیثیت طالب ہونے کے ذہن اسکا خالی ہوتا ہے اسلئے اگر یہ لوگ اسوقت تنبیہ کرتے جائیں تو زیادہ اثر پڑے چنانچہ پہلے کے اساتذہ ایسے ہی ہوا کرتے تھے اسی لئے طالب علم جب نکلتا تھا تو

بیک وقت وہ بیہوشی وقت اور غزالی وقت ہوا کرتا تھا۔

تحقیق: بیشک ٹھیک لکھ رہے ہو، ٹھیک کہتے ہو (مگوا سا تذہ ایسا کریں تب تا انکو تو خود اپنی اصلاح کی ضرورت ہے)

حال: لیکن حضرت آجکل ایسے اساتذہ کیاب ہیں بلکہ آجکل اساتذہ نے اسکو دو جگہ منقسم کر دیا ہے یعنی اپنے ذمہ الفاظ کر کے معانی کو بزرگوں کے حوالہ کر دیا ہے جو بڑی غلطی ہے۔ تحقیق: صحیح ہے۔

حال: لہذا (آج اب) منحصر ہو گیا کہ للہیت پیدا کرنے کے لئے کسی خدا رسیدہ کا دامن ہاتھ میں مضبوط پکڑا جائے جو اعمال میں للہیت پیدا کر دے اور خدا کی صحیح معرفت کا پتہ دے۔ تحقیق: بیشک بیشک

حال: رہا یہ سوال کہ اس میں کسی ایک شخص کی شخصیت پرستی (یعنی تقلید شخصی) کی کیا ضرورت ہے، بیک وقت کسی ایک بزرگ سے اصلاح ہو سکتی ہے (اور دین کی انہی بات جہاں سے کبھی لمبائے لے لینے میں کیا حرج ہے) یہ سوال میرے ذہن میں بہت دنوں سے کھٹکتا رہا جو محمد امجد حضرت کی دعاؤں کی برکت سے اس طرح حل ہوا کہ چونکہ ہر ایک بزرگ کے طریقہ اصلاح میں فرق ہوتا ہے لہذا مرید (طالبین) کے ذہن میں کبھی یکسوئی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس طریق میں یہی اصل اصول ہے تحقیق: الحمد للہ خوب حل ہوا اور فرق بھی خوب سمجھ میں آیا۔ صحیح سمجھتے ہو۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ اسی مسئلہ کے متعلق حضرت حکیم الامتہ کیا فرماتے ہیں

ملاحظہ فرمائیے :-)

فرمایا کہ ”پہلے تو میری عادت تھی کہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علماء و مشائخ سے ملتا تھا چاہے کسی مشرب کا ہو اور اب تجربہ کے بعد یہ عادت نہیں رہی۔ اور اب تو میں خود اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ یہ طرز خطرناک ہے۔ پہلے لوگوں کے طبائع میں سلامتی تھی اور اب شرارت ہے آجکل بجائے کسی نفع کے مضریت کا اندیشہ ہے اور جو ایسا کرتے

میں انکو اکثر الجھن ہی میں دیکھتا ہوں بکثرت اس قسم کے خطوط آتے ہیں
 جن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ فلاں سے ملا فلاں سے ملا اور اب فسادِ قلب
 کی یہ کیفیت ہے۔ بتدی کو مختلف لوگوں سے ملنا نہیں چاہیئے اسلئے
 کہ انتشار ہوتا ہے، طبیعت میں یکوئی نہیں رہتی اور اس طریق میں ضرورت
 ہے یکوئی اور جمعیتِ قلب کی اور جب وہی اس صورت میں نہیں
 رہتی تو پھر نفع کہاں؟ انتہی

(ملفوظات حصہ پنجم ص ۱۲۱)

لاحظہ فرمایا آپ نے حضرت تھانویؒ جو اپنے زمانہ میں طریق کے مسلمہ امام
 گذرے ہیں اپنے عمل اور تجربہ سے اسکو مضر فرما رہے ہیں۔ اور ہمارے حضرت
 نور اللہ مرقدہ تو فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اس طریق کی نزاکت اور آداب کا تو کچھ ایسا
 معاملہ ہے کہ پیر تو بس ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اور یہ فرماتے تھے کہ جس طرح سے خدا ایک
 خدا کا رسول ایک، باپ ایک، عورت کا خاوند ایک، پیر بھی بس ایک ہی ہونا چاہیئے
 معلوم ہوا کہ طریق میں سلوک و تسلیم کے لئے کسی ایک ہی کو انتخاب
 کرنا ہوگا اور قلب کو تشنگی سے بچانے کے لئے اور اسکی یکوئی اور جمعیت کو باقی
 رکھنے کے لئے کسی ایک ہی شیخ اور ایک ہی مشرب کو اختیار کرنا ہوگا۔ شاید بزرگوں
 کے اس ارشاد کا کہ۔ یک در گیر و محکم گیر۔ یہی محل ہو۔ اس کا صحیح نام تقلیدِ شخصی
 تو ہو سکتا ہے شخصیت پرستی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ غلط العوام یا غلط العام کی راہ سے
 آج یہ زبان زدِ خاص بھی ہو گیا ہے)

حال: گو ہر بزرگ کا مرجع ایک ہی ذات (ذاتِ حق) ہے لیکن وہاں تک نہ جانے
 کے لئے چونکہ سب کے طریقے مختلف ہیں لہذا مرید کو سب کے طرق پر چلنا مشکل بلکہ
 ناممکن ہو جائیگا ٹھیک اسی طرح سے جیسے کہ ائمہ اربعہ کے سب حق پر ہیں اور سب کا مرجع
 بھی ایک ہی ہے لیکن ہر ایک کے طریقہ میں بون بعید کا فرق ہے سو اگر کوئی چاہے
 کہ بیک وقت وہ منفی بھی اور شافعی بھی ہو تو یہ ناممکن ہے بلکہ ایسا شخص اہل سنت والجماعۃ

کے طریقہ سے خارج ہے لہذا ضروری ہوا کہ کسی ایک امام کی اتباع کرے اور اسی کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کرے اور جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں رسول کی رسالت میں شرکت نہیں مسلک خفیت اور شاعت میں شرکت نہیں اسی طرح ایک شیخ کی مشیخت میں بھی کوئی دوسرا ہرگز ہرگز شریک نہیں ہو سکتا۔ پس ایک مرید کے لئے ضروری ہو گیا کہ اپنا شیخ واحد تسلیم کرے اور اس کے ہر ایک ارشاد کو اپنے لئے فلاح دارین کا سبب جانے اور اس کے کردار و گفتار کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ شیخ کی صحبت اور معیت اختیار کرے۔

تحقیق : بیشک، بیشک۔

حال : حضرت یہ نعمت غیر مترقبہ (یعنی آپ کی صحبت کا حصول) جب اپنے پاس تھی تو کچھ قدر نہ تھی اور اب جبکہ دور ہو گئی (یعنی آپ وطن سے چلے گئے) تو کچھ سمجھ میں آیا لیکن صحبت دور ہو چکی تھی)۔

تحقیق : غنیمت ہے کہ آیا (قدر نعمت بعد زوال تو مشہور مقولہ ہی ہے)۔

حال : لیکن حضرت بڑی چیز عظمت (و محبت) شیخ ہے اگر یہ دل میں ہے تو حضرت بھی دل سے قریب ہیں ورنہ جسد کے اعتبار سے قرب کوئی قرب نہیں ہے، حضرت کے عتاب سے کچھ سمجھ میں آیا۔ تحقیق : بیشک

ملاحظہ فرمایا آپ نے طریق میں یکسوئی کی ضرورت آج ہمارے درمیان سے یہی رخصت ہو چکی ہے اسی لئے فیض بھی ناپید ہو گیا ہے۔ چنانچہ جس طالب میں لگا اہتمام دیکھتے تھے اس سے حضرت مصلح الامۃ اپنی بڑی خوشی کا اظہار فرماتے اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ راستہ پر لگا ہوا ہے۔ ایک طالب مخلص کا عریضہ ملاحظہ فرمائیے:-

حال : حضرت گذشتہ دو مفتوں میں ہمارے شہر میں دو بزرگ یکے بعد دیگرے تشریف لائے تھے۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک صاحب کی مجلس بھی بھائی صاحب کی کوشش سے مدرسہ میں ہوئی اور دونوں حضرات کے وعظ بھی ہوئے جن میں ناکارہ بھی شریک رہا لیکن حضرت کیا بتاؤں کہ دل دوسری ہی طرف لگا ہوا تھا۔ قلب میں

برابر یہ بات موجزن رہتی تھی کہ ہمارے حضرت کی مجلس کے سامنے یہ مجلس کچھ بھی نہیں
حضرت! یہ کچھ برا تو نہیں؟ حالانکہ اب تک یہ ناکارہ (حضرت والا کی مجلس میں) شرکت
کے شرف سے محروم ہے، تاہم تصور میں ایک نقشہ ذہن میں بنادیا تھا حالت یہ تھی طر
”ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ما ہے“ حضرت! اب حاضری کا اشتیاق بہت
زیادہ ہو گیا ہے کسی لمحہ چین نہیں ہے۔ حضرت والا کی یاد بہت تازہ ہی ہے دعا فرماؤ
کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد خدمت میں پہنچا دیں۔

تحقیق: سلام علیکم چوں در خاطر می گز از چشم دوری بدل حاضری
آپ نے دو بزرگوں کا ذکر کر کے اپنا حال تحریر فرمایا اور یہ استفسار فرمایا کہ یہ برا تو نہیں؟
سبحان اللہ برا کیسے ہو سکتا ہے آپ نے تو اخیر میں اسکا عشقی جواب بھی عنایت فرمایا ہے
میں اسی کی قدرے تفصیل لکھتا ہوں۔

گفت معشوقے بعاشق اے فتی تو بغربت دیدہ بس شہر ہا
(ایک معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ ارے میاں تم نے تو مسافت میں بہت شہروں کی میر کی ہے)
پس کد امی شہر از آں خوشتر است گفت آں شہرے کہ در و دلبر است
(یہ تو بتاؤ کہ انہیں سب بہتر کون سا شہر تھیں معلوم ہوا اس نے کہا مجھے تو وہی شہر سب عمدہ نظر آیا جس میں میرا محبوب تھا)
اور سینے:-

ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ما ہے چہ کم کہ چشم بدخو نہ نکند بکس نگاہے
(گو تمام شہر حبیبوں سے پرے لیکن میں ہوں اور اپنے ماہر و کا خیال ہے کیا کوں میری بدخواہی کسی دوسرے کو نظر اٹھا کر دیکھنے کیلئے تیار نہیں ہوتی)
یہ کیفیت مسمیٰ بعشق ہے اسی کے کمال کو فنا کہا جاتا ہے۔ آخر خط میں آپ نے
اسکے اثرات کا ذکر فرمایا ہے۔ مبارک ہو عاشق کو اسکا عشق۔ ملاقات کی بھینپی بھی
اسی عشق سے مسبب ہے اسکے لئے بھی دعا کرتا ہوں۔

اسی سلسلہ کا ایک اور عریفہ ملاحظہ فرمائیے:-

حال: حضرت والا! یہاں مدرسہ کے مولوی صاحبان جب حضرت والا کی خدمت
میں خط لکھتے ہیں تو اول مجھے دکھاتے ہیں کچھ اس میں ترمیم کرنا ہوتا ہے تو کر دیتا ہوں

کوئی غیر ضروری بات ہوتی ہے تو اسکو کاٹ دیتا ہوں یہ مناسب ہے یا نہیں تحقیق : خوب مناسب ہے ۔ بکھنے کا ڈھنگ (اور طریقہ) سکھاتے ہیں (اس سے بڑھکر کیا بات ہے) ۔

حال : یہاں حضرت مولانا ۔۔۔ صاحب تشریف لائے تھے اسکے دو ہفتہ قبل حضرت مہتمم صاحب (دیوبند) بھی تشریف لائے تھے ۔ حضرت مہتمم صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں سے کون بزرگ حضرت اقدسؒ کے طریقہ پر زیادہ ہیں تو فرمایا کہ پاکستان میں حضرت مولانا محمد من صاحب (امرتسریؒ) حضرت اقدسؒ کے طرز پر کام کر رہے ہیں لیکن وہ ہوتا تمام باتوں میں حضرت اقدسؒ ہی کے طرز پر بس ایک مولانا وصی اللہ صاحب ہی ہیں ۔

تحقیق : میرے لئے اس سے بڑھکر کیا ہو سکتا ہے مگر کہاں میں اس قابل ہوں ۔ آپ دعا کیجئے ۔

حال : حضرت مہتمم صاحب کا یہ قول ایسے ہی ضمناً میں نے عرض کر دیا کیونکہ میرے لئے اس میں راحت کا سامان تھا ۔ تحقیق : بیشک

حال : میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کل ایک مولوی صاحب نے حضرت کے نام خط لکھ کر مجھے دکھایا تھا اس میں بعض حضرات (علماء) کی یہاں تشریف آوری وغیرہ کا ذکر تھا تو میں نے ان سے کہا کہ ویسے تو یہاں اکثر علماء آتے ہی رہتے ہیں تم کس کس کا ذکر کرتے رہو گے اسکی کیا ضرورت ہے ۔ میری حالت یہ ہے کہ چونکہ یہاں بعض حضرات نے سلوک میں گڑبڑ پیدا کر دیا ہے ، طریق سے بیگانگی ہو گئی ہے جنکی وجہ سے اہل اللہ سے لوگوں کو بدظنی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے لہذا اگر ہمارے میں سے کوئی ایسا آجاتا ہے جن سے غلط فہمی کے ازالہ کی توقع ہوتی ہے تو میں محض اس نیت سے ان کے وعظوں میں شرکت کر لیتا ہوں کہ میری کنارہ کشی کا اثر عام لوگوں پر پڑتا ہے تحقیق : بڑی مصلحت ہے ۔

حال : دور نہ میرا دل تو بجز حضرت والا کے کسی اور کی طرف آنکھ نہیں اٹھاتا ۔

تحقیق: مبارک ہو

حال: دل آراے کرداری دل ورو بند وگر چشم از سمہ عالم فرو بند
(جو ذات کہ قلب کو راحت پہنچانے والی ہے اس محبوب کے ساتھ دل کو
لگاؤ اور دوسری سب چیزوں سے آنکھ بند کرلو)

تجھ میں وہ کون سی ادا اے مرے با خدا نہیں
(اور میں نے ان سے کہا کہ) یاد رکھو کہ جبکو اپنے شیخ سے مخلصانہ (اور قوی نسبت حاصل
ہو جائے اس نے بڑی نعمت حاصل کر لی اسی کا نام وحدت مطلب ہے اور پیر و مرشد
سے صحیح استفادہ کے لئے یہ شرط ہے۔ تحقیق: بیشک بیشک۔
حال: یہ نہ تو بس اسکا حال یہی ہو جاتا ہے عجز و خدای ملائہ وصال صنم نہ ادا کر کے ہو نہ ادا کر کے ہو
پس کوئی عالم آجائے تو وقتی طور پر مصالح کے پیش نظر انکے وعظ و مجلس میں شرکت کر لیا
باقی حال یہ ہے کہ

جس نے چشم نکمہ ہیں دیکھ لیا وہ مہ جبیں اسکی نظریں پھر کہیں کوئی عیسیٰ جی نہیں
حضرت والا! اس میں دوسرے بزرگوں کی نفوذ باللہ توہین (اہانت) تو نہیں۔ واللہ
مقصود اسکا بالکل نہیں ہوتا۔

تحقیق: نہیں ہرگز نہیں۔ یہ غیرت ہے جو لوازم عشق سے ہے (یعنی طریق میں ایک
ضروری شے ہے)

ملاحظہ فرمایا آپ نے سالک کیلئے اپنی تسلیک کے سلسلہ میں جو شے سب سے
ضروری تھی یعنی ایک شیخ سے مخلصانہ تعلق جس کا دوسرا نام وحدت مطلب ہے
اسکی اہمیت مذکورہ بالا مکاتبت میں کس قدر نمایاں ہے۔

اسی طرح سے سالک کیلئے ایک اور چیز کی بھی حاجت ہے اسکا نام طلب
ہے۔ اس کا بھی مطالبہ کتنی شدت سے فرمایا گیا ہے اور طلب کسے کہتے ہیں اسکو
خود حضرت مصلح الامۃ؎ نے بارہا حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ کے کلام
سے نکال نکال کر سنایا ہے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ :-

طلب بر جان طالب چناں غالبؔ طلب کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ طالب کی جان پہ
 واستیلا یا بد کہ هیچ مقصودے و هیچ آرزوے اس طرح سے غالب جاتی ہے اور اسکو اسکا استیلا ہو جاتا
 ازاں مانع نہ آید و غلبہ شوق و تعطش باں سرحد کہ مطلوب کے حصول میں کوئی اور شریک کوئی اور آرزو یا خیال رکاوٹ نہ
 رسد کہ اگر عقلا عالم حکم کنند کہ وصول بدیں ڈال سکتا اور شوق کا غلبہ وصول مطلوب کی پیاس مقدّر بڑھ جاتی ہو کہ
 مطلوب محال است و حصول اس متعذر اگر تمام دنیا عقلا ملکر حکم کریں اے میا تمھارا یہ طلب حاصل ہونا محال
 اس سخن در گوش اصلا راہ نیابد۔ ہے اور بالکل متعذر ہو تو انہی بات کی طرف یہ طالب کان بھی نہ لگائے

(کتاب المکاتیب ص ۴۷) (اور اپنی دھن میں لگا رہو اسکا نام ہے طلب صادق)۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک طالب مخلص کا اپنا حال جو انھوں نے حضرت
 مصلح الامۃ کے پاس لکھا پیش کر دوں اس سے اندازہ ہو جائیگا کہ اللہ کے دین کے طالب
 کس طرح سے خود کو شیخ کے حوالہ کیا کرتے ہیں۔

حال : " بندہ مدرسہ عالیہ دیوبند سے ۱۳۷۶ء میں حضرت مرشدی و مولائی سید حسین احمد
 صاحب مدنی سے سند فراغت حاصل کر چکا ہے اور آنحضرت سے رسمی طور پر بیعت بھی کی تھی
 لیکن فیض صحبت سے محروم رہا اب بوساطت جناب مولانا ۔ ۔ ۔ کے آپ کے حضور کا
 تعارف نصیب ہوا۔ حضرت والا کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کر چکا ہوں بعدہ خود بھی منگوائی
 بعد مطالعہ حضور والا شان سے حد درجہ عقیدت بندھ گئی ہے اور محبت بھرے جذبات سے
 بذریعہ عرفیہ بڑا حاضر خدمت ہو کر معروض ہوں کہ اگر کم نوازی فرمائی جائے تو بندہ کو اصلاح
 حال میں رہنمائی فرمائی جائے۔

بندہ پُر تقصیر اپنے عیوب کو کسی طرح بھی شمار نہیں کر سکتا لیکن خاص خاص عیوب
 پیش خدمت کرتا ہے۔ اول یہ کہ بندہ میں اتنا نیت حد درجہ پائی جاتی ہے، میں اپنے آپکو
 بہت بڑا عالم سمجھتا ہوں حضرت مدنیؒ کی شاگردی کی وجہ سے دل میں بڑا فخر رہتا ہے۔ دوسرے
 لوگوں کو خواہ وہ عالم ہی کیوں نہ ہوں جاہل تصور کرتا ہوں، بعض علمی مقابلوں میں کامیابی
 کی وجہ سے یہ چیز پیدا ہو گئی ہے دل چاہتا ہے کہ کسی اللہ کے مقرب بندے سے ملاقات ہو تو

ان عیوب کو پیش کر کے اصلاح کراؤں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوا تو آپ کی طرف رہنمائی فرمائی گئی۔

صرف علمی ہی معاملہ میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں مجھ میں انانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً جوان ہونے میں اور دیگر دنیوی امور میں اپنے آپ کو صائب الرائے تصور کرتا ہوں۔ دوم بد معاملگی (یعنی دین کی بے اعتدالی) چنانچہ بعض دوستوں سے قرض لیکر واپس ادا نہیں کیا۔ کچھ تو اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے اتنی رقوم ہیبا نہ ہو سکیں اور کچھ مہیا بکھی اگر ہوئیں تو کوئی خاص پروا نہ کی۔

سوم بندہ کی دو بیویاں با اولاد ہیں جنہیں اکثر تنازع رہتا ہے رفع تنازع میں مجھ سے اکثر زیادتی ہی ہوتی رہی۔

چہارم بد اخلاقی (یعنی) عملی نفاق کا درجہ بھی کم نہیں۔ نیز بعد فراغت قرآن مجید بھی حفظ کیا لیکن وہ ضبط نہ رہ سکا اپنی سستی اور کمزوری سے اسکو بھلا دیا وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ بھی اور اتنے عیوب سے پُر ہوں کہ قلم میں لکھنے کی تاب نہیں۔ رب قدوس کے فرشتے ہی اسکو شمار کر سکتے ہیں۔ یہاں صاحب فضیلت جناب مولانا۔۔۔ صاحب موصوف ہیں مآثر اللہ انکے فیض صحبت سے کافی فائدہ ہوا لیکن انکی صحت کی حیرانی سخت مانع رہی۔ نیز وہ بھی فرماتے تھے کہ میں مجاز نہیں ہوں (یعنی آپ سے مجاز بیعت نہیں ہوں) اسلئے بندہ (جناب ہی سے) بیعت کی بھی درخواست پیش کرتا ہوں باقاعدہ سلوک سکھایا جائے اور ابتدائی تعلیمات تحریر فرمائی جائیں خط و کتابت یکملے مولانا جامی صاحب کی معرفت ایک روپیہ ارسال خدمت کر دیا گیا ہے۔ اگر حضور مولانا۔۔۔ کے حق میں دعائے صحت فرمادیں تو بڑے کام کی چیز ہو۔ بصورت صحت امید کی جاسکتی ہے کہ ان سے مخلوق فائدہ حاصل کر سکے۔ بعض دوستوں کی یہ بھی رائے ہے کہ انھیں حضرت والا کی خدمت میں پہنچانے کی کوئی سبیل بنائی جائے تاکہ وہ فیض صحبت سے بہرہ ور ہو کر ہم تشنگان کے لئے مشعل راہ بن سکیں و ما توفیقی الا باللہ۔

(حضرت مصلح الامۃ کا جواب)

آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپکی خوش فہمی اور حسن عقیدت سے جی بہت خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس میں یونما فیو ترقی عطا فرمائے۔ میں کیا اور میری تالیفات کیا۔ آپ انشا اللہ خود بھی عالم میں اور پھر بڑی در سگاہ سے آپ کا تعلق، باہنہ آپکی نظروں میں اسکی تحسین میری ہمت افزائی کا سبب بنی، اللہ تعالیٰ انکو نافع خلأق بنائے اور مجھے زیادہ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مولانا۔۔۔ صاحب سے آپکا تعلق معلوم کر کے خود کو بھی آپ سے ایک خاص تعلق ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اسکو جانبین کے لئے مفید اور کار آمد بنائے اور دارین میں اسکے ثمرات سے سب کو بہرہ ور فرمائے۔ آمین۔

اصلاحی تعلق کا خیال ظاہر فرمایا گیا ہے۔ تو کلاً علی اللہ بخوشی منظور ہے۔ اللہ تعالیٰ اسکو جانبین کے لئے مثمر بنائیں۔ آپ نے اپنے حالات بھی کچھ تحریر فرمائے ہیں اس سے اسکا اندازہ تو ہو ہی گیا کہ الحمد للہ آپکو فکرو ہو چکی ہے اور احساس پیدا ہو گیا ہے اسی کو طلب کہتے ہیں)

مولانا! طریق میں اصل یہی ہے کہ فکرو احساس پیدا ہو جائے۔ اگر صحیح معنوں میں یہی چیز انسان میں پیدا ہو جائے تو پھر مجال نہیں کہ انسان رذائل سے متصف باقی رہ سکے اپنے امراض قلب کے ازالہ کی فکر اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا ہونے کا غم جو کہ صورتہ دو ہے مگر حقیقتہً ایک ہی چیز ہے۔ یہی چیز جب آدمی میں پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ کامیابی ہو جاتا ہے۔ طریق میں غم محمود بلکہ مطلوب ہے۔

غم، چہ استادہ تو بردور با؟ اندر آیار ما بردر ما!
باقی یہ ہو سکتا ہے کہ اسکو پیدا ہوتے ہوئے کچھ عرصہ لگ جائے اور آپ نے جس مرض کے متعلق پہلے لکھا ہے مشائخ اسکے متعلق فرماتے ہیں کہ علماء کا مخصوص مرض یہی ہے اور یہ سب سے آخری چیز ہے جو کہ صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے۔ سینے ابن ماجہ شریف کی ایک حدیث ہے۔

عن جابر بن عبد اللہ ان حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

النبي صلى الله عليه وسلم قال لا تعلموا
العلم لتباهوا به العلماء ولا لتماروا
به السفهاء ولا تحيزوا للمجالس فمن
فعل ذلك فالنار النار

علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم کو اسلئے مت سیکھو کہ اسکے ذریعہ
علماء پر مغائرت کرو اور نہ اسلئے کہ جہلاء پر رعب جھاؤ اور
محافل و مجالس میں صدر نشینی نہ تلاش کرو، جس نے
یہ سب کیا تو جہنم سے ڈرے۔

”لا تحيزوا“ کے تحت حاشیہ میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث و ملوی
تحریر فرماتے ہیں :-

التحيز التمكن والتقرر المراد منه
لا تمكنوا في قلوب الناس لتكونوا صدراً
للمجالس فانه من اشد اغراض الدنيا
لان آخر ما يخرج من قلوب الصديقين
حب الجاه وهذه عقبة كؤودة للعلماء
لا ينجو منه الا المخلصون

تجز کے معنی میں تمکن اور تقرر کے مراد یہ کہ لوگوں کے قلوب
میں ایسے نہ بنو کہ وہ تمکو مجالس کا صدر بنا دیں نہ یہ اغراض دنیویہ
میں بدترین شے ہے کیونکہ صدیقین کے قلوب میں جو ذیلہ کہ سب سے
آخر میں نکلتا ہے وہ یہی حب جاہ ہے اور ایک شواہد اور
حب الجاہ و هذه عقبة كؤودة للعلماء گھاٹی ہے علماء کے لئے، جس سے کہ مخلصین ہی
نجات پاسکتے ہیں۔

دیکھئے ابن ماجہ کی یہ حدیث اور اسکی جو شرح محشی نے نقل فرمائی ہے کہ سقدر
موثر تر یہی ہے علماء کے لئے۔ اگر آج اس قسم کی احادیث ہمارے پیش نظر ہو جائیں
تو اخلاص پیدا کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔ چنانچہ اہل علم کے مجمع میں یہ گفتگو ہوئی کہ علماء
میں آج جو یہ غفلت ہے اسکا سبب کیا ہے؟ کسی نے کہا کہ تعلیم و تعلم کا شغل ہی ان کو
ادھر (یعنی اپنے قلب کی اصلاح کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ اس پر کسی دوسرے
نے کہا کہ بھائی (تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں) احادیث میں آخر کتاب الرقاق اور کتاب الزہد
بھی تو ہے جن میں ایسی ایسی روایات بھی ہیں جو ابھی بیان ہوئی۔ پس غفلت کا سبب
درس و تدریس نہیں ہے بلکہ ان ابواب کا پیش نظر ہونا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ آج
علماء ان ابواب کو بالخصوص اس قسم کی روایات کو برابر پیش نظر رکھیں، اسی سے یہ غفلت
زائل ہوگی۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ یہ صحیح علاج ہے۔

تصوف کوئی بدعت تو ہے نہیں مشائخ محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی

تصوف وہی ہے جو قرآن و حدیث سے ماخوذ ہو۔ میں بھی اجاب کو بالخصوص اہل علم کو اس جانب متوجہ کرتا رہتا ہوں کہ آپ کے پاس قرآن کا علم موجود احادیث موجود پھر ان کے بعد آخر کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دل سے انکی تصدیق کیجئے انکو پڑھئے اور ان پر عمل کیجئے پھر دیکھئے کہ قلب ٹھیک ہو جاتا ہے یا نہیں۔ یہاں ہندوستان کے ایک مشہور عالم نے مجھ سے کچھ دریافت کیا تھا میں نے انکو مفصل خط کچھ اسی قسم کے مضمون پر مشتمل لکھا۔ غالباً وہ "الفرقان" میں اس ماہ شائع ہو گا مل جائے تو دیکھئے گا۔

دراقم عرض کرتا ہوں کہ مراد اس خط سے شاید مولانا مناظر احسن گیلانی کا خط ہو جو ابتداء حالات میں مکاتیب ثلاثہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے یا حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا خط جو جس کے جواب میں حضرت والا نے رسالہ التذکیر بالقرآن تصنیف فرمایا واللہ تعالیٰ اعلم۔ (مجموعہ ترقی میں مسلمانان ہند)

نیز آپ نے مکتوب بالا میں ملاحظہ فرمایا کہ حضرت مصلح امت نے عوام ہی کا نہیں بلکہ علماء تک کا مرض اس زمانہ میں غفلت تجویز فرمایا اور پھر اسکے ازالہ کی تدبیر بھی بتلائی اس سے معلوم ہوا کہ بطور قدر مشترک کے آج سب ہی لوگ کیا عوام اور کیا خواص غفلت کا شکار ہیں جسکی اصلاح بچپن میں اگر والدین نہیں کر سکے تھے تو کم از کم مدارس میں اساتذہ ہی کر دیا کرتے لیکن افسوس کہ آج اس کام کو بھی خانقاہوں میں حضرات مشائخ اور مصلحین امت کو انجام دینا پڑتا ہے۔ چنانچہ طالبین سے زیادہ غافلین سے ان حضرات کو سابقہ پڑتا ہے۔ ہمارے حضرت مصلح الامۃ کا زمانہ جس نے پایا ہے اور حضرت کے کام کو جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کم از کم وہ تو اسکی تصدیق ہی کرے گا کہ حضرت کے یہاں مسلسل آنے جانے والوں کی نکال بیٹھا جا رہی رہتی تھی۔ کبھی یہ سوال ہوتا کہ آپ لوگ یہاں کیوں تشریف لاتے ہیں؟ کبھی دریافت کیا جاتا میرا آپ کے یہاں اتنے عرصہ سے قیام ہے آپ حضرات نے اپنی عملی حالت میں کیا تبدیلی فرمائی؟ کبھی پوچھتے کہ میں نے آج مجلس میں کیا مضمون بیان کیا اور اس سے آپ نے کیا اثر لیا؟ لکھکر

فرداً ہر مولوی صاحب پیش کریں۔ کبھی کسی تنبیہ فرماتے کہ تم میں طلب نہیں ہے یا
 اعتقاد نہیں یا شیخ کی عظمت نہیں یا انکار موجود ہے یا طریق سے عقیدت نہیں ہے
 یا دین کا صحیح علم نہیں ہے یا اخلاص نہیں ہے اسکی جگہ نفاق۔ پالیسی۔ چالبازی۔ سخن ساد
 ریاکاری۔ دنیا داری وغیرہ موجود ہے۔ لہذا تمہاری اصلاح مشکل ہے تم کہیں اور چلے جاؤ
 ہماری جگہ کو کیوں فاسد کرتے ہو یا تم میں محبت کی کمی ہے یا اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہے
 یا شریعت کی قدر و منزلت سے دل خالی ہے یا تمہارے اندر معمولات کا اہتمام نہیں
 ہے۔ طبیعت بے فکر واقع ہوئی ہے۔ لاپرواہی مزاج میں ہے۔ غفلت ہے۔ لہذا تم
 اپنے گھر ہی رہو اور اپنی ان تمام چیزوں کا فیض اور انکا نور و میں برساؤ یہاں کیوں رہو
 وغیرہ وغیرہ غرض یہ تمام باتیں دلیل تھیں اسکی کہ حضرت کا سابقہ مخلصین سے زیادہ
 غیر مخلصین سے اور طالبین سے زیادہ غافلین سے پڑا کرتا تھا۔ چنانچہ طالبین کے لئے تو
 شاہراہ کھلی ہی رہتی تھی اور غافلین یعنی غیر طالبین کو اول طالب بنانے کی سعی کی جاتی
 تھی۔ یہ ایک ایسا کھلا ہوا معمول تھا کہ اہم دورائے نہیں تھی۔ لیکن ایک متعلق خانقاہ کے
 متعلق یہ بات سنکر میری تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ انھوں نے خانقاہ کے کام اور
 دیگر دینی کوششوں کا فرق ظاہر کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہم لوگ کبھی جو کام کر رہے
 ہیں وہ کبھی دینی کام ہے فرق صرف دونوں میں یہ ہے کہ وہاں یعنی خانقاہ میں طالبین
 کی اصلاح کی جاتی ہے اور ہم لوگوں کا کام جو ہے وہ غافلین کو دین پر لگانا ہوتا ہے۔
 شاید ان صاحب کے پیش نظر یہ رہا ہو گا کہ خانقاہ والوں کا معاملہ ایسے لوگوں سے
 متعلق ہوتا ہے جو وہاں خود جاتے ہیں، بس اسی کا نام انھوں نے طلب رکھ دیا
 تھا اور ہم دوسرے لوگوں کے پاس گھر گھر پہنچ کر انکو دین کی طرف بلاتے ہیں اس لئے
 یہ انکے نزدیک غفلت کا مصداق بنا۔ حالانکہ گذشتہ سطور کے مطالعہ سے بات خوب واضح
 ہو گئی ہوگی کہ صرف اپنے قدموں سے خانقاہ تک آجانے ہی کا نام طلب نہیں ہے۔
 طلب کا مفہوم ہی کچھ اور ہے اور اگر اسی کا نام طلب ہے تو اس معنی کہ یہ غفلت
 کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے اسکے بالمقابل کوئی شے نہیں ہے اور ایسا شخص طالب غافل

کہلائے گا۔ جس طرح سے کہ حضرت مولانا حفصہ علامہ انور شاہ صاحب کا مقولہ نقل فرماتے تھے کہ وہ بعض اہل علم کو بھی عالم جاہل کے عنوان سے یاد فرماتے تھے انہی کسی صریح اور فاش غلطی کے پیش نظر فرماتے تھے کہ یہ صاحب عالم جاہل ہیں اس پر طلبہ نہیں دیتے کہ حضرت علم و جہل میں تو منافات ہے پھر یہ دونوں کا اجتماع کیسا؟

بہر حال حاصل مدعا یہ ہے کہ کسی خانقاہ میں آمد و شد رکھنے والے بھی سب کے سب مخلص اور طالب صادق نہیں ہوا کرتے بلکہ وہاں بھی ایک سے ایک بڑھکے منافق، غیر مخلص، دنیا دار، خود غرض، منکر آجاتے ہیں جنکو سمجھک شیخ انکے ساتھ معاملہ کیا کرتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسا بھی ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے کہ ایک انسان ابتداء میں غیر طالب اور غیر مخلص ہوتا ہے لیکن خدا کے فضل و شج کی توجہ اور صاحبین کی صحبت کی برکت سے آگے چلکر وہ بدل بھی جاتا ہے اور اسکے اندر طلب اور اخلاص آجاتا ہے۔ پس یہ تو ایسا شفا خانہ ہے کہ یہاں ہر قسم کے مریض کا علاج ہوتا ہے غیر طالب کو طلب کا سبق دیا جاتا ہے اور طالب مخلص کو آگے بڑھایا جاتا ہے تاکہ حق تعالیٰ کی محبت اسکے قلب میں راسخ ہو کر اسکو صاحب نسبت بنا دے اور یہی صحیح نسبت والا ہو جانا اس مکتب عشق کی آخری ڈگری ہے۔

آج جو لوگوں کو خواف پر اعتراض ہے اور مشائخ اور بزرگوں بلکہ طریق می کا انکار ہے تو اسکی وجہ انکو علم صحیح نہونے کے علاوہ رسمی خواف کی بد عملی بھی ہے۔ حضرت والا کے یہاں الحمد للہ رسومات پر سخت نگیں تھیں اور خانقاہ کا موضوع کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح اور اتباع سنت و شریعت کا رسوخ پیدا کرنا تھا۔ اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ میری یہ مجالس کوئی مجالس وعظ نہیں یا تقریر کا جلسہ نہیں ہے کہ ہم بیان کریں اور آپ سنیں یا سوئیں اس سے کوئی سروکار نہ ہوا ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے اس اجتماع کی مثال مدارس کے درس کی سی کہی جاسکتی ہے لہذا جو بیان ہوگا آپکو اسے صرف سمجھنا ہی نہیں بلکہ مجھ سے بیان کرنا ہوگا کہ آپ کیا سمجھے اور اس سے اپنے لئے کیا سبق حاصل کیا، اسی لئے کہتا ہوں کہ جو لوگ اسکے لئے خود کو تیار پاتے ہوں

وہی تو ہماری مجلس میں شریک ہوں اور جو لوگ ابھی اپنے اندر اسکی ہمت نہ پاتے ہوں (یعنی دوسرے لفظوں میں اسکویوں کہہ لیجئے کہ طلب طریق پورے طور پر موجود نہ ہو) تو وہ اس میں شریک ہو کر دوسروں کی راہ نہ ماریں، دوسرے اوقات میں مجھ سے ملیں میں انکو وقت بھی دوں گا، ملوں گا بھی اور ان سے بات بھی کروں گا۔ پھر جب آتے جاتے طلب پیدا ہو جائے تو پہلی مجلس میں بھی شریک ہو سکتے ہیں۔

حضرت اقدسؒ نے اس چھانٹ اور پھانٹ کی بہتیری کوشش فرمائی لیکن خود فرماتے تھے کہ میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا یعنی اپنی مجلس کو غیر طالبین سے پاک نہ کر سکا یہ لوگ اسی میں گھستے تھے سمجھتے تھے کہ مجلس خاص میں کچھ خاص چیز ہوتی ہوگی اس سے ہم محروم کیوں ہیں اور اس خاص چیز کے حاصل کرنے کا جو طرف تھا یعنی اخلاص طلب اسکے حاصل کرنے کی اصناف کو نہ ہوتی تھی جسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ انکو تو کچھ نفع نہ ہوتا ہاں دوسروں کا نقصان البتہ ہو جاتا تھا۔

اس موقع پر اکثر یہ فرماتے تھے کہ ایک چھوٹا سا کام (یعنی چھوٹے پیمانہ پر کام) کر رہا ہوں اور تھوڑے سے لوگ میرے ارد گرد جمع ہیں لیکن اپنے کو اور اپنے کام کو مقربین کی آمیزش سے بچانے پر قادر نہ ہو سکا خدا معلوم بڑے پیمانہ پر یہ قومی کام کونوالے کیسے کام کر لیتے ہیں اور کام کیا کرتے ہیں یہی سنتا ہوں کہ بعض نادانوں کی بد فہمی کے سبب کام کرنے والوں کا بھی ناطقہ بند ہی ہے اور عام لوگوں کا تو کہنا کیا اسی جماعت نے آج حکومتوں تک کو فیل کر رکھا ہے اور اہل سلطنت بھی ان سے پریشان ہیں۔

بہر حال فرماتے تھے کہ جس طرح سے مدارس میں وقت تعلیم کے وقت (خواہ وہ عربی مدارس ہوں یا انگریزی کالج اور یونیورسٹیاں ہوں) کوئی غیر شخص درس میں شریک نہیں ہو سکتا یہی حال ہماری مجالس کا سمجھو کہ جو اس میں داخلہ کرالے وہی شریک ہو ہر کس و ناکس کیوں اس میں آکر بیٹھ جائے۔ ملاقات سے منع نہیں کرتا لوگوں کو آنے سے نہیں روکتا لیکن اپنی مجالس کی عظمت کو بھی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کیا کہ تمام چیزوں کے مستابس دین اور طریق کو سمجھ لیا جائے گویا صریح یہ وہ جامہ ہے کہ جسکا نہیں اٹا سیدھا

اسکول و کالج میں اصول و شرائط ہوں۔ کچھری اور دفاتر میں قواعد و نظم موجود ہوں اور ہماری ان جگہوں کو بے اصولی اور بے نظمی سمجھا جائے یہ آخر کیوں؟

انہیں مذکورہ بالا اصول کو اکثر و بیشتر بیان فرماتے اور لوگوں کو ان پر لگاتے ہوئے حضرت مصلح الامۃ نے شاندار مجالس فرمائیں چنانچہ چند ہی مجالس میں شرکت فرما کر جناب نجم احسن صاحب دیکل نے (جو کہ حضرت حکیم الامتہ کے مجاز بھلی تھے) اپنا یہ تاثر ظاہر فرمایا کہ

دیکھ دیوانے دیکھ اے احسن یہ بھی گلشن ہے اشرفی گلشن

مجلس حضرت دہلی امیر ہے نمود بہار تھا نہ بھون

غرض مصلح الامتہ نے اپنے یہاں تعلیم و تربیت کا انداز بھی مدارس ہی کے طور پر رکھا کہ کبھی کبھی فرمائے ہوئے درس کا طالبین و سالکین سے امتحان بھی لیا کرتے اسکا کچھ نمونہ پیش خدمت ہے۔

حضرت مصلح الامتہ کے یہاں سالکین کا امتحان بھی ہوتا تھا

فرمایا کہ جس طرح سے مدارس میں امتحانات ہوتے ہیں اسی طرح سے اہل اللہ (مشائخ) بھی مریدین کا امتحان لیتے ہیں اور انکا امتحان طالب کی لغزش پر مواخذہ کرنا اور اس سے سوالات کی صورت میں ہوا کرتا ہے۔ بعض مرتبہ وہ شخص بالکل بے تصور ہوتا ہے مگر اہل طریق اسکا امتحان لیتے ہیں اب اگر اسکا نفس مرچکا ہوتا ہے تو ان سوالات پر غایت انقیاد کا ثبوت دیتا ہے اور اپنے کو خطا وار سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ میں معلوم کتنے عیوب موجود ہیں اور اگر اسکا نفس مرا نہیں ہوتا تو وہ دساوس وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ان حضرات کے مواخذہ پر چین بچیں ہوتا ہے اس سے یہ حضرات سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کامل ہو گیا ہے یا نہیں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ۔
الَّذِينَ أَحْسَبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ (کیا لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ یونہی چھوڑ رکھے جائیں گے اور انکی آزمائش نہ ہوگی)۔

ایک بزرگ نے ایک شخص کو ڈانٹا اور اپنے پاس سے ہٹا دیا اور جب وہ جانے لگا تو پھر بلایا اور پھر اسکو اپنے خواص میں سے بنالیا یہ ہے بزرگوں کا امتحان کہ ایک منٹ میں امتحان بھی لے لیا اور نتیجہ بھی سنا دیا۔ جو بزرگ بدون امتحان لئے مریدین کا اعتبار کر لیتے ہیں یہ کچھ نہیں ہے۔ حضرت

مولانا کھانوی کے یہاں دیکھا کہ جس کا امتحان ہوا وہی تو کچھ ہو گیا اور جسکی تعظیم و تکریم کی گئی وہ آخر میں کچھ نہیں نکلا۔ میں اپنے یہاں لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ جس کو خوب آتا ہوں وہ تو خلوص کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ کسی ایک کو بھی نہیں دیکھا کہ امتحان لینے کی وجہ سے بھاگ گیا ہو۔ اور جس کسی کے ساتھ اخلاق برتاوہ ہمارا معتقد ہی نہیں ہوا۔ ہم لوگ حضرت مولانا کے یہاں ڈرتے ہی رہتے تھے کہ کب ہمارے نفس کی کوئی چوری پکڑ لی جائے اور جب حضرت کسی کو طلب فرماتے تھے تو وہ بس اسکا مصداق ہوتا تھا کہ

داغ جاتے تو میں مقتل میں پہاڑ سب سے دیکھنے دار کرے وہ ستم آرا کس پر
مگر ہم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ جگہ ہی اصلاح کی ہے اور یہ ان بڑے میاں کی ہربانی اور انکا کم ہے
کہ ہماری اصلاح میں اس طرح سے سرگرم ہیں۔

راقم عرض کرتا ہوں کہ جب حضرت مصلح اللہ کا اپنا زمانہ آیا تو حضرت نے کبھی یہی طریقہ باقی رکھا
اور سالکین سے برابر دار و گیر جاری رہتی کبھی زبانی بالواسطہ یا بلا واسطہ سوال و جواب ہوتا اور
کبھی بذریعہ تحریر امور دریافت فرمائے جاتے۔ چنانچہ خود فرماتے تھے کہ :-

”یہ جو میں اپنے پاس آنے جانے والوں یا یہاں رہنے والوں سے کبھی کبھی کچھ دریافت
کرتا رہتا ہوں یا کچھ کہلاتا رہتا ہوں تو اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں کچھ انکو تنگ کرنا چاہتا ہوں، یا
میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ کسی برائی وغیرہ میں نہیں رہتے اور نماز، روزہ، تعلیم و تعلم بھی نہیں
کر رہے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ آپ لوگ بظاہر کسی برائی میں نہیں
ہیں اور نماز، روزہ کرنا اور علم دین پڑھنا پڑھنا اتنا تو کر ہی رہے ہیں، باوجود اسکے جو میں کہتا رہتا
ہوں تو آپ لوگوں کو بھی اسکی وجہ سمجھنا چاہئے اور دل سے اس پر غور کرنا چاہئے ورنہ میں تو
کہتا رہوں گا اور آپ پر اسکا کچھ اثر بھی مرتب نہ ہوگا۔“

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو
و دشما یک تن نشد اسرار جو
یعنی میں کہتے کہتے (بغرض نصیحت) بسیار گو ہو گیا ہوں لیکن آپ لوگوں میں سے ایک بھی
اصلاح پذیر نہ ہوا اسکی وجہ میں خود ہی بیان کرتا ہوں، سینے!

اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اصلاح کیلئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک

تعلیم و دوسری تربیت تعلیم تو یہی ہے جو آپ لوگ مجھ سے کتاب میں پڑھتے ہیں لیکن صرف تعلیم کتاب تو کافی نہیں ہے اسکے ساتھ تزکیہ اور تربیت بھی تو ہونا ضروری ہے۔ پس میں جو آپ حضرات کو کبھی کبھی تکلیف دیتا ہوں اور سوالات کرتا ہوں، کچھ کہتا ہوں، کچھ پوچھتا ہوں یہی تزکیہ اور تربیت ہے۔

گو اس باب میں اصل تو یہی ہے کہ قلب کو ذاکر بنایا جائے اور اس میں شک نہیں کہ اسکے لئے علم دین کافی وافی ہے بالخصوص کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم کہ وہ تو اسی لئے ہے ہی لیکن بات یہ ہے کہ یہ زمانہ زمانہ غفلت ہے اور لوگوں کے قلوب خراب ہو گئے ہیں اس طرح سے کہ اسباب ذکر بھی اس میں تذکرہ پیدا نہیں کرتے اور نہ غفلت ہی کو دور کرتے ہیں۔

پس تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایسے طرق جن سے قلب کو کچھ ٹھیس لگے اور جو بمنزلہ داروئے تلخ کے ہوں وہی انسان کو بیدار کر سکتے ہیں اور پھر جب قلب سے غفلت دور ہو جائے تب نماز و سنت کا علم بھی اس پر کامل جلا کر سکتا ہے۔

لہذا قلب پر اسی قلعی کے عمدہ آنے کے لئے شیخ کامل بذریعہ تربیت و تزکیہ پہلے قلب سالک کو مصفیٰ اور اس سے میل کچیل صاف کرتا ہے بس بالکل یہی حیثیت ہے میرے اس طرز عمل کی جس کی حقیقت میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اب غور فرمائیے گا تو ایک نئی بات کا علم ہونے کی وجہ سے قلب میں مسرت پائیے گا اور اس امر کے استحضار کے بعد مخلص اور طالب کیلئے میری اس پوچھ گچھ کی تلخی مبدل بہ لذت ہو جائیگی اور تحصیل علم کے ساتھ ساتھ اس مرتبہ کے مل جانے سے اسکی ترقی کا راستہ صاف اور سہل ہو جائیگا ناقل عرض کرتا ہے کہ بلاشبہ ہم لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور اسباب غفلت اختیار کئے ہوئے ہیں، بلکہ اپنی باطنی خرابی سے اسباب ذکر کو بھی ہم نے اسباب غفلت بنا رکھا ہے علم سے مستفید ہونے کیلئے ہم خود اپنے کو درست اور صالح نہیں بنا پا رہے ہیں تو شیخ کامل نے اپنے ذوق و اجتہاد سے ہماری اس خامی کو دور کرنے کے لئے ایک اقرب طریق تجویز فرمایا ایسا کہ ہم کو پتہ بھی نہ چلے اور ہمارا کام بنتا چلا جائے۔ فحواہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

حضرت والا کبھی کبھی آنے والوں سے یہ دریافت فرماتے تھے کہ آج میں نے مجلس میں کیا بیان کیا ہے۔ چنانچہ اسی نوع کے ایک سوال پر ایک سالک نے یہ لکھ کر پیش کیا:۔
 ” آج حضرت والا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اسکا حاصل یہ سمجھا ہوں کہ رسم اور ظاہر داری کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ لوگ بات کو سنتے اور زبان سے کہتے بھی ہیں لیکن اسکا مطلب نہیں سمجھتے مثلاً کسی کا یہ شعر مشہور ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ سہ
 پے نبردے پیچکس در منزل حق یقین تا بودے ذات پاکش اندریں رہ مقتدا

(حق یقین کی منزل تک پہنچنے میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کے مقتدا نہیں ہو گئے ہیں) اس شعر کو خوب لطف لے لے کر پڑھا جاتا ہے اور اسکا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ منزل حق یقین تک پہنچنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ضروری ہے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ پیروی کن امور میں کی جائے اور ان میں سب سے اہم کیا چیز ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کی زبان مبارک پر یہ اعلان فرمایا **وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ** (جس شخص نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا تو جنت اسکا ٹھکانا ہو گا) چنانچہ سب سے زیادہ ترغیب و تحریض کتاب و سنت میں نفس ہی کے متعلق آئی ہے اور اسی طرح نصوص کی اتباع میں بزرگان دین نے اصلاح نفس کو اپنا موضوع بحث اور فنائے تام کو منتہائے مقصود قرار دیا ہے اور لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا سب سے بڑا مانع اور روڑا انسان کا نفس ہی ہے اور شرارت، دنارت، خست اور نقص اسکی ذاتی اوصاف ہیں لیکن وہ انھیں بالکل بھولا ہوا ہے اور ان سے آنکھ بند کر کے عارضی کمالات کی بنا پر خود کو مبد اُخیرات سمجھے ہوئے ہے۔ چنانچہ مشائخ اسی امر کی سعی فرماتے ہیں کہ سالک اپنے عدمیت ذاتیہ پر مطلع ہو جائے اور اپنے صفات کو پر تو اور نفل سمجھے۔ اسی طرح سے یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسان پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرے دوسروں کی فکریں نہ پڑے

ابداً بنفسک فانمها عن غیہا فاذا انتفعت عنه فانت حییم

(اپنی ذات سے تبلیغ شروع کر دینی اسکو باریوں سے روکا اور جب دور رک جائے گی تو اسوقت تم حکیم سمجھے جاؤ گے)

پس ایک سالک کیلئے اہتدار کا رہی اسکا نفس ہے یعنی یہ کہ اسکو رذائل سے نکالے اور نہ ہٹائے
 کا رہی اسکا نفس ہے کہ اس میں جو محاسن بظاہر پیدا ہو گئے ہیں ان کو حق تعالیٰ کی چیز سمجھ کر انکی
 نسبت انھیں کی طرف کرے اور خود کو ان سے عاری جانے یہی اسکا کمال ہے۔ ہائی یہ چیزیں
 ایسی ہیں اور لوگوں کی مناسبتیں ایسی کمزور ہو گئی ہیں کہ انکا سمجھنا اور سمجھانا اس زمانہ میں
 آسان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کی برکت سے نفس کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے
 اور اسکے رذائل سے قلب کو پاک و صاف فرمائے۔ انتہی۔

اس تحریر کو ملاحظہ فرما کر حضرت والا نے فرمایا کہ ٹھیک ہے اسکو نقل کرا دو۔

ایک اور مولوی صاحب نے لکھا کہ :-

حال : معروض خدمت انیکہ بندہ بد فہم حضرت والا کی اصلاح کی حقیقت کو بھلا کیا سمجھ
 سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے لکھتا ہوں اللہ کرے حضرت والا کے نثار
 کے مطابق ہو جائے۔

تحقیق :- موافق ہوا فاکہمہ شرعی ذلک

حال :- احمد رضا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کما حقہ حضرت والا کی ذات مبارک
 سے ہو رہی ہے اور یہاں کا طرز بالکل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہے
 حضرت جس پنج پر اصلاح فرما رہے ہیں واقعی بالکل وہی درست اور نافع ہے۔ حضرت نے
 اصلاح کا مدار نفاق کو رکھا ہے اور بالکل صحیح ہے کہ عوام کیا خواص تک کے قلوب اس
 مرض نفاق کا شکار اور اس سے ملوث ہیں اور اسکی اصلاح ضروری ہے اسلئے کہ اسکی وجہ سے
 نہ دنیا میں فلاح ہو سکتی ہے نہ آخرت میں چین نصیب ہو سکتا ہے اسلئے کہ روزانہ دیکھا جاتا ہے
 کہ بہت سے لوگ صوم و صلوٰۃ کے عادی ہیں مگر نفاق کی وجہ سے بالکل ترقی نہیں کرتے سالہا
 سال تک اسی گمراہی میں رہ جاتے ہیں چنانچہ حضرت سے سنا ہے کہ ایک دل ایسا بھی ہے
 جس میں نفاق بھی ہے اور ایمان بھی ہے۔ ایمان کی وجہ سے تو مسلمانوں جیسے اعمال ظاہر ہوتے
 ہیں نفاق میں رہنے کی وجہ سے منافقوں جیسے اقوال و افعال سرزد ہوتے ہیں اسلئے ہو سکتا ہے
 کہ نماز و روزہ بھی کوئی شخص کرتا ہو اور نفاق بھی اسکے دل میں موجود ہو جو کہ اسکی ترقی کرنے سے

مانع ہو۔ الحمد للہ حضرت اس کے متعلق بے انتہا باتیں بتاتے ہیں۔ حضرت سے ایک مرتبہ بنا کہ کوئی شخص نفاق چھوڑ کر دیکھ لے کہ دل میں کس قدر نور ہو جاتا ہے اگرچہ زیادہ وظائف وغیرہ کا پابند نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کس قدر بری اور مہلک چیز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے متعلق بڑے شدید سے دور تک بیان فرمایا ہے۔ بہر حال حضرت نے اسکو اختیار فرمایا ہے کہ آجکل مصلحین کو ضروری ہے کہ منافقین کی بری طرح گت بنا دیں اور انکو ذلیل کریں اور برائی اسکی ذہن نشین کریں۔ بغیر حضرت والا کا طرز اختیار کئے ہوئے نفاق کا سمجھنا اور اصلاح کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور جب تک نفاق رہے گا اسوقت تک آدمی ترقی نہیں کر سکتا اور جہنم کا ایندھن ہو جائے گا۔ حضرت دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نفاق سے بچائیں اور اخلاص پیدا کر دیں۔ فقط۔

لاحظہ فرمایا آپ نے ان مولوی صاحب کو حضرت اقدس کی تعلیمات میں سے نفاق کی بحث کتنی اہم نظر آئی کہ شروع سے آخر تک اسی کا ذکر کیا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ حضرت والا نے اسکا بیان ہی اس شدید سے فرمایا تھا کہ لوگ لرز اٹھتے تھے اور طالبین کو اصلاح کی فکر پڑ گئی تھی، لیکن یہ حضرت اقدس ہی کا منصب تھا جو اس پر اتنا بول گئے۔ ہر شخص کے لئے منافقین کی گت بنانا، اسکو ذلیل کرنا اور اس سے یہ کہنا کہ تم نفاق ترک نہ کرو گے تو تم کو جہنم کا ایندھن بننا ہو گا آج آسان نہیں ہے۔ کوئی شخص بغرض اصلاح آج کسی کیلئے لفظ نفاق بول دے تو عجب نہیں کہ اسکے خلاف احتجاج شروع ہو جائے۔

امتحان تحریری کے سلسلہ میں چند سالکین کے جوابات نقل کئے جاتے ہیں جو حضرت والا کے طرز امتحان کے سمجھنے میں بھی معین ہو گا اور انشاء اللہ تعالیٰ معلومات کا ذریعہ ہو کہ ناظرین کیلئے موجب بصیرت بھی ہو گا۔ وہو ہذا۔

عرض ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم کے ارشادات سے جو کہ صاحب حال کے ذریعہ سے معلوم ہوئے یہ سمجھ میں آیا کہ اس زمانہ میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ علوم دینیہ میں انہماک اور کثرتِ اشغال کی بنا پر باطنی چیزوں سے غفلت ہو جاتی ہے اور یہی علوم

حجاب اکبرین جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تو چونکہ ہم لوگ بھی زیادہ تر پڑھنے لکھنے ہی میں رہتے ہیں اسلئے ہو سکتا ہے کہ باوجود یہاں رہنے کے اپنی اصلاح اخلاق و نفس سے غافل ہو کر علوم رسمی میں پھنسے رہ جائیں اور قلبی دولت سے کورے رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم جیسا مرشد نصیب فرمایا ہے کہ باوجود ان مشغولیتوں کے ایسے طریقہ سے اصلاح و تربیت فرماتے ہیں کہ الگ سے وقت بھی نہیں دینا ہوتا اور اصلاح بھی مسترشدین کی اکل طریقہ ہو جاتی ہے

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنی توجہ اپنے اخلاق اور قلب کی طرف اٹھائے ذکر میں ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ حضرت والا کے استفادہ سے ہوتی ہے۔ اور ایک آدمی ایک سوال سے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتا ہے اور کامل توجہ اپنی اصلاح کی طرف ہو جاتی ہے۔ بیشک حضرت والا کا جو منصب ہے یعنی تزکیہ و تربیت کا اس کا حق بدرجہ اکل ادا فرماتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جیسے لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے یہی طریقہ عقلاً و نقلاً متعین ہے اور اسی کا نام تزکیہ ہے بغیر اسکے تعلیم محض کافی نہیں ہے۔

اور حضرت والا دامت برکاتہم جو بار بار استفادہ فرماتے ہیں اسکی یہ بھی وجہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی کامل کے پاس رہے اور بظاہر تعلق رکھے مگر باطناً موافق نہ ہو اسکے قلب میں نفرت و کراہت اور بدعقیدگی ہو اور باطناً طریق اور اہل طریق کا مخالف ہو حضرت کو چونکہ تجربات و مشاہدات ہیں اسلئے ایسے لوگوں سے چوکنے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا تو اس حلقہ میں داخل نہیں ہے جو کہ ظاہراً موافق ہو اور باطناً مخالف ہو اسلئے کہ اگر ایک بھی ایسا آدمی کہیں رہے گا تو خود تو خود دوسروں کو بھی بگاڑ دیگا اور خود چونکہ اپنے نفاق اور ظاہر داری کی بناء پر فیض و برکت سے محروم رہتا ہے اس لئے دوسروں کو بہکانا ایسے لوگوں کا شیوہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کام آگے بڑھنا زیادہ جگہ ہی فاسد ہو جاتی ہے ایسے لوگوں کو پہچانا اور تمیز ضروری ہے کہ یہ دل سے موافق ہے یا بدعقیدہ ہے یا خالی الذہن ہے۔

تو حضرت ایسے سوالات سے یہ بتلانا چاہتے ہیں اور یہ نشا ہوتا ہے کہ تم جب میرے پاس رہے ہو تو دل سے رہو اگر باطنی فیض نہیں لے رہے ہو تو کم از کم نفرت اور بغض کی تو نہ رکھو اور جب کوئی ان سب چیزوں سے خالی ہو کر رہے گا تو انشاء اللہ کبھی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔

الحمد للہ کہ حضرت والا تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ و تربیت بھی فرما رہے ہیں حضرت والا دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ تزکیہ فرمادیں اور نفس کو پاک و صاف فرمادیں اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور تعلق پیدا ہو جائے۔

(۲)

حال : حضرت والا کے طرز تعلیمات اور طرز اصلاح کا حق اور اسکا جمال و کمال کیا عرض کیا جائے جو بات بھی ہوتی ہے عجیب ہوتی ہے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگر م کہ شمع دامن دل می کشد کہ جا اینجا

حضرت کا طرز برابر یہی رہا ہے کہ کلام بمقتضائے حال فرماتے ہیں جس چیز کو جس وقت مناسب خیال فرماتے ہیں بہتر طریقہ سے تعلیم فرماتے ہیں اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور حضور کی خاص تائید حضرت والا کے ساتھ ہے اور وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ حضرت ہر حال میں کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر کام کرتے ہیں لہذا نافع ہوتا ہے۔ کتاب و سنت سے اخذ کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے۔ عرصہ ہر ہوسنا کے نڈاند جام و سنداں باختن۔

آج مسلمان جس دور سے گزر رہے ہیں انکو جن جن مصائب و آلام کا سامنا ہے انکا سمجھنا اور پھر انکی اصلاح یہ صرف حضرت ہی کا وصف امتیازی ہے کوئی دوسرا نہیں شریک نہیں۔ دوسرا یہ بھی صحیح طور پر نہیں سمجھتا کہ یہ بلائیں اور یہ خرابیاں آخر کیوں ہیں؟ وہ تو اسکا واحد سبب غیر کو بتلاتے ہیں اور خود کو بے قصور قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بگاڑ اور خرابی خود انھیں کے ہاتھوں بلکہ ان کے خواص کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں تعلیمی اور اصلاحی ادارے بھی چل رہے ہیں لیکن پھر بھی خرابی جوں کی توں۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے یہاں سے اہل و نازل ضروری و غیر ضروری مناسب و نامناسب کا فرق ہی ختم کر دیا ہے۔ بلکہ حضرت کے ارشاد کے مطابق یہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس وقت تو سب لوگ صالح ہی ہیں اور صلاح و کمال کے اس درجہ پر پہنچے ہوئے ہیں جس پر پہلے لوگ تھے حالانکہ بعض ان میں ایسے تھے کہ اگر وہ ادنیٰ فک و تدبیر سے کام لیتے تو شاید ان سے کچھ کام ہو جاتا، لیکن چونکہ نبض شناسی ہر شخص کا کام نہیں اسلئے انھوں نے کبھی اس جانب توجہ بھی نہیں کی بلکہ اپنی ساری قوت علمیہ اور بیانیہ دقیق و نامض علوم اور اختلافی امور کی نذر کر دی جسکا اثر یہ پڑا کہ وہ عوام کو شریعت کی طرف تو کیا لاتے بلکہ اس سے کچھ نفرت ہی دلا دی اور اس شعر کا مصداق ہو گئے۔

تو برائے وصل کردن آدمی نے برائے فصل کردن آدمی

حالانکہ ان کے ذمہ تھا کہ وہ شریعت کے حسن و خوبی کو بیان کر کے لوگوں کی نظروں میں اسکو محبوب بنا کر خود خدا و رسول کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرتے، مگر چونکہ یہ چیز حضرت ہی کے حصہ میں لکھی ہوئی تھی اسلئے کوئی دوسرا وہاں تک پہنچ نہ سکا۔ ذَلِکَ فَضْلُ الْاَنْبِیاءِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ (یہ حق تعالیٰ کا فضل اور انکا انعام ہے جسے چاہتے ہیں مرحمت فرماتے ہیں)

(۳)

گزارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ حضرت والا کی خصوصیات و کمالات کا بیان کرنا اور تحریریں لانا احقر بد فہم کے بس سے باہر ہے مگر محض بطور تعمیل حکم کے چند باتیں عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں یہ کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے خزانہ غیب سے علم عطا فرمایا بھت اسی طرح اپنے خزانہ حکمت سے مردم شناسی و موقع شناسی کا ملکہ بھی عطا فرمایا تھا، نیز معاد و معاد کی فہم بھی عطا فرمائی تھی، اب ان کے وراثہ علماء و رثۃ الانبیاء مگر علم کے ساتھ ساتھ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ذی علم کو تعلیم و تربیت کا ملکہ اور معاش و معاد دونوں کو درست کرنے کا ملکہ حاصل ہو یہ نہیں ہوتا۔

نہ ہر کہ آئینہ ساز و سکندری داند نہ ہر کہ چہرہ برافروخت و لبری داند

یہ ضروری نہیں کہ چہرہ کہ حسین ہو وہ انداز دلبری بھی رکھتا ہو مگر یہ کہ جو شخص بھی آئینہ رکھتا ہو وہ سکندری بھی رکھتا ہو

نہ ہر طرف کھ کچ نہاد و نشست کلاہ داری و آئین سروری داند

(چنانچہ بھی فردی نہیں کہ جو شخص بھی اپنی ٹوپی طرہی کرے یا اگر کڑیٹھ جادہ دلی کا محبوبی ہی لکھتا ہو یا وہ صاحب سلطنت ہی بن گیا ہو)

ہزار نکتہ بار یک ترز موائی نجاست نہ ہر کہ سر بر اشد قلف داری داند

(ہزار نکتے بال سے بھی زیادہ بار یک یہاں یعنی شان محبوبیت دکھانے کے لئے ہوا کرتے ہیں کہ جس سر گھٹا لے اور قلندر بھلانے لگ جائے)

بلکہ جنکو اللہ تعالیٰ صحیح معنوں میں وارث بناتے ہیں اور نائب رسول بناتے ہیں اور جس کو اپنے دین متین کی خدمت کے لئے مامور فرماتے ہیں اسی کو یہ ملکہ عطا فرما کر نوازتے ہیں وَ

ذَلِك فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ تَوْسِبَ مَا بِالِاتِّمَازِ يَهَا اخلاقی تعلیم ہے اور کل

دین محمدی کی بنا را خلاق پر ہے، اس لئے ایسا شخص قوم کے حالات کو نظر غائر سے دیکھتا

ہے اور حالات کے رخ کو پہچانتا ہے اور اسی کے مطابق کلام کرتا ہے اور وہ قوم میں

روح پھونک دیتا ہے اور زندگی آجاتی ہے۔ عر۔ عیسیٰ وقت است کہ دم می زند۔

دوسری بات یہ ہے کہ قوم کے بگاڑ کے ہزاروں اباب ہوتے ہیں جسکے متعین کرنے

کیلئے لوگ حیران و پریشان رہتے ہیں مگر وہ مرد کامل بگاڑ و فساد کی اھلی شہ رگ پر انگلی رکھ دیتا

ہے۔ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو یہ ملکہ مردم شناسی کا اور موقع شناسی کا عطا فرمایا ہے

بات گو کتنی ہی عمدہ ہو مگر ہر موقع و ہر محل میں کارگر نہیں ہوتی اور ہر شخص اسکا اہل نہیں ہوتا

بلکہ وہ اپنا ایک موقع اور محل رکھتی ہے۔ خمیرہ گاؤں باں کسی مریض کو دیا جاتا ہے اور کسی کو

نہایت مضر بتایا جاتا ہے۔ گیہوں اور جگہ بویا جاتا ہے اور دھان کی کاشت کی زمین اور

ہوتی ہے۔ حضرت والا کی خصوصیات سے ہے کہ کلام کو بے محل اور بے موقع ضایع نہیں

فرماتے بلکہ اسکو اسکے موقع و محل میں پہنچا دیتے ہیں۔

نیز حضرت والا کو حق تعالیٰ نے قوم کی نبض شناسی کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ یہ خاص چیز

ہے کہ جو ذرا بچ کہ اہل دنیا کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہیں ان سے غایت درجہ نفرت

ہے مثلاً اخبار بینی یا ادھر ادھر آنا جانا وغیرہ وغیرہ ان سب چیزوں سے طبعی تنفر ہے اور عام حالات

سے پوری طرح واقفیت ہے اور اس پر مفصل کلام فرماتے رہتے ہیں کہ عام طور پر خانہ جنگی کیونکر

ہے اور اسکے اسباب کیا ہیں؟ اسی طرح سے حضرت والا اپنے ملکہ حالات شناسی و فراست

اس پر بہت دنوں سے زور دیتے ہیں کہ قوم میں جو عام تعطل اور غفلت طاری ہے اور دین فرد
و گرامی و بد دینی میں مبتلا ہوتی جا رہی ہے اور طرح طرح کے فادات انہیں رونما ہو رہے
ہیں اسکا اصلی سبب کسی دوسری قوم کا مسلط ہونا نہیں ہے بلکہ قوم کے بناؤ و بگاڑ کی ذمہ دار
خود یہی قوم بلکہ ان کے خواص ہیں۔ خواص کے فساد سے عوام کا فساد ہے ساری قوم کی ذمہ داری
انہیں پر ہے۔ جب انہیں میں صحیح دین و ایمان کی بہار آتی ہے تو قوم میں بھی بہار اور ایمانی
زندگی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اور جب انکا احساس زندہ رہتا ہے تو قوم کا احساس بھی زندہ
رہتا ہے اور جب ان میں غفلت اور تعطل طاری ہو جاتا ہے تو قوم بھی سو جاتی ہے بلکہ مردہ
ہو جاتی ہے۔ اصل میں انہی میں بگاڑ و فساد پیدا ہو گیا ہے یہ جڑ ہیں جڑ ہی میں گھن لگ گیا ہے
جب تک یہ درست نہ ہوں گے اور صحیح راستہ نہ پکڑیں گے تو قوم بھی صحیح راستہ نہ پاسکے گی۔

اسکے علاوہ حضرت والا کی یہ بھی تشخیص ہے کہ جب کسی قوم میں پستی آنے پر ہوتی ہے
اور جن پر عقاب نازل ہونا ہوتا ہے تو سب سے پہلے جو چیز اس سے لے لی جاتی ہے وہ فہم
لے لی جاتی ہے، چنانچہ ہم سے فہم لے لی گئی، اب فہم مفقود و غنقا ہے۔ ہر خاص و عام کو
اس پر متوجہ فرماتے ہیں اور متنبہ فرماتے ہیں کہ فہم پیدا کرو ہم سے فہم ہی رخصت ہو گئی ہے۔ دین و
دنیا کی بڑی بڑی باتیں کیا سمجھیں گے جبکہ معمولی معمولی باتیں بھی انہیں سمجھنے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو طبقہ کہ دیندار ہے ذی علم ہے
بلکہ مشائخ بھی، دوسروں کو تبلیغ کرنے میں اور انکو دین پہنچانے میں بڑی جدوجہد کرتے
ہیں، دوسروں کے لئے دینداری پسند کرتے ہیں مگر اہل و عیال اور خاندان والوں کو بالکل
بے ہمار چھوڑے رہتے ہیں جدھر جاہیں جائیں جس میں چاہیں منہ ڈالیں ان سے بالکل بے توجہی
برہتے ہیں۔

مگر حضرت والا کی یہ خاص بات ہے جیسے اخلاق نبوی سے اور سب حصے ملے ہیں
اور انکے فیض سے فیض یاب ہیں ویسے ہی اس اخلاق سے بھی متخلل ہیں کہ جو باتیں دینی کہنی ہوتی
ہیں پہلے اپنے اہل و عیال پھر اپنے مقربین سے فرماتے ہیں۔ درجہ بدرجہ تبلیغ کی پہلی سنت
اور عمل بالقرآن یہی ہے۔

اسی طرح حضرت والا اس پر بھی توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ دنیا سے جتنے بڑے بڑے لوگ جاتے ہیں اپنی جگہ کسی کو نہیں چھوڑ کر جاتے کہ وہ ان کے فضل و کمال کا حامل ہو اور ان کے علوم کو لوگوں سے بیان کر سکے اور اس چشمہ فیض کو جاری رکھے بلکہ کسی کا جہاں سایہ اٹھتا نہیں کہ وہ چشمہ فیض بند ہو جاتا ہے اور وہ جگہیں صرف تبرک اور قصہ و کہانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ اسکا حضرت والا کو بے حد رنج و غم رہتا ہے اسلئے اکثر و بیشتر پاس رہنے والوں کو جھنجھوڑا جھنجھوڑا کہ ان کے جمود و غفلت کو دور کرنے کی کوشش فرماتے رہتے ہیں

حضرت والا کی بہت سی خصوصیات ظاہری و باطنی ہیں مگر جو خصوصیات کہ ظاہر و عام فہم میں جنکو مجھ جیسا بد فہم بھی سمجھ سکتا ہے اس بد فہم نے عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے اور حضرت والا سے بھی دعا کی التجا ہے کہ حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اس چشمہ فیض سے پوری طرح فیض یاب فرمائے اور ہم لوگوں کو اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِلُّ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اَوْ كَانَ سَعِيْهُمْ مَّشْكُوْرًا کا مصداق و نمونہ بنادیں جو کہ حضرت والا کی فطرت و مسرت کا سبب بنے۔ والسلام۔

(۴)

سیدی و سندی حضرت والا دامت برکاتہم و فیوضہم
السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ — اپنی کم فہمی کے سبب سے کل حضرت والا کے سوال کا منشاء میں ہی نہ سمجھ سکا اور ایک عام سوال کو خاص کر کے لفظ تجرت و اسعاً کا مصداق بن گیا پھر بنار الفاسد علی الفاسد کے طور پر میری وجہ سے اجاب کو بھی غلط فہمی ہو گئی جس کی میں نے معافی مانگ لی ہے لیکن رات کو جناب ۔ ۔ ۔ صاحب کے بیان فرمانے سے اور اس وقت مولوی ۔ ۔ ۔ صاحب کے خط سنانے سے حضرت کا منشاء پوری طرح ابھرتا سمجھ میں آ گیا۔ چنانچہ حضرت کی تعلیم و تربیت کی خصوصیات میں چند باتیں جو سمجھ میں آتی ہیں عرض کرتا ہوں۔ خدا کرے صحیح سمجھا ہوں اور صحیح ادا کر سکا ہوں :-

۱۔ حضرت والا اپنی تعلیمات میں صرف کتاب و سنت اور پھر سیرت مشائخ کا بیان فرماتے ہیں اور ان میں بھی ترتیب پیش نظر رہتی ہے کہ پہلے کتاب و سنت اور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور پھر اسکی تائید میں سیرت اکابر پیش فرماتے ہیں

۲۔ تربیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کے طریقے کا خاص اہتمام ہے کہ جس چیز کا دوسروں سے مطالبہ کیا جائے اپنے گھرانے کے لوگوں میں اسکا اجراء پہلے کیا جائے یہی وجہ ہے کہ سالکین سے اگر اعتقاد، اتباع، انقیاد اور اخلاص کا مطالبہ فرماتے ہیں تو اپنے لوگوں سے اس سے زیادہ شد و مد کے ساتھ مطالبہ ہوتا ہے

۳۔ نیز تربیت کے باب میں قرآن حکیم کے پراز حکمت و شفقت طرز پر حضرت والا کا عمل ہے کہ اعمال میں ترتیب کا لحاظ فرماتے ہیں اور جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے محض شفقت علی الناس و تسہیل لہم پہلے مہفلات نازل فرمائیں تاکہ قلوب جنت و دوزخ کے خوف و شوق سے لرزہ ہو جائیں جنکی وجہ سے اعمال کی مشقت ان پر آسان ہو جائے۔ اسی طرح سے حضرت والا پہلے سے بھی مگرواب تو زیادہ اسکا اہتمام فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو کام کی اور آسان آسان چیزیں پہلے بتائی جائیں چنانچہ بہت زیادہ ذکر و شغل اور مراقبہ وغیرہ تو حضرت کے یہاں کبھی بھی نہیں رہا اور اب تو اس پر آگئے ہیں کہ مسلمانوں کو وضو، طہارت تلاوت پہلے درست کرنا چاہیے اور اسکو ایسا مدلل بیان فرمایا ہے کہ عوام الناس کی سمجھ میں بھی آگیا کہ یہ دین ہے اور یہ اس کا راستہ ہے ورنہ تو قوم کی نظروں میں نماز و روزہ کی عظمت ختم ہو رہی تھی تاہ طہارت و وضو پہ رسد اور اس میں شک نہیں کہ یہ ایک مرتبہ عظیم ہے جس سے حق تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو نوازتے ہیں اور وہ دین کو غیر دین سے ممتاز کر دیتا ہے۔

۴۔ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے کہ عمل سے کبھی پہلے حضرت والا اس کی سعی فرماتے ہیں کہ لوگوں کی فہم درست ہو اسلئے کہ فہم درست ہوگی تو بہت کچھ دین کا کام کر لے گا اور جو کچھ کرے گا وہ صحیح کرے گا ورنہ بد فہم آدمی تو عمل کا ڈھیر بھی لگا لے لیکن اسکی بد فہمی نہ معلوم کس راہ سے اسمیں گھن کا کام کر جائے

ایک خصوصیت حضرت والا کی یہ نظر آرہی ہے جو پہلے سے ہے لیکن اب یادہ معلوم ہوتی ہے کہ آنے جانے والوں اور خاص کر پاس رہنے والوں سے جس طرح ایک جانب اخلاص کا مطالبہ شدید ہوتا جا رہا ہے اسی طرح دوسری جانب شفقت و رافت و رحمت بھی فراوان

ہوتی جا رہی ہے یعنی قلب کی نہیں اور دل کی مگر حضرت والا کے عمل میں برائی بعین
مشاہد ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے نفس سے نکال کر اپنی بندگی میں لگائے اور حضرت والا
کے نشانہ کو ہمارے ہی ذریعہ پورا فرمائے کہ لیسکا محض فضل و احسان ہو گا۔

مذمت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کئی مذمت شناس ازو کہ بخد مت بداشتت

(۱) احسان میت رکھو کہ تم سلطان کا کام کر رہے ہو بلکہ اسی کے احسان مند ہو کہ اس نے تم کو اپنی خدمت میں رکھ لیا
اور اس طرح سے اپنے کام پر لگا دے کہ حضرت والا کے لئے ہم سب لوگ قرۃ العین ثابت
ہو سکیں۔

حضرت والا کی توجہ کی برکت سے کچھ آنکھ کھل رہی ہے اور قلب میں بھی کچھ حرکت
پیدا ہو رہی ہے۔ دعار کا ہر آن محتاج ہوں کیونکہ اپنا حال جانتا ہوں، حضرت ہی کی توجہ سے
کشد و کار ہو رہا ہے اور اسی سے ترقی ہوگی۔ اس وقت یہی باتیں سمجھ میں آئیں جو عرض کیں حضرت
اصلاح فرمائیں۔ والسلام

(۵۱)

حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے جو خاص منصب ارشاد اور نور بصیرت عطا فرمایا ہے
اس امت کی گمراہی اور اس کے اسباب و علل کو بنظر غائر اچھی طرح دیکھ لیا ہے اسی لئے
امت کی اصلاح کے لئے ہمہ وقت بے انتہا سعی فرماتے رہتے ہیں اور گمراہی کے اسباب کے
ازالہ کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حضرت والا دیکھ رہے ہیں کہ عوام کا بگاڑ خواص کی وجہ سے ہوا
ہے، مدارس اور خانقاہیں قائم ہیں، مسلمانوں کے ہزار ہا ہزار روپے ان پر خرچ ہو رہے ہیں
مگر ایک آدمی بھی ان میں ایسا نہیں نکلتا جس کو صحیح معنوں میں کہا جاسکے کہ یہ اپنے بڑوں کا سچا
جانشین ہے اسی لئے حضرت اپنے خواص اور پاس رہنے والوں کی اصلاح پر بڑی خصوصی
نگاہ رکھتے ہیں کیونکہ عوام کی اصلاح خواص ہی کی اصلاح پر موقوف ہے۔

اسی طرح حضرت والا اپنی اولاد اور خدام کی اصلاح پر برابر زور دیتے رہتے ہیں
کیونکہ اصلاح باطن کی نعمت ہے اگر یہی لوگ محروم رہ گئے تو بڑے افسوس کی بات ہے تاکہ

بعض لوگوں کا مقولہ کہ تین شخصوں کو نفع نہیں ہوتا کم از کم یہاں تو نہ صادق آوے۔

حضرت والا صحابہ کرام اور اکابر امت کے حالات کو اس طور پر بیان کرنا پسند نہیں فرماتے کہ زمانہ حال کے لوگ سمجھنے لگیں کہ ہمارا حال بھی وہی ہے اور ہم بھی اللہ تعالیٰ کے انہیں انعامات کے مستحق ہیں جس کے وہ لوگ تھے۔ بلکہ اس زمانہ کے لوگوں کے ایک ایک مرض کو بیان فرما کر اسکی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جس طرح دور اول میں اخلاص اور مخلصین کی کثرت تھی اسی طرح اس زمانہ میں نفاق اور منافقین کی گرم بازاری ہے اسی لئے حضرت والا نے بڑے شہ و مد کے ساتھ اس مرض کے متعلق تحریر و تقریر سائل کے ذریعہ کلام فرمایا ہے جو بلاشبہ حضرت والا کا تجدیدی کارنامہ ہے۔

عام طور پر اس زمانہ میں فہم کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں کو معاش و معاد دونوں مقصدوں میں کامی ہوتی ہو اسی لئے حضرت والا فہم و عقل پر برابر زور دیتے رہتے ہیں اور فرماتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ عقل معاش باقی ہے نہ عقل معاد بعض لوگ نیک ہوتے ہیں مگر عقل کی کمی اور بد فہمی کی وجہ سے ناکام رہتے ہیں۔

اصلاح کے سلسلہ میں حضرت والا مخاطب کے فہم و استعداد کے لحاظ سے اسکی تربیت و اصلاح فرماتے ہیں ان دنوں خصوصیت کے ساتھ بسط سے اس پر کلام فرماتے ہیں اور تائید میں حضرت عائشہ کا اثر اور دیگر نصوص پیش فرماتے ہیں۔

امت کی گمراہی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ اصلاحی کام کرنا چاہتے ہیں بے طریقہ اور بے قاعدہ کام کرتے ہیں جو بات نہ کہنے کی ہوتی ہے وہ کہہ جاتے ہیں یا بے محل اور بے موقع کلام کر جاتے ہیں جس سے بجائے اصلاح کے افساد اور بجائے کام بننے کے بگڑ جاتا ہے اسی لئے حضرت والا کام کرنے کا طریقہ اور اسکے آداب بتاتے ہیں۔

حضرت والا کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اصلاح پورے طور پر فرماتے ہیں اس معاملہ میں ذرا بھی تسامح نہیں فرماتے مگر رفت و لین سے کام لیتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں کہ مخاطب کو بجائے توحش کے اسکی گردن ندامت سے جھک جائے اور اپنی کوتاہی کو براسی اعلیٰٰن مشاہیر سے لے۔

حضرت والا کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بڑے بڑے امراض جتنے لئے بزرگوں کے یہاں بڑے بڑے مجاہدے کرائے جاتے ہیں حضرت والا انکو ایک ایک جملہ سے زائل فرمادیتے ہیں۔ سالہا سال کے مجاہدے کی جگہ حضرت والا کا مختصر سا سوال اور گاہ گاہ کسی کے واسطے یا بلا واسطہ کچھ فرمادینا ہوتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک حضرت والا نے ایک مولوی صاحب سے کچھ مواخذہ فرمایا جس کو انھوں نے اپنی نا سمجھی سے حضرت والا کی ناراضگی پر محمول کر کے ایک صاحب سے سفارش کرائی، حضرت والا نے اس سبب سے فرمایا کہ دیکھو لوگ سمجھتے نہیں جو کام اگلے لوگ سالہا سال کے مجاہدے سے نکالتے تھے میں باتوں باتوں میں اسکی اصلاح کر لیتا ہوں۔

سیدی! حضرت کو معلوم ہی ہے کہ یہ سبب کار ہر طرح نابلد اور بد استعداد ہے اسلئے عجلت میں جو کچھ ذہن میں آیا عرض کر دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت والا کی خصوصیات سمجھنے کیلئے بڑی بصیرت اور ذہانت کی ضرورت ہے بڑی ہی لجاجت سے درخواست کرتا ہوں کہ دعا فرمائیں کہ یہ سبب کار بھی اس در سے محروم نہ رہے کم از کم سبب اصحاب کہف کی طرح نجات کا راستہ لمبائے اللہ تعالیٰ حضرت والا کے سایہ عاطفت کو تاابد ہمارے سروں پر قائم رکھیں۔ والسلام

(۶)

معروض خدمت اقدس اینکه یہ ناکارہ بد فہم حضرت والا دامت برکاتہم کی تعلیمات کو بیان ہی کیا کر سکتا ہے تعمیل حکم کیلئے چند باتیں عرض کرتا ہوں کہ وہ یہ کہ اجمالی اور کلی طور پر یہ تو سب پر واضح ہے کہ حضرت والا کی تعلیمات سراسر تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور طریق کار طریقی سنت ہے اور احقر یہ سمجھتا ہے کہ کسی مرشد و مصلح کے ثروت و فضل اور اسکے طریقہ اصلاح کے غیر خوبی کیلئے اس سے بڑھ کر کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی ذِیكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مِنْ يَشَاءُ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت والا اپنی خدا داد بصیرت و فراست سے امت کے خواص اور عوام کے احوال کا بنظر غائر مطالعہ فرما کر کتاب و سنت سے اس کے احکام بیان فرماتے رہتے ہیں جو احوال و اوضاع کے مطابق ہوتے ہیں۔

یہ نہیں کہ ہیں تو لوگ بتلائے نفاق و فسق و فجور میں اور بیان کیا جائے حضرات صحابہ کے واقعات اور ان کے فضائل اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ تم بھی انھیں جیسے ہو اور ان کے شرف و فضل میں برابر کے شریک ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے انکا حال مشتبہ ہو جائے گا اور باوجود ہلاکت کے اپنی ہلاکت کا تصور بھی نہ کریں گے اسلئے برابر حضرت والا آیات منافقین اور ان کے واقعات بیان فرماتے ہیں اور زمانہ حال کے حالات سے مطابقت فرماتے ہیں تاکہ اپنے مرض کا صحیح علم ہو جائے اسکے بعد ہی شفا کی امید ہو سکتی ہے اور اصلاح کی توقع کیجا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حضرت مولانا مدظلہم کی یہ نہایت دیانت اور اہمیت ہے کہ اپنے پاس والوں کو دین و تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دیا کرتے ہیں اور برابر متنبہ فرماتے ہیں کہ ہمارا جسمانی قرب کافی نہیں ہے تم کو کچھ حاصل ہو سکتا ہے تو تم کو بھی وہی کرنا ہوگا جو اغیار کو کرنا ہوتا ہے یعنی عقیدت و صدق و خلوص اختیار کرنا ہوگا۔ جمعی کچھ فیض حاصل ہو سکتا ہے۔ اور حضرت کیا خوب بیان فرماتے ہیں کہ تین صنف کو جو اہل اللہ سے فائدہ نہیں ہوتا تو اسکی وجہ میرے نزدیک ہے کہ فیض کے حصول کیلئے جو شرط اول ہے یعنی عقیدت وہی مفقود ہے اسلئے محروم رہتے ہیں ان کے پاس والوں کی ایسی مت ماری جاتی ہے کہ ظالم سرے سے عقیدت ہی کھو بیٹھتے ہیں عمل میں کوتاہی ہو تو دور بھی ہو جائے مگر عقیدت کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے اسلئے باوجود ہر اعتبار سے قرب کے باطن کو سوں دور رہتے ہیں۔ اعاذنا اللہ منہا۔

حضرت والا کا یہ بھی خاص ارشاد ہے کہ بھائی جب ہم پاس والوں اور قلیل مقدار کی اصلاح نہیں کر سکتے تو باہر جا کر دوسروں دوسروں کی اصلاح پر کیسے قادر ہو سکتے ہیں اسلئے الاقرب فالاقرب اور اقل فالاکثر کا بہت لحاظ فرماتے ہیں جو نص کے بالکل موافق ہے وَأَمَّا زُكَّيْنِ فَكَوْنَا أَقْرَبِينَ۔ نیز اسکا اہتمام بھی فرماتے ہیں کہ تعلیمات کے پیش کرنے میں رفق و سہولت کا لحاظ ہوتا کہ مخاطبین خوشی قبول کریں ورنہ تو بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ فی نفسہ ایک شئی محمود ہوتی ہے مگر بے موقع یا بد عنوانی اور بے ڈھنگے طریقہ پر پیش کرنے سے بھونڈی اور بد نما ہو جاتی ہے جس سے مخاطب پر اچھا اثر نہیں پڑتا

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر احکام نازل فرمانے میں انکی طبیعت کا لحاظ فرماتے ہوئے ترتیب کا لحاظ فرمایا ہے، اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے ورنہ یکایک احکام شاقہ کے نزول سے انکار پیدا ہو جانے کا احتمال تھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اثر موجود ہے۔

نیز حضرت والا فہم کے پیدا کرنے اور بات کے سمجھنے کی طرف بہت زور دیتے ہیں اور دین و دنیا کی باتوں کو کھول کھول کر بیان فرماتے ہیں اور یہ اکثر فرماتے ہیں کہ نیک تو ہیں مگر فہم نہیں ہے اگر ذرا سی فہم ہو جائے تو کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ دنیاوی فہم میں بھی نقص کی برابر شکایت فرماتے ہیں کہ تم سے دین کیا پٹرے گا اور اسکو کیا سمجھو گے ہم لوگ سمجھ لیں تو بہت ہے تم دنیا ہی قاعدہ سے کر لو تو بہت بڑی بات ہے۔ اس طرح الحمد للہ کام کرنے سے نفع محسوس کیا جا رہا ہے، خواص و عوام سبھی متاثر ہیں۔ آج اس طرح کام کرنے والے جو سمجھ و عقل رکھتے ہوں کام کریں تو اب بھی فائدہ ہو مگر اس طرح کام کرنے والے معدوم ہی سے ہو گئے ہیں۔ اسلئے کام نہیں ہو رہا ہے حضرت والا یہ مختصر سا خاکہ پیش خدمت ہے حتیٰ الوسع اختصار کیا ہے تاہم طویل ہو گیا ہے معاف فرمائیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو سمجھ عطا فرمائے۔ والسلام

(۷)

عرض خدمت اقدس میں یہ ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنی خدا داد بصیرت و فراست سے جو طرز تربیت اور طور اصلاح اختیار فرمایا ہے وہ کتاب سنت سے ماخوذ اور طریقہ نبویہ کے عین مطابق ہے حضرت والا نے خواص و عوام کے حالات کا بنظر فائز مطالعہ فرمایا ہے اور پھر ان کے مناسب حال کتاب و سنت کی روشنی میں کلام فرمانا شروع کیا جس کا نفع ہر طبقہ میں ظاہر و عیاں ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہ ضرورت تو لوگوں کو مبادی امور کی تعلیم کی ہے اور ان کے سامنے حضرات صحابہ کے فضائل و مناقب بیان کیے جائیں اور جن امراض میں لوگ مبتلا ہیں ان سے تعرض ہی

نکلیا جائے جسکی وجہ سے خود ان پر اپنا حال مشتبہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ پھر اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے اسلئے حضرت والا نے مرض نفاق میں عام ابتلا دیکھ کر نفاق و اخلاص کی بحث چھیڑی اور قرآن و حدیث اور اکابر کی تصریحات سے اس پر مفصل و مدلل کلام فرمایا گویا اس سلسلہ میں بھی علم کا ایک باب مفتوح فرمادیا اور پھر تعلیم و تربیت میں بھی یہ ترتیب قائم فرمائی کہ سب سے پہلے اپنے گھر کے افراد پھر قریب کے خدام پھر عوام کو خطاب فرماتے ہیں اور موافقی نص و اُسْذِ رُعْشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ کے پہلے اپنوں سے تب دوسروں سے کچھ فرماتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اولاد و خدام کے حق میں یہ بھی کمال رافت و شفقت ہے کہ یہی لوگ کیوں فیوض و برکات سے محروم رہ جائیں مگر اس کے باوجود جو لوگ انہیں سے محروم رہ جاتے ہیں تو اسکی وجہ یہ ہے کہ حصول فیض کے لئے شرط اول اعتقاد و اخلاص ہے اور یہ اپنوں اور غیروں سب ہی کے لئے ہے۔ پس جنکو فہم، عقیدت و خلوص ہوتا ہے انکو فیوض سے حاصل جاتا ہے اور جنکی مت ہی ماری جاتی ہے انکی فہم تک درست نہیں ہوتی اسلئے وہ محروم رہ جاتے ہیں اور یہ وجہ بھی ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے ذہنوں میں بات بھی آ جاتی ہے کہ جیسے ہم لوگ ان بزرگ کے مال و جائداد میں شریک ہیں اور ان کے بعد وارث ہوں گے اسی طرح انکی بزرگی اور ولایت میں بھی اپنا استحقاق سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ ان بزرگ کو تو بہت ریاضت و مجاہدہ کے بعد یہ دولت حاصل ہوئی اور اس منصب سے مشرف ہوئے اور یہ لوگ بغیر کچھ کئے دھڑے ہی اپنے کو اس منصب کا مستحق سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ ان بزرگ کے مریدین ان لوگوں کو ابھی نظروں سے دیکھتے ہیں اور تعظیم و تکریم کا معاملہ کرتے ہیں اسلئے غرور اور دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں اور اس طرح کمال کی تحصیل کی طرف توجہ اور التفات نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی حکیم و ڈاکٹر ہے تو کیا اسکی بیوی، بچے اور اقربا و اہباب سب ڈاکٹر ہو جاتے ہیں؟ ایسا تو نہیں ہوتا۔ اور نہ محض مال میں وارث ہونے کی وجہ سے کوئی اس فن میں وارث ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسی چیز میں کیوں ایسا ہوگا؟ اب بجز اسکے اور کیا کہا جائے کہ یہ بھی شیطان کا کید اور زبردست اغوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عوام الناس تو آج بھی دین کے لئے تیار ہیں مگر ان میں جو تعطل ہے اسکی سب سے بڑی وجہ خواص ہی ہیں کہ نہ تو انکو دین کی فہم ہے اور نہ دنیا ہی کی عقل ہے مدرسہ میں پہنچے تو وہاں کچھ نہیں سیکھتے اور مشائخ کی خدمت میں آئے تو وہاں بھی کچھ حاصل نہیں کرتے، البتہ کسی بزرگ کی خدمت میں پہنچ جانے کی وجہ سے ہر ہر فرد اپنے متعلق کمال کا مدعی ہو جاتا ہے اور اپنے کو واجب التکریم و تعظیم سمجھنے لگتا ہے۔ حضرت والا اس پر بھی بار بار متنبہ فرماتے رہتے ہیں کہ یہاں قرب جسمانی کا اعتبار نہیں ہے بلکہ قرب روحانی معتبر ہے ہو سکتا ہے کہ قرب جسمانی کے باوجود قرب روحانی نہ حاصل ہو — اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ ہماری جماعت سے باوجود حق پر ہونے کے جو کام نہیں ہو رہا ہے تو اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ کام کرنے چلے انھوں نے اپنی لاعلمی اور بے بصیرتی اور قلتِ عقل و فہم کی وجہ سے غلط طرز اختیار کیا سو جب سے کام نہیں ہوا اور نہ اگر اب بھی صحیح طریق کار اور مناسب طرز اختیار کیا جائے تو کام ضرور ہوگا اور لوگ ضرور دین اختیار کریں گے اور بہت کچھ سیکھ لیں گے۔

حضرت والا! جو کچھ ہو سکا مختصر عرض کر دیا۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ فہم سلیم اور فقہ فی الدین عطا فرمائے۔ آمین۔

(۸)

حضرت والا دامت برکاتہم نے اپنے تعلیم و تربیت کی خصوصیات دریافت فرمائی ہیں یہ بد فہم، بد استعداد ایسی ذات کے جمال و کمال اور تعلیم و تربیت کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے دین متین کی خدمت و اشاعت اور مردہ دلوں میں ایمان و یقین کی روح پھونکنے کے لئے پیدا فرمایا ہو اور اس دور فاسد و جہل و جہالت میں قرآن و سنت کی ترویج اور اخلاق نبوی و شریعت مطہرہ کی تعلیمات سے دل و دماغ کو روشن کرنے کے لئے منتخب فرمایا ہو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی ذات کو اس دور فتن میں مسلمانوں کے لئے پشت پناہ اور مامن بنایا ہے۔ حضرت تو بیسٹ ارض پر

حجۃ اللہ فی الارض میں ع۔ کہیں دیکھا کہیں نہ پایا جمال ایسا کمال ایسا۔

یہ بلید اور بد فہم حضرت والا کی توجہ اور برکت سے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے
 ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ نکمت گل۔ حضرت والا ہمیشہ ہی غوام و خواص کے سب
 حالات اور تمام خرابیوں کی اصلاح قولاً و فعلاً فرماتے رہتے ہیں شرب و روزہ ہر آن امت
 کی اصلاح کی فکر رہتی ہے اور کتاب و سنت و سلف صالحین کی ترجمانی اور تعلیمات نبویہ
 کو دلنشین عنوان سے پیش فرماتے رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ توجہ و زور حضرت والا کا فہم کے
 لئے ہوتا ہے۔ آنے جانے والوں کو غموں اور پاس رہنے والوں کو خصوصاً دیکھتے رہتے ہیں
 کہ ان میں فہم کتنی پیدا ہوئی کیونکہ حضرت والا مسلمانوں کی عام بد حالی کو اسی بد فہمی کا نتیجہ
 سمجھتے ہیں کہ دین و دنیا کا کام اسی فہم کی خرابی کی وجہ سے خراب ہے اگر آدمی میں فہم و
 عقل نہ ہو تو دین کا کام تو کیا کریں گے دنیا کا بھی کام نہیں کر سکتے چنانچہ ہمارے معاد و معاش
 میں برابر کتاب و سنت سے رہنمائی فرماتے رہتے ہیں اور اسکی کوشش بلیغ فرماتے ہیں کہ بات
 سمجھ میں آجائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا نائب
 اور وارث اور نسبت محمدیہ کا حامل بنایا ہے اس لئے ہر ہر قدم پر سنت نبوی کی اتباع فرماتے
 ہیں۔ پہلے اور سب سے زیادہ اپنے قریب والوں کو دین و دیانت اور اخلاق کی درستی کی طرف
 متوجہ فرماتے ہیں اور یہ جو مقولہ مشہور ہے کہ کسی شیخ سے ان کے اولاد و خادم اور گھر والوں
 کو نفع نہیں ہوتا تو اسکی وجہ حضرت والا یہ فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ مدارِ نفع عقیدت
 پر ہے ان لوگوں کو چونکہ دوسرے قسم کا بھی تعلق ہوتا ہے اسلئے ان لوگوں کو اعتقاد و مشکل
 ہی سے ہوتا ہے جو مدارِ نفع ہے عملی کو تاہی کی مکافات ہو سکتی ہے مگر اعتقاد کی کمی کی
 مکافات نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لوگ جو عقیدت سے آتے ہیں نفع اٹھاتے ہیں اور یہ پاس
 والے محروم رہتے ہیں۔

حضرت والا کو یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ دوسرے کو نفع اٹھائیں اور پاس والے محروم
 رہیں چنانچہ وانذر عشیرتک الاقربین اور قسم فاندرا و سنت نبوی پر عمل فرماتے ہیں۔

(مرید صادق کی ایک صفت)

آپ نے حضرت مصلح الامۃ کے امتحانات ملاحظہ فرمائے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی طالب اصلاحی تعلق حضرت اقدس سے رکھے اور غافل رہ سکے ہر وقت خود بھی اسکی اصلاح کی تدبیر سوچنے میں غرق رہتے تھے اور اسکو بھی فکرمند بنائے رکھتے تھے عرصہ چنانچہ اند بی رہ می تراش و تراش کا صحیح نقشہ ہیں دیکھنے میں آتا تھا۔ کوشش اس امر کی ہوتی تھی کہ طالب کے اندر خود اس درجہ فہم پیدا ہوگا کہ طریق کے خلاف امور کے ارتکاب اسکو بطور خود کھٹک پیدا ہونے لگے چنانچہ لوگوں کا یہی حال ہو جاتا تھا ایک سالک کا خط ملاحظہ ہو حضرت کو دکھا کہ :-

حضور والا کچھ مدت میں ماضی کے وقت میں نے عہد کیا تھا کہ جو کام کرونگا وہ حضرت والا کے حکم کے مطابق کرونگا وطن پہنچا اس عہد میں اور بختنگی ہو گئی اسلئے یہاں پر ایک اجلاس کے سلسلہ میں حضور والا سے استصواب رائے کرنے کیلئے عریفہ ارسال خدمت کیا جس کا جواب تو باعث سرفرازی ہوا مگر مجھے پورے طور پر تشفی نہیں ہوئی کیونکہ اس میں حضور والا نے اپنی سرپرستی سے نہیں نوزا جس معلوم ہوا کہ حضرت اس فہم کی چیزوں کو پوری خوشدلی سے پسند نہیں فرماتے میں چونکہ عہد کر چکا ہوں کہ یہاں پر کوئی کام اب بدو حضرت کی پسندیدگی کے نہیں کرونگا کیونکہ میرا پختہ یقین ہے کہ مجھے جو کچھ ملا اور آئندہ ملیگا اپنے بزرگوں کی اطاعت شعاری ہی سے ملیگا جذبہ اطاعت شعاری کے بغیر بزرگوں کی دعاؤں تو جہات محرومی ہوگی جسکو میں کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا چنانچہ رفقائے کار سے بھی یہی کہہ دیا ہے کہ جب تک حضرت کی خوشدلی کے ساتھ پسندیدگی معلوم کرونگا اسوقت تک میں سکوت کرونگا اسلئے آئندہ کا دار و مدار حضرت کی پسندیدگی و استحسان کی اطلاع یا بی پر ہوگا

حضرت اقدس نے جواب مرحمت فرمایا :- ”عہد پر بختنگی مبارک ہو آپ کی عقیدت و محبت سے خوشی ہوئی ایک مرید صادق کو ایسا ہی ہونا چاہیے باقی ان جلسوں کو زیادہ مفید مسلمانوں کے لئے نہیں سمجھتا ہوں مگر منع بھی نہیں کرتا یہ مقامی حضرات کی رائے پر ہے وہاں کے حالات سے وہ واقف ہوتے ہیں خود کریں یا دوسروں کو بلائیں میں جب خود کہیں نہیں جاتا تو دوسروں کو کیوں منع کروں۔“

(حضرت والا حسن اعتقاد اور معرفت کی باتوں سے خوش ہوتے تھے)

ایک سترشد نے لکھا کہ :- ”بندہ کو حضرت والا سے قلبی محبت پیدا ہو چکی ہے صرف حضور والا کے اخلاقِ حسنہ کو سن کر نیز اصلاحِ نفس کے متعلق حضرت کی بے لوث خدمت معلوم کر کے کہ درحقیقت یہی شانِ ہمارے سلفِ صالحین کی تھی جسے آج ہملگوں نے کھو دیا ہے جسکی وجہ سے آج ہمارا یہ حال ہے۔ حضور والا آج دنیا میں صحیح مصلحین کی بڑی کمی ہے، جہاں کہیں موجود بھی ہیں تو ہم کو ان کی مخالفت میں مزہ آتا ہے اور دن رات کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ انکی جڑ کاٹ دیں۔ حضور والا میری اصلاح فرمائیں اور اپنی غلامی میں داخل فرمائیں

حضرت مصلحِ الامۃ کا جواب :- ”آپ کی محبت کا ممنون ہوں یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے کہ اپنے نیک بندوں کو توجہ فرما دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس محبت اور تعلق کے ثمرات سے طرفین کو دارین میں بہرہ ور فرمائے آپ نے میرے متعلق جن جذبات اور خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ آپ کا حسن ظن اور آپ کی محبت ہے اللہ تعالیٰ مجھے اسکے مطابق فرما دے اور سلفِ صالحین (کے زمرہ) میں ہمارا بھی شمار فرما دے

احب الصالحین ولست منهم لعل الله يرزقني صلاحاً

(میں صالحین سے محبت کرتا ہوں گو انمیں سے ہوں نہیں عجب کیا کہ اللہ تعالیٰ کچھ حصہ صلاح میرے لئے بھی مقدر فرما دے) آپ کی یہ بات بہت پسند آئی کہ آج صحیح مصلحین کی دنیا میں بڑی کمی ہے لہذا ”بالکل صحیح ہے اور واقعہ کے عین مطابق ہے اور ابتلا زمانہ کی صحیح ترجمانی ہے آپ کا اصلاحی تعلق دل سے منظور ہے تشریف لاکر اجازت

(”تا دمِ آخر دمے فارغِ مباحث“ اچھا حال ہے)

ایک طالب نے اپنا حال لکھا کہ :- مولائی! اپنے امکان بھر سعی کئے جا رہا ہوں اور قوی امید ہے کہ مولانا تعالیٰ بھی اپنی بید عنایتوں سے سرفراز فرمائیں گے، پھر بھی بید تردد اور شک ہے کہ معلوم نہیں میری کیا حالت ہے قربِ مولا عطا ہو رہا ہے یا نہیں ایک ایک دن جیسا گذرتا ہے اپنی نااہلی اور کورے پن کا زیادہ سے زیادہ احساس ہوتا جا رہا ہے عجیب حیرت میں ہوں جہاں بید یقین حاصل ہے وہیں گاہے گاہے ناامیدی اور یاس کی ایک موہوم سی لہر بھی دل پر چھا جاتی ہے جو کبھی ایک آن میں یا ذرا سی دیر کے بعد پھر مولانا تعالیٰ کے فضل سے دور ہو جاتی ہے۔ مولائی! اب مستدعی ہوں کہ میرے لئے ایک دستور العمل مقرر فرما دیجئے میں دن بھر اپنے کو وقف کرنا چاہتا ہوں۔

(اسکا جواب حضرت کے یہاں سے یہ گیا)
مجھے تو آپ کے حالات معلوم کہ بہت خوشی ہوئی ہے اس کے ساتھ جس یاس سے آپ پریشان ہوتے ہیں وہ عین ایمان کی علامت کے لایمان بن انخوف والہ جارہے اگر اتنی پریشانی اور خوف نہ ہو تو ناقصین عجب میں مبتلا ہو کر اپنا پاس ہی کر لیں۔ آپ نے دستور کی فرمائش کی ہے تو مومن کا دستور العمل تو قرآن و شریعت ہے اللہ و رسول ہی نے اسکو بنایا ہے۔ پانچ نماز فرض فرمادی ہے۔ تلاوت و ذکر و تسبیح بھی آپ کر ہی رہے ہیں اب کیا چاہتے ہیں کہ بالکل مجموعۃ الوظائف ہی ہو کر رہ جائیں حضرت (تھانوی) کے مواعظ اور تفسیر بیان القرآن بہشتی زیور وغیرہ کا مطالعہ کبھی آپ فرما رہے ہیں۔ اسلئے میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اب صرف آپ قلب کی نگرانی فرمائیں یعنی یہ دیکھیں کہ یہ نماز و روزہ ذکر و تلاوت و تسبیح اور مطالعہ کتب جو کچھ ہو رہا ہے ان میں کس درجہ اخلاص ہے اور دو برابر بڑھ رہا ہے یا نہیں۔

اسکے علاوہ اور معاملات میں بھی اسکی حفاظت فرمائیں کہ نفاق سے اپنے اقوال و اعمال و احوال کو بچائے جائیں، بس تو پھر انشاء اللہ اتنے کو اخلاص کے ساتھ کرنے اور نفاق سے دور رہنے اور بچنے کے بعد اب اور کسی چیز کی مزید ضرورت نہیں ہے البتہ نفاق اور اخلاص کی تفصیل معلوم کرنے کیلئے وصیۃ الاحسان - تحذیر العمار - عاقبۃ الانکار و عمیۃ الاخلاق اور مضمون ذکر جو میرے رسائل میں انکا مطالعہ بار بار کیجئے اور رسالہ اخوت نیز التذکیر بالقرآن جو کہ رسالہ الفرقان میں شائع ہوا ہے ان سب کا مطالعہ فرمائیے اور پھر اپنے تاثرات سے مجھے بھی مطلع فرمائیے

آپ کے کل خط کا یہی جواب ہے، باقی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اللہ تعالیٰ جانیں۔ ع۔
رموز مصلحت و خولیش خسرواں دانند۔ نسبت کے الوان مختلف ہوتے ہیں جبکہ مناسب جو لون ہوتا ہے اس سے اسکو نوازتے ہیں اور جب مصلحت ہوتی ہے تب ہی عطا فرماتے ہیں، ہمارا کام بس درخواست کرنا ہے تقاضا نہیں ہے۔

کھولیں وہ یاد کھولیں در اسپر ہو کیوں تری نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صد لگائے جا

حضرت مصلح الامۃ کے مکتب اصلاح کے یہ وہ نمونے تھے جو عام سالکین کی اصلاح کے سلسلے میں حضرت کے یہاں دیکھے جاتے تھے۔ اب بعض وہ نمونے بھی ملاحظہ فرماتے چلتے جو خواص اور انھیں انھیں، منظور نظر طالبین کی اصلاح کے سلسلے میں معرض وجود آتے رہے، اہم شک نہیں کہ ان چند ہی مکاتیب کے مطالعہ سے حضرت اقدس کی شان شفقہ علی الامۃ اور ایک طالب خدا کے ساتھ حضرت کی قلبی محبت کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ افسوس اب کہاں یہ شفقت بھری اصلاح دیکھنے میں آئیگی اور کہاں ایسا ساقی نظر آئیگا، بس اب تو یہ حال ہو رہا ہے کہ یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساتی کے نہونے سے کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور میخانہ خالی ہے اب وہ خطوط ملاحظہ فرمائیے :-

بعض خواص کے مخصوص خطوط

حال : حضرت والا کے سمجھانے سے یہ بات دل میں جگہ پکڑتی جا رہی ہے۔
تحقیق : نہایت مبارک ہے (یہ حال) یہی انتفاع بالعلم ہے اسکے بعد عمل ہے۔
حال : کہ اللہ و رسول کے دربار کے مجین جو نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح معنوں میں حق ادا کر رہے ہیں ان حضرات کی جیسی کچھ کہ شان و عظمت ہے اس اعتبار سے ان سے تعلق و محبت کا دعویٰ کرنا جھوٹ ہی ہے۔ تحقیق : اور کیا۔
حال : اور جب قدر بھی تعلق حاصل کیا جائے کم ہے۔ تحقیق : بیشک
حال : اس راہ میں اصل چیز شیخ سے قلبی محبت و انس اور تعلق ہے۔ تحقیق : بیشک
حال : دل میں اکثر یہ خیال آیا جایا کرتا ہے کہ یہ قرب جو حضرت والا سے حاصل ہے یہ بھی بہت بڑا فضل ایزدی ہے۔ تحقیق : الحمد للہ، بیشک۔
حال : ظاہر دولت اس سے جتنی بھی حاصل ہو جائے ہو جائے مگر باطنی دولت جو کہ اللہ و رسول کی سچی محبت و معرفت ہے وہ تو حضرت والا کی جوتیوں کے صفہ

ہی میں حاصل ہو سکتی ہے (یعنی محض قرب بدنی اس کے لئے کافی نہیں) تحقیق، بالکل صحیح ہے۔

حال، حضرت والا دعار فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فہم ظاہری اور فہم باطنی سے نوازیں تحقیق، دل سے دعار کرتا ہوں

حال، اور حضرت والا کی سچی معرفت اور قلبی انس و تعلق سے نوازیں تحقیق، آمین ثم آمین حال، تاکہ اپنی بگوہی بن جائے تحقیق، آمین ثم آمین ثم آمین۔

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس کا معمول عام طور سے تو یہ تھا کہ کسی طالب دعار کے جواب میں ایک مرتبہ آمین تحریر فرمایا کرتے تھے یہاں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دو دفعہ تین تین بار آمین تحریر فرمایا (یعنی یہ کہ آمین، ثم آمین، ثم آمین تحریر فرمایا) اس سے حضرت والا کے طالب موصوف کے حال کی جانب اعتناء کا اندازہ ہوتا ہے کہ جس رفتار پر انکا پہلنا دیکھنا چاہتے تھے دیکھا اور جس حال کی توقع فرمائے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ سے اصرار و الحاح کے ساتھ اسکی دعار فرمائی، واللہ تعالیٰ اعلم)

(انہیں سالک کا دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے)

(حضرت مرشد می نور اللہ قدف نے اپنے یہاں درس و تدریس کا بھی سلسلہ قائم فرما رکھا تھا اپنے چاروں خویش کو خود ہی پڑھایا کرتے تھے اس درس میں خانقاہ میں مستقل قیام کرنے والے بعض حضرات بھی شریک رہتے تھے، چنانچہ ان طلباء سے بھی خانقاہ کے طرز کا امتحان ہوتا تھا مثلاً یہی کہ کبھی کبھی یہ سوال ہوتا تھا کہ میں جو آپ لوگوں کو پڑھا رہا ہوں اس کے لئے وقت دیر ہا ہوں اسکا کیا ثمرہ مرتب ہو رہا ہے اسکو بیان کیجئے ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ میرا ضمیر اس پر راضی نہیں ہے کہ میں بلا کسی نتیجہ کے اپنا وقت ضائع کروں۔ ایک مرتبہ اسی نوع کا کچھ سوال ہوا اس پر ایک صاحب نے یہ جواب پیش فرمایا) :-

حضرت والا نے فرمایا کہ سبق اسلئے ہوتا ہے کہ علم سے مناسبت پیدا ہو، عقل صحیح حال، اور فہم سلیم اور تجربہ کی زیادتی ہو (اور دیکھتا ہوں) یہ نہیں ہو رہا ہے اسلئے میرا ضمیر

اسکے لئے رضی نہیں کہ میں اپنا وقت ضائع کروں، تو حضرت والا کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے بیشک حضرت والا جتنی کاوش اور تکلیفیں برداشت کر کے اور اپنا خون پسینہ ایک کر کے پوری توجہ اور رغبت سے پڑھاتے ہیں اس اعتبار سے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ بالکل ہی خالی خولی ہیں اور حضرت والا کی سعی گراںمایہ کی قدر کچھ تو عام قومی کی کمزوری اور کچھ بے فکری اور نا عاقبت اندیشی اور خلوص کی کمی کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے اور یہ چیز ہمارے لئے افسوس صد افسوس خون رونے کی چیز ہے، اور حضرت والا کے لئے بھی بہت گھٹن اور روحی کوفت کا باعث ہے۔

حضرت والا اس سلسلہ میں میں تو اپنے آپ کو (بالکل ہی) طفیلی سمجھتا ہوں کہ کوزہ مہری کے ساتھ ساتھ ایک حقیر وھاگے کا بھی گزر ہو جاتا ہے بلکہ اسی قیمت کو فروخت ہو جاتا ہے اسلئے میری زبان یہاں نہیں کھلتی کہ میں علم سے مناسبت اور استعداد کے متعلق حضرت سے عرض کروں۔ ہاں البتہ یہاں دو چار اشخاص ایسے ہیں کہ حضرت والا کی سعی (ان شاء اللہ تعالیٰ) رائیگاں نہیں جائیگی۔

یوں تو حضرت والا کے اعلیٰ معیار اور کسوٹی کے سامنے (سب ہی لوگ) نیچے ہی ثابت ہوں گے مگر عام حالات کے اعتبار سے جیسا کہ (عام طور سے) مدرسہ اور اہل مدرسہ کے حالات دیکھے جاتے ہیں کہ مدارس زیادہ ہوتے جا رہے ہیں اور علم نایاب اور پڑھنے پڑھانے والے کمیاب ہو رہے ہیں اس دنیا میں ان میں حضرت والا کے فیوض و برکات کے طفیل میں امید ہے کہ چند لوگ کام کے ثابت ہوں گے اور حضرت والا کی سعی وصول ہو جائیگی اور ان ہی حضرات کے طفیل میں ہم جیسے بد استعداد اور بد فہم کے کانوں میں بھی قرآن و حدیث کے صحیح معنی و مطلب حضرت والا کی زبان مبارک سے سنکر پڑھاؤں گے گا اور ایسے ہی سننے سناتے بہت کچھ پہلے پڑ جانے کی امید ہے کہ

مستی کے کیلے بوئے مئے تند ہے کافی میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے
حضرت والا دعا فرماویں اور اللہ تعالیٰ اس حقیر خادم پر اپنا فضل فرماویں اور حضرت والا کے فیض سے نوازیں۔

احمد شہ حضرت والا کی توجہ سے پہلے کے اعتبار سے بد استعدادی اور بد فہمی میں فرق پاتا ہوں (یعنی استعداد و فہم بہ نسبت پہلے کے بہت کچھ بڑھی ہے، اور کوشش کرونگا کہ اور بڑھے۔

(حضرت مسلم الامۃ کا انتہائی شفقت آمیز جواب)

آپ نے سب صحیح تحریر فرمایا ہے، اب میری (داستان) سنو اور غور سے سنو! شاید دیوبندیوں میں (یعنی مدرسہ دیوبند میں) اور اہل تھانہ بھون میں مجھ سے بد استعداد کوئی نہ تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ جائے استاد خالی است بجز اس خاکسار کے کوئی کام نہ کیا نہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جو مشاہدہ کر رہے ہو پہلے کی سنو ہمارے سرگروہ سید احمد صاحب بریلوی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے یہاں پڑھنے گئے، کافیہ پڑھتے تھے ایک دفعہ مولانا کے پاس رونے لگے کہ مجھ کو تو کافیہ کے حروف ہی نظر نہیں آتے مجھ کو علم کیا آویگا۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو تم کو کتاب سے علم نہ آویگا علم لدنی ملیگا، چنانچہ اس دور کے علماء فحول انکے شاگرد ہوئے۔ مولانا مملوک علی صاحب جب دہلی پڑھنے گئے تو دو تین دن پڑھانے کے بعد ہر استاد انکار کر دیتا تھا کہ تم غبی ہو یہ مولانا عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس گئے کہا کہ تم کو پڑھنے کا شوق ہے کوئی پڑھاتا نہیں مولانا صاحبؒ نے فرمایا کہ (تم کو) ہم پڑھائیں گے (صرف) تین دن پڑھایا اور فرمایا کہ جاؤ اب جس استاد سے پڑھو گے پڑھائیگا، چنانچہ استاذ العلماء ہوئے، مولانا گنگوہی، مولانا محبت نام صاحبؒ کے استاد تھے۔ خوب سمجھ لو۔

(ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت والا کی یہ باز پرس اور بظاہر عقاب کس قدر سخت ہے کہ ارشاد ہو رہا ہے کہ تعلیم دین اور درس و تدریس سے جو میرا مقصد تھا آپ لوگوں میں اسکا حصول نہیں دیکھ رہا ہوں اسلئے میرا ضمیر اسکے لئے راضی نہیں کہ (خواجواہ آپ لوگوں کو وقت دیکر اپنا وقت ضائع کروں) — لیکن طالب علم موصوف نے بھی جو کہ سالک بھی تھا اسکا کیسا جواب لکھا اور کس درجہ پستی اور تواضع، انقیاد اور کسر نفسی اختیار فرمائی کہ جس نے

اس عتاب والا کو ترحم اور شفقت کا جامہ پہنا دیا اور پھر اسکے بعد حضرت اقدسؑ نے طالب مذکور کی کیسی کچھ دلداری فرمائی ہے کہ سبحان اللہ۔ اسکی یاس کو آس سے بدلنے کے لئے اپنے نیز بزرگوں کے واقعات بیان فرما کر کس قدر تسلی فرمادی گویا زخم پر مرہم رکھ دیا اور امید لگا دی کہ علم اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ اور منجملہ موصبت الہیہ کے ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی جانب سے بخشدیتے ہیں، ذہن اور کوشش پر اسکا مدار نہیں ہے پھر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صرف یہ سنانا ہی مقصود تھا یا اس کے ضمن میں اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمکو بھی اسی راہ سے جو ملنا ہو گا ملیگا اور پھر خود حضرت والاؑ نے ان محترم کیلئے اللہ تعالیٰ سے کیسی کچھ دعا رنہ فرمائی ہوگی۔ وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

(سائل موصوف کا تیسرا خط)

جسکی صورت یہ ہوئی کہ ایک دن خود حضرت اقدسؑ نے بذریعہ تحریر انکو مخاطب کیے تحریر فرمایا کہ ”میں آپ سے ایک بات دریافت کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کو مجھ سے کامل اعتقاد ہو گیا یا کچھ کسر باقی ہے؟ دوسرے یہ کہ طریق سے مناسبت کس قدر ہوئی؟ — یہ میں کسی وجہ سے لکھ رہا ہوں آپکو تہمت کی وجہ سے نہیں لکھ رہا ہوں۔ والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ“

(اس سوال کا جواب اور اُس پر حضرت والاؑ کا ارشاد)

گزارش خدمت اقدس میں یہ ہے کہ حضرت اقدسؑ نے عقیدت کا ملہ و طریق سے حال مناسبت کے متعلق دریافت فرمایا ہے جو کہ اس راہ کی بہت ہی اہم اور بنیادی چیز ہے۔ (عرض ہے کہ) عقیدت کے متعلق جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ (الحمد للہ) حضرت والاؑ سے عقیدت ہے، اگر حضرت والاؑ سے عقیدت نہ ہوگی تو کس سے ہوگی؟ اگرچہ اپنے اندر اتنی قوت نکو یہ و علیہ نہیں ہے کہ حضرت والاؑ کے درجات عالیہ کو سمجھ سکوں، مگر ذی استعداد اور ذی رائے لوگوں کے (یعنی علماء و فضلاء کے) رجوعات سمجھنے کیلئے کافی ہیں۔

(جو) بد فہم انسان بھی سمجھ سکتا ہے اور عقیدت مند ہو سکتا ہے۔ یہ شخص کے حق پر ہوگی تحقیق: یہ بہت سمجھ کی بات تھی یہی بہت بڑی دلیل ہے ایسے شخص کے حق پر ہوگی اللہ تعالیٰ تمہیں فہم کامل عطا فرماوے۔ آمین۔

حال: اب یہی طریق سے مناسبت (تو عرض ہے کہ نہ تو میری مان ہی عالمہ تھیں اور نہ میرے باپ دادا عالم و فاضل تھے، ایک کسان جاہل گھر کا رہنے والا، ان ہی لوگوں کی بود و باش گھٹی کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے اور ذہن و دماغ میں بھی ان ہی لوگوں کی ہمت و حوصلہ موجود ہے۔

تحقیق: یہ حقیقت ہے ہر آدمی ابتداء میں ایسا ہی پیدا ہوا ہے، اسکا یہ تواضع ہی ہے کہ اپنی حقیقت پیش نظر ہے۔ میں بھی تو پہلے ایسا ہی تھا کسی کی برکت پہنچی ہے حال: یہ تو صرف حضرت کے طفیل اور حضرت والا کی توجہ خاص کی بدولت الفت، بار، پہچاننے لگا اور اب کچھ انسانی زندگی بسر کرنے کا خاکہ ذہن میں آ گیا ہے تحقیق: الحمد للہ اسی دریافت کرنا چاہتا تھا، الحمد للہ کہ زندگی بسر کرنے کا خاکہ ذہن میں آ گیا ہے، ذہن خالی نہیں ہے جس نے اتنا دیا ہے اور دے سکتا ہے۔

حال: کہ اس طرح انسان کو ایک انسان کے ساتھ باہم رہنا سہنا چاہیے۔ تحقیق: اخلاق کا اعلیٰ درجہ یہی ہے، یعنی انسانیت۔

حال: اور نچوڑتہ نماز کی ادائیگی کا خیال کہ وقت مقرر پر اور اچھی طرح ادا کرنا چاہیے۔ تحقیق: اس سے زیادہ (یعنی بڑھکر) دین میں کوئی چیز نہیں (کہ کوئی شخص نماز وقت پر پڑھو اور اچھی طرح پڑھو) حال: ہم جیسے جاہل اور نااہل کے لئے حضرت والا کی توجہ کی برکت سے اسی پر زندگی گزر جائے۔ کافی ہے اور بہت بڑی کامیابی ہے۔

تحقیق: بیشک کافی ہے۔ بیشک کامیابی ہے۔

حال: حضرت والا دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ والسلام تحقیق: دل سے مزید توفیق کی دعا کرتا ہوں۔ آمین۔

دیکھا آپ نے مصلح الامۃ کے یہاں کا معاملہ؛ طالبین کی کس کس طرح تربیت اور نگہداشت فرمائی جاتی تھی اور عقیدت و مناسبت جو کہ طسریق کی رُوح اور طریقت کا جوہر ہیں انکا کیسا جائزہ لیا جاتا تھا اور اپنی خداداد بصیرت سے طالب کی گفتگو اور اسکے عرض و معروض سے ہی اسکا حال معلوم فرمایتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جس طرح سے کہ لوگ ہانڈی کا سالم ہونا یا اسکا ٹوٹا ہونا اسکی آواز سے معلوم کر لیتے ہیں اسی طرح سے ہملوگ بھی سالک کی گفتگو اور اسکی تحریر سے اسکے قلبی احوال کا کچھ اندازہ کر لیتے ہیں، شاید اسی مضمون کو عارف سعدیؒ نے اس شعر میں بیان فرمایا تھا کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و هنرش نہفتہ باشد

انسان جب تک زبان نہیں کھولتا اسکے عیب و هنر مخفی رہتے ہیں بولنے سے اس کا اندازہ لگ جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہوتا ہے یہ حکم فنی ہی اور شیخ سے اس باب میں خطا بھی ہو سکتی ہے لیکن غیب کا علم چونکہ انسان کو ہوتا نہیں اسلئے انسان بس ظن غالب ہی کا مکلف ہے، یوں چونکہ ایک شیخ کامل کا تمام تر معاملہ شرفی اللہ ہوتا ہے اور وہ کسی بات کا حکم لگانے سے پہلے باطنی طور پر حق تعالیٰ کی طرف رجوع بھی کر لیتا ہے اسلئے عموم احوال میں اللہ تعالیٰ اسکو لغزش سے بچا ہی لیتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہاں بھی سالک موصوف سے یہی سوال ہوا ہو گا چونکہ مکتب و مصلیٰ الہی کے تربیت یافتہ تھے کیا عمدہ تواضع میں ڈوبا ہوا جواب دیا اور یہ قاعدہ ہی ہے کہ من تواضع ربت رفعة اللہ یعنی جو تواضع اور پستی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو بلند فرماتے ہیں حضرت علامہ کے قلب پر اسکا اثر ہوا اور حضرت کو انکی بے مائیگی اور بے چارگی پر رحم آگیا فوراً تسلی فرمائی کہ یہ فلو سب ہی کو پیش آتا ہے میں بھی پہلے ایسا ہی تھا پھر کسی کی برکت پہنچی اسی طرح سے تم بھی غاظر جمع رکھو تم نے جو یہ تواضع اختیار کی ہے تو یہ بھی انشاء اللہ ایک دن اپنا رنگ لائیگی اور تم پر بھی کسی کی نظریفیض اثر ہو جائے گی اور انشاء اللہ تم بھی کامیاب ہو گے سبحان اللہ کس قدر ڈھارس اور بشارت کے کلمات ارشاد فرمائے۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے یعنی شیخ کا انداز تربیت ملاحظہ ہو کہ ابتداء میں سوال تو ایسا سخت کیا کہ طالب دل ہی جا

اور گہرا ہی جائے لیکن آخر کلام میں کیسا تلطف اور کیسی شفقت بھردی کہ ایک محب ذبح
ہی ہو جائے۔ اسی بات کو حضرت خواجہ صاحب نے اپنے شیخ حضرت حکیم الامتؒ کے
متعلق یوں فرمایا تھا کہ ۵

مرزا آتا ہے انکو چھیڑنے میں اپنے عاشق کے کبھی مغموم کرتے ہیں کبھی مسرور کرتے ہیں
اسی کو احقر نے عرض کیا تھا کہ اندر میں رہی تراش و می تراش کا منظر یا حضرت
حکیم الامتؒ کے یہاں دیکھنے میں آتا تھا یا پھر حضرت صلح الامتہ نور اللہ مرقدہ کے یہاں بکھاتا تھا
خود فرماتے تھے کہ مشائخ طریق نے لکھا ہے کہ جس مرید کا حال اچھا دیکھئے اور اپنے کام میں جسکو چاق و چوبند
پائے تو اس پر مزید مشقت لازم کرے تاکہ وہ بکھو ہو کر راہ مولیٰ اور طلب مطلوب میں لگے کیونکہ یہ طریقی ہی نیکی اور
عزیمت و مشقت کا ہے اگر سالک نے خصمت کا راستہ اختیار کیا تو ہو سکتا ہے کہ حصول مطلب سے رہ جائے چنانچہ ہمارے
حضرتؒ کا بھی اسی عمل تھا مرید کی سستی اور بے عملی جو اسکی جانب سے اپنے گھریا وطن میں جو ہیں آتی رہی ہو
جسکا ذکر اس نے کبھی اپنی مکاتبت میں کر دیا ہو تو ملاقات ہوتے ہی سب سے پہلے اسی پر اس سے جواب طلب
ہو جاتا تھا کہ جب کچھ کام نہیں کرنا ہے تو کیا دوڑ دوڑ کر میرے پاس آتے ہو۔ چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا
طالب کو اپنی یہ بد حالی یا دہلی نہ رہ جاتی اور وہ شش و پنج میں پڑ جاتا کہ مجھ سے کونسی ایسی غلطی ہو گئی
جس پر یہ جواب طلب کیا گیا ہے۔ غرض یہ تو باز پرس کا اول مقام ہوتا، پھر اثنائے قیام میں کبھی کبھی اسی نوع
کے امتحانات ہوتے کہ میں نے آج مجلس میں کیا بیان کیا ہے لکھ کر لایا ہے یہ دوسرا مقام ہوتا تھا اور تیسرا
اور آخری مقام وہ ہوتا جب وہ ایک دن قبل اپسی کی اجازت اور مکان جانے کا خیال ظاہر کرتا اسوقت بھی
اسکے مناسب حال جو امور ہوتے دریافت فرماتے تب بھٹی پٹی تھی اور اجازت ہوتی تھی۔ اسی لئے (جو نہ ایک
مرید پر اتنی اور ایسی محنت صرف فرماتے تھے) کبھی کبھی ہم لوگوں کو کام پر لگانے کیلئے فرمایا کرتے تھے کہ اب سن ماہ میں
دھڑے میں مشائخ ہر کس کو ایسی غرض دل سوزی اور دماغ سوزی کی پڑی ہے کہ وہ ایک ایک مرید پر
اتنا وقت صرف کرے، اور آہ یہ بھی فرماتے تھے کہ تم لوگ میری ان تنبیہات کا بُرا مانستے ہو قدر نہیں
کرتے افسوس مجھے کوئی اسطرح سے کہنے والا نہیں ملا تھا نہیں تو ہم کچھ ٹھیک ہی ہو جاتے اور تم لوگوں سے
آج اسطرح حجامت نہ ہواتے۔ حضرتؒ کی قلبی شفقت طالب سے دلی لگاؤ اور ہم جیسے نالائقوں پر غم کھانا
ان الفاظ میں نمایاں ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کو انکی ان محنتوں پر اجر عظیم عطا فرماوے۔ آمین

حضرت اقدس کے خصوصی معاملات بھی اپنے مسترشدین کے ساتھ آپ نے ملاحظہ فرمائے نیز طالبین کے امتحانات بھی دیکھے اور مخصوصینِ محبین کے ساتھ عنایات بھی دیکھیں اب اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ حضرت والا کا ایک ہدایت نامہ جو اصلاح عامہ سے متعلق تھا اسکو بھی پیش نظر کر دوں ہے تو وہ حضرت والا کے زمانہ قیام بمبئی کے آخر آخر کا تاہم کہیں پر کچھ دینی کام کر لینے کے بعد حضرت والا لوگوں کی جو بات فرماتے رہتے تھے اسکا کچھ خاکہ و نقشہ اسکی وجہ سے ضرور ناظرین کی آنکھوں میں پھر جائے گا۔ اور عالم تصور میں بہت سے محبین کی نظروں میں حضرت والا کا سراپا سامنے ہو گا۔

صورت حال یہ ہوئی تھی کہ شہر بمبئی چونکہ بڑا شہر ہے اور حضرت کا قیام کر لایا تھا یہاں سے اصل بمبئی کا تقریباً دس میل کا فاصلہ تھا آنے والے لوگ بیان کرتے تھے کہ کبھی کبھی تو شرکتِ مجلس والا کے لئے چار چار گھنٹے نکالنے پڑتے ہیں اس طرح پر کہ گھنٹہ گھنٹہ بھر بس کے انتظار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے پھر بیس چالیس منٹ کا راستہ اور پھر اسی طرح سے واپسی کا حال اسلئے لوگوں نے اپنی سہولت کے لئے یہ خواہش ظاہر کی ہفتہ بھر دو دن خاص بمبئی میں کسی جگہ مجلس ہو جایا کرے تو ان لوگوں کو آسانی ہو، حضرت والا نے اسکو منظور فرمایا اور تین چار ہفتے گئے اسکے بعد ایک مرتبہ راقم کے ذریعہ ایک پیغام کہلا بھیجا اور خود تشریف نہیں لے گئے اس پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ فرمایا کہ — میں بہت دنوں سے آپ کے شہر میں ہوں اور یہاں کبھی کسی بار آچکا ہوں اسلئے آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ ہر ہفتہ آنا جانا کچھ سود مند کبھی ہو رہا ہے یا صرف آنا ہی جانا ہو کر ختم ہو جاتا ہے لہذا معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے کیا نفع ہوا اگر اب تک بلا فائدہ ہی یہ آنا جانا رہا تو اب سے یہ زائد کام نہیں کرنا چاہتا اسکے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں — اسکے جواب میں لوگوں نے اطمینان دلایا اور نفع کا اظہار کیا اور اپنے اپنے تاثرات لکھے جسکی مفصل کیفیت تو قیام بمبئی کے عنوان میں انشاء اللہ تعالیٰ آئینگی اسوقت اسی معاملہ کا ایک حصہ پیش کرنا چاہتا ہوں، ربط کے لئے اتنی تمہید عرض کر دی اب حضرت والا کا ارشاد ملاحظہ ہو :-

(عمومی ہدایت برائے اہل کمبئی)

فرمایا کہ میں نے گزشتہ ہفتہ جو پیغام بھیجا تھا اس سلسلہ میں وہاں لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فلاں فلاں (چند معزز حضرات کا نام لیا کہ یہ) لوگ میرے پاس آکر (پیغام کے جواب کے سلسلے میں) زبانی بھی کچھ فرمائیں اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسکی کیا ضرورت تھی؟ حضرت مولانا جب کسی سے خفا ہوتے اور وہ خوشامد کرتا تو فرماتے تھے کہ کیا میں خوشامد کا منتظر تھا؟ اسکو بہت نا پسند فرماتے تھے۔ بزرگوں کے یہاں اور اصلاح کے معاملہ میں خوشامد کیسی؟ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خوشامد سے ان حضرات کو راضی کر لیا تو یہ ان سے پوری بد اعتقادی ہے کہ اپنے شیخ کو خوشامدی سمجھتا ہے اسلئے آپ سے کہتا ہوں کہ اسکی کیا ضرورت ہے اور دین کے معاملہ میں یہ سب کیا بہر مقصد تو اس پیغام اور سوال سے یہ تھا کہ آپ سب لوگوں کو عمل کی ترغیب دوں اور کام کرنے پر آمادہ کروں اسلئے کہ عمل کا وجود تو عمل کرنے ہی سے ہوگا اور یہ ہر شخص کا ذاتی فعل ہے۔ اسلئے تو قوی نمائندگی کافی نہیں ہے یعنی بالفرض اگر شہر کے چند معزز حضرات نے مجھ سے آکر کچھ کہہ بھی دیا تو اس سے کیا ہوا؟ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوگا کہ ان حضرات کو بے اعتنائی نہیں ہے بلکہ میری جانب اور میرے کام کی جانب اعتنا رہے، لیکن اور دوسرے لوگ بھی عمل پر لگ گئے ہیں یا نئے کار ارادہ رکھتے ہیں تو محض ان حضرات کا تشریف لانا اس کا توازن نہیں ہو سکتا۔ اور میرا مقصد اس پیغام سے یہی تھا کہ عام لوگوں کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ لگاؤں۔

باقی یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے میری باتوں کا اثر لیا ہے اور وہ لوگ میرے کام کی قدر کرتے ہیں، مجھ سے کچھ سیکھنا اور حاصل کرنا چاہتے ہیں انکی طلب کا اندازہ ان کے طرز عمل سے ہو رہا ہے اور ایسے لوگوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ اور یہ سب اسلئے کرتا ہوں کہ جانتا ہوں کہ احکام شرعیہ پر لوگوں کو لگانا اور مسلمانوں کو دین پہنچانا اس زمانہ میں آسان نہیں ہے اسلئے پہلے ان میں طلب اور دین کا شوق پیدا کرنا ہوتا ہے، اور

یہ مشکل چیز ہے آپ کو کیا معلوم بزرگوں کو اس معاملہ میں کتنی مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور کس قدر یہ حضرات فکر مند رہتے ہیں۔

ایک بزرگ نے آخر وقت میں کہا کہ اب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وقت ہے اب امت محمدیہ علی صاحبہا السلام والتحیۃ کی باگ ہم فلاں کے ہاتھ میں نہیں دیں گے تو دیکھئے کہ جو امانت انکو بزرگوں سے ملی تھی اسکی نگرہ تھی کہ نااہل کو کیسے حوالہ کر دیں خدا تعالیٰ سوال فرمائیں گے تو کیا جواب دیں گے اور اہل کوئی نظر آتا نہیں پس کس طرح اس دین کی گاڑی کو آگے بڑھایا جائے۔ اب کام کے لوگوں کا پیدا کرنا کتنی مشکل چیز ہے؛ وعظ کھدینا آسان ہے اور کسی کو پا کر اسکے بدن پر گرنا (یعنی کسی سے صرف بدنی اور ظاہری قرب حاصل کرنا) یہ بھی بہت زیادہ آسان ہے اس میں لگتا ہی کیا ہے ابھی چلود کھلا دیں کہ مصافحہ کے لئے کتنے لوگ گرے پڑتے ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ کو بہت ہی مانتے ہیں لیکن اگر کوئی عملی اور کام کی بات کھدوں تو سب بھاگ نکلیں گے، الا ماشاء اللہ میں کہتا ہوں کہ یہ کیا؟ ایک جانب تو اتنا اعتقاد اور ایک طرف ایسی بدعقیدگی! یہی آج زمانہ کا حال ہے۔

تو لوگوں کا یہ حال چونکہ جانتا ہوں اس لئے پوچھ لیا تھا کہ آپ لوگوں کا بھی آنا جانا آخر کس میں ہے؟ اس میں علماء اور امرار ہی سے خطاب نہیں تھا بلکہ سب لوگ اسکے مخاطب تھے اہل اللہ ظاہر سے راضی نہیں ہوں گے ان کے یہاں خلوص، صدق اور طلب ان امور کو پیش کرو۔

اور کام کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آؤ۔ اپنے گھر میں دین پھیلاؤ۔ اپنے بچوں کو دین سکھلاؤ اس طرح سے کہ انکا نشوونما دینی ماحول میں ہو، وہ لوگ اپنے کو مسلمان بنائیں اسی پر زندہ رہیں اور اسی پر مریں۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح امتی بنیں۔ یہ سب کام کرنے کے ہیں۔

اسی کو کہنا چاہتا تھا کہ دین کے جاننے کی ضرورت ہے۔ حلال و حرام کے جاننے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو پیشی ہونے والی ہے اسکے جاننے اور پیش نظر

رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب دنیا میں پیدا ہو گئے ہو تو اب تو حسن عمل کا مطالبہ ہو گا ہی اور برے اعمال پر مواخذہ بھی ہو گا۔

مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ لوگوں میں سے سب سے اچھا کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جسکی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں۔ پھر انھوں نے دریافت کیا کہ سب سے بُرا کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جس کی عمر زیادہ ہو اور عمل بُرے ہوں۔

پہلے زمانہ میں جوان لوگ بوڑھوں کا بہت زیادہ ادب اور احترام کرتے تھے اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آتے تھے اس خیال سے کہ انکی عمر زیادہ ہے تو عمل صالح بھی ان کے زیادہ ہونگے۔ اسی طرح سے بوڑھے بھی جوانوں کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ تم لوگ ہم سے اچھے ہو اسلئے کہ تمھاری عمر کم ہے تمھارے گناہ بھی ہم سے کم ہیں۔

سبحان اللہ! عمل صالح پر ابھارنے والا اس سے بڑھکر اور کون سا مضمون ہو سکتا ہے یہی سب باتیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں اور سمجھانا چاہتا ہوں۔ اور میں کیا سمجھا سکتا ہوں قلب میں کسی بات کو اتارنا یہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے ایک مولانا صاحب جو کہ اچھے آدمی تھے صاحب دل بھی تھے ایک جگہ گئے مسجد کو دیکھا کہ بالکل ویران لوگوں نے کہا کہ حضرت یہاں فلاں شخص با اثر آدمی ہے اگر یہ نماز پڑھنے لگے تو سب لوگ پڑھنے لگیں گے۔ مولوی صاحب نے اس سے کہا اس نے جواب دیا کہ نماز تو پڑھ سکتا ہوں لیکن وضو کرنا میرے لئے ایک مشکل امر ہے۔ مولانا نے فرمایا اچھی بات ہے آپ بلا وضو ہی کے نماز پڑھ لیا کیجئے۔ چنانچہ مسجد گئے اور نماز کے لئے کھڑے ہوئے مولانا نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ آپ کے دربار میں میں نے اس کو لا کھڑا کر دیا ہے بس اتنا ہی میرے بس میں تھا اب اس کے قلب کو دین کی طرف پھیرنا یہ آپ کے اختیار میں ہے آپ اس کے قلب کو پھیر دیجئے چنانچہ اس کے بعد سے وہ با وضو نماز پڑھنے لگا۔

بہر حال دین حق پہونچانے والے اللہ کے کچھ بندے ہر زمانہ میں رہیں گے۔

تھوڑے ہوں گے لوگوں میں اجنبی اور غیر معروف ہوں گے مگر ہوں گے ضرور اور ایسے لوگوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری دی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ بدعتی الاسلام غریباً وسیعود غریباً کما بدعتی فطوبی للغریاء من امتی قبل یا رسول اللہ ومن الغریاء من امتک قال الذین یصلحون ما افسد الناس من بعدی من سنتی۔ یعنی اسلام کی ابتداء غربت میں ہوئی ہے یعنی وہ لوگوں کے نزدیک اجنبی اور غیر مانوس تھا پھر ابتداء ہی کی مانند آخر میں بھی غریب ہو جائے گا پس امت کے جو غریب ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ آپ کی امت کے غریب لوگ کون ہیں؟ فرمایا کہ وہ لوگ غریب ہیں جو میری ان سنتوں (طریقوں) کی اصلاح کر دیں جنہیں لوگوں نے میرے بعد فاسد کر دیا ہے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ آئیے کچھ کام کیا جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان بشارات سے کچھ حصہ حاصل کیا جائے۔ مومن جتنی بھی ترقی کرتا ہے وہ اپنے عمل صالح کی بنا پر کرتا ہے، اصل چیز ایمان ہے پھر عمل صالح سے اس میں اور ترقی ہوتی رہتی ہے عملوا الصلحت کی ترقی کو آپ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ایک صاحب نے کل ہی کہا کہ کعبہ کے پاس بیٹھا رو رہا تھا کہ بس ایسا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ معاً کر دیا جو ترقی عمل کے ذریعہ ہوتی ہے وہ عمل ختم ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور ایمان کے ذریعہ سے جو ترقی ہوتی ہے تو مرنے کے بعد بھی چونکہ ایمان باقی رہتا ہے اس لئے وہ بھی باقی رہتی ہے۔

اسی بات کو سمجھانا چاہتا تھا، جو کچھ پیغام کہلا بھیجا تھا۔ آپ لوگوں نے سمجھا کہ ہم خوشامد چاہتے ہیں۔ خوشامد تو ہم آپ کی کر لیں، یہ سب کیا آئیے مل جل کر کچھ کام کیا جائے۔ دین کے کام کے لئے دنیا مانع تھوڑا ہی ہے اسکو معین بنانا چاہیئے۔ انہی میں نے پہلے آپکو حدیث سنائی تھی کہ لا بائس بالغنی لمن اتقى الله عز وجل والصحة لمن اتقى خیر من الغنی وطیب النفس من النعیم اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کا ذکر فرمایا ہے ایک تو غنی کا دوسرے صحت کا تیسرے طیب نفس کا

یعنی یہ فرمایا کہ متقی شخص کے لئے رغبت اور مالداری میں کچھ مضائقہ نہیں ہے اور متقی آدمی کو اگر صحت کی دولت مل جائے تو یہ اس سے بھی بڑھکر اور طیب نفس یعنی طبعی سبب کا خوش رہنا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے اور حضرت سفیان ثوری کا قول بھی سنایا تھا کہ مال کا ہونا پہلے زمانہ میں مکروہ سمجھا جاتا تھا بہر حال اس زمانہ میں تو وہ مومن کی ڈھال ہے۔ اور یہ فرمایا کہ اگر ہمارے پاس یہ دنیا نہ ہوتے تو امر اور مصلحتیں تو ہم کو صافی بنا لیتے۔ اور یہ فرمایا کہ جس کے پاس کچھ مال ہو وہ اسکو تجارت وغیرہ کر کے بڑھا اسلئے کہ یہ ایسا زمانہ ہے کہ اگر آدمی حاجت مند ہو تو سب سے پہلے اپنے دین ہی پر ہاتھ صاف کرے گا۔ اور یہ فرمایا کہ حلال آمدنی اسراف کی متحمل نہیں ہوا کرتی۔

آج دنیا جو ہمارے پاس نہیں ہے تو اسلئے کہ اخلاق ہمارے پاس نہیں ہے جب اخلاق آدمی میں ہوتا ہے تو دنیا بھی آتی ہے۔ اور دین ہو یا دنیا ان دونوں کی درستگی عقل پر موقوف ہے جب قدر عقل زیادہ ہوگی اسی قدر آدمی دین کو بھی سمجھے گا اور دنیا کو بھی سمجھے گا۔ دنیا کو بھی پہچانے گا اور آخرت کو بھی پہچانے گا، خدا کو بھی پہچانے گا۔ رسول کو بھی پہچانے گا۔ اور دنیا کے زہر کو جو چیز مارنے والی ہے وہ فکر آخرت ہی ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ فکر الآخرة اذا استولى على قلب المومن لا يترك شيئاً من الدنيا۔ یعنی فکر آخرت جب قلب مومن پر مسلط ہو جاتی ہے تو پھر دنیا کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔

غرض یہی ایمان، عمل صالح اور فکر آخرت کو قلب میں پیدا کرنے کے لئے کچھ کہتا سنتا رہتا ہوں اور اسی کا جائزہ لیتا رہتا ہوں کہ کچھ فکر پیدا ہوئی یا نہیں؟ اور اس میں شک نہیں کہ یہ چیزیں ملتی ہیں اہل اللہ ہی سے، جب تک کسی اہل اللہ کو نہیں پاؤ گے ایمان نہیں پاؤ گے۔ اور اہل اللہ کا پانا بھی مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت بیٹھے ہوئے تھے ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہملوگ اللہ تعالیٰ کو تو کیا پہچان سکتے ہیں آپ کا بھی پہچانا آسان نہیں ہے حضرت ان کے اس کہنے سے بہت خوش ہوئے اور ہم لوگ بھی ان کے بہت ممنون

ہونے کہ ایسی بات کہدی کہ حضرت کو خوش کر دیا۔ سبحان اللہ!
 بس یہی کہتا ہے کہ ایمان درست کرو اور اس کے لئے کسی مومن کو تلاش کرو
 بدون مومن کامل کی صحبت کے ایمان کامل بھی نہیں پاؤ گے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان جواہر پاروں کو مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر
 صدق دل کے ساتھ اس مضمون کا بار بار مطالعہ کرے تو انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ سے
 اسکو تعلق ضرور پیدا ہو جائیگا۔ ابتداءً بظاہر تو عتاب نامہ تھا مگر انتہا کس قدر شفقت و
 محبت اور قلبی درد کا مظہر ثابت ہوا اہل بلبلی تو سمجھے کہ حضرت والا ان سے ناراض ہو گئے
 ہیں لگے خوشامد کرنے اور وہاں حالات کا جائزہ مقصود رکھا اور اصل کار پر لگانا منظور رکھا۔
 اور نہ صرف اپنے سے بلکہ دین سے، دیانت سے، رسولؐ سے اور خدا تعالیٰ سے قریب کرنا
 چاہتے تھے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ کا کہا ہوا شعر یہاں پر بھی کس قدر چسپاں ہے فرماتے
 ہیں کہ

عجب سرکار ہے ان کی ستم ہی میں کرم دیکھا
 وہی مقبول ہوتا ہے جسے وہ دور کرتے ہیں

گزشتہ صفحات میں حضرت والا کا طریقہ اصلاح و تربیت اور نگرانی و نوازش
مسترشدین وغیرہ سے متعلق گفتگو کی جا رہی تھی آخر میں کبھی میں فرمائی ہوئی ایک ہدایت کا بھی
ذکر آگیا حالانکہ زمانہ کے لحاظ سے وہ بالکل آخر آخر کی بات تھی اور ہم زمانہ ابھی فہمور ہی کے حالات
بیان کر رہے تھے۔ بہر حال ناظرین نے ان مجموعی حالات سے حضرت کی تعلیم و تربیت کا
کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور لگایا ہوگا۔ راقم کا مقصد بھی اس سیرت نگاری سے یہی ہے
کہ حضرت مرشدی مصلح الامۃ کا سراپا حضرت کو نہ دیکھنے والوں کی نظروں میں پھر جائے پھر جسکی
نظر میں اللہ تعالیٰ کی طلب کا یہ راستہ اور اسکا سلوک مستحسن معلوم ہو وہ اس سے مستفید
ہو سکے۔ اور اپنے خیال سے بھی نیز حضرت کی تصویب و تائید کی رو سے بھی بات یہی
سمجھ میں آتی ہے کہ مرید رشید کا حق ہے کہ اس نے جس شیر میں گھاٹ سے سیرابی
حاصل کی ہے اسکا پتہ دوسروں کو بھی بتا دے جسکی شکل یہی ہے کہ اپنے کردار و گفتار
میں شیخ کا نمونہ بنے اور اپنی مجالس و محافل میں محاسن و فضائل شیخ کے ساتھ ساتھ
انادات و تعلیمات مرشد کا بھی ذکر ضرور کیا کرے کہ اب شیخ کے بعد فیض شیخ کے باقی
رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔

راقم نے اپنی سہولت کیلئے حضرت اقدس کے حالات کو مختلف ادوار میں تقسیم
کر دیا ہے، طفولیت و تعلیم اور قیام دیوبند و تھانہ کھن کے بعد بعض دیگر مقامات پر
عارضی قیام کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اسکے بعد اپنے وطن فہمور (تال زجا اعظم گڑھ) میں
مسند ارشاد پر آپ رونق افروز ہو کر اپنے مخصوص طریق کار پر جو کہ اپنے شیخ حکیم الامتہ حضرت
مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کے طرز سے ماخوذ تھا آپ نے کام کرنا شروع فرما دیا۔ اسی دور کے
حالات اصالتہ ذکر ہو رہے تھے اور اگر کہیں کسی دوسرے مقام کی کوئی بات آگئی ہو تو وہ
ضمنی تھی۔

چنانچہ آپ کا یہی وہ دور زریں تھا جس میں اکابر ہند کے دو عالم کی پہلی
ملاقات حضرت اقدس سے ہوئی انہیں سے ایک عالم حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی
اور دوسرے عالم حضرت مولانا ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہ العالی تھے

نعمانی الذکر عالم کے بہت سے حالات تو ابتداء ہی میں ناظرین کی نظر سے گزر چکے ہیں تاہم حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی مدظلہ العالی نے خود بھی اپنے قلم سے حضرت مصلح الامۃ کے ساتھ کچھ پیش آئے ہوئے اپنے واقعات اپنی ایک مشہور تالیف ”پرانے چراغ“ میں درج فرمادیے ہیں، لیکن اول الذکر عالم کے حالات میرے علم میں نہ تھے اور نہ کوئی خط و کتابت ہی مجھے مل سکی اس لئے حالات میں یہ خانہ خالی تھا جس کا پُر کرنے کا مجھے برابر ہی خیال لگا رہا، چنانچہ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے بھی اپنے مشہور رسالہ ”الفرقان“ مجریہ اگست ۱۹۷۷ء میں ”تحدیثِ نعمت“ کے عنوان میں حضرت مصلح الامۃ کا خاص ذکر فرمایا ہے، جن میں بعض حالات اسی دور قیام و وطن کے ہیں۔ اسلئے راقم نے مناسب جانا کہ اپنے ان دونوں بزرگوں کی تحریروں سے رسالہ وصیۃ العرفان کو بھی مزین کر دے تاکہ حضرت اقدس قدس سرہ کا تذکرہ جہاں تک ہو سکے بکجا ہو جائے۔ خدا معلوم کسے مطالعہ ”تحدیثِ نعمت“ کی توفیق ہو اور کسے نہ ہو، اور پرانے چراغ“ ہو سکتا ہے کہ کسی کو نہ مل سکے تو ایسے حضرات کے لئے انشائاً اللہ یہ رسالہ ذریعہ عرفان ہو جائے گا۔

اب ہم پہلے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی کا تذکرہ ”تحدیثِ نعمت“ سے نقل کرتے ہیں اسکے بعد پرانے چراغ“ سے حضرت مولانا ندوی مدظلہ العالی کا بیان پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے نفع بخشے۔ آمین۔

(”تحدیثِ نعمت“)

از (مولانا) محمد منظور نعمانی (مدظلہ)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمۃ

حکیم الامۃ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت و محبت اور اس عاجز و عاصی پر حضرت

مدوح کی عنایت شفقت بھی اللہ تعالیٰ کی خاص قابل شکر اور لائق ذکر نعمتوں میں سے ہے۔ حضرت مدوح کا اصل وطن ضلع اعظم گڑھ (یو پی) کے مشہور قصبہ کوپا گنج کے قریب ایک گاؤں "نچپورتال زجا" تھا۔ حضرت کا تذکرہ تو بارہا بہت پہلے سنا تھا لیکن زیارت کا اتفاق پہلی دفعہ اب سے تقریباً ۲۰، ۲۲ سال پہلے شکستہ یا شکستہ میں ہوا تھا۔ مہینہ غالباً جون کا تھا راقم السطور کا قیام اس زمانہ میں ملی میں تھا اور تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت اس دور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ زیادہ نصیب ہوئی تھی (جس میں پہلے تو ضعف ہمت اور بعض مصروفیات کی وجہ سے کمی آئی اور اب سفر سے معذور ہو جانے کی وجہ سے بالکل ہی محرومی ہو گئی جبکہ یہ عاجز اپنا بڑا خسارہ سمجھتا ہے بہر حال اسی دور میں) ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ مشرقی یو پی کے چند اضلاع اعظم گڑھ گورکھپور وغیرہ کے دورہ کا پروگرام بنا۔ اس جماعت میں ہمارے نہایت محترم بزرگ دوست صوفی سید عبدالرب صاحب (ایم۔ اے) مرحوم بھی تھے اور ان کے خاص دوست اور رفیق مولانا سراج الحق صاحب پھلی شہری بی۔ اے بھی (جو ابھی کچھلے مہینے انتقال فرما کر انھیں کے ساتھ جا ملے) رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً) اور ان کے ایک دوسرے خاص رفیق ماسٹر محمد ابراہیم صاحب آبادی (ایم۔ اے) بھی ساتھ تھے، یہ تینوں حضرات ہم مشرب و ہم مذاق تھے انگریزی تعلیم کا بول اسکولوں یا کالجوں کے اساتذہ تھے تینوں کو حکیم الامتہ حضرت مرشد تھانوی سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور تینوں کو تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا ہمارے یہ جماعت ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ موپوچی وہاں غالباً تین دن قیام کا پروگرام تھا یہ تینوں حضرات حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے اچھی طرح واقف بلکہ ان کے نیاز مندوں میں تھے۔ میں صرف غائبانہ عقیدت رکھتا تھا ان تینوں حضرات نے کہا کہ مو کے اس قیام ہی کے دوران میں ہم کسی وقت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لئے نچپورتال زجا جانا چاہتے ہیں میں نے بھی ان حضرات کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جماعت کے امیر ہمارے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی تھے ان سے

اجازت لیکر فتحپور جانے کا پروگرام بنالیا گیا۔ ہم چاروں میں سے کوئی بھی اس سے پہلے فتحپور نہیں گیا تھا۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں سے کوپانگنچ کے لئے یکے جاتے ہیں وہاں سے فتحپور میل جانا ہوگا ہم لوگ شام کو بعد مغرب روانہ ہو سکے اور پروگرام یہ بنایا کہ رات کو کوپانگنچ کسی مسجد میں قیام کریں اور علی الصبح وہاں سے فتحپور کیلئے روانہ ہو جائیں۔ ہم لوگ رات کو کچھ دیر سے کوپانگنچ پہنچ سکے کسی سے کھانے کی دوکان کے بارہ میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایسی کوئی دوکان یہاں نہیں ہے (یا یہ کہ اب بند ہو چکی ہے) جن صاحب سے ہم نے دوکان کے بارہ میں دریافت کیا تھا انکو ہم نے انکے دریافت کرنے پر یہ بتلادیا تھا کہ ہم لوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ سو آئے تھے اسوقت فتحپور جانے کے لئے سو سے آئے ہیں رات کو یہیں کسی مسجد میں قیام کریں گے اور صبح انشاء اللہ فتحپور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لئے جائیں گے۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کھانا کسی دوکان سے نہیں مل سکے کام لوگوں نے طے کیا کہ چنے یا دال موٹ یا مٹھائی جیسی کوئی بھی چیز مل جائے تو اسی سے کام چلایا جائے اتنے میں کچھ صاحبان آئے اور انھوں نے کہا کہ آلوگ کچھ نہ خریدیں ہم کھانا لاتے ہیں ہم لوگوں نے شکریہ اور دعار کے ساتھ مناسب انداز میں ان سے معذرت کر دی کیونکہ ہم اس سفر میں تبلیغی جماعت کے عام اصول کے مطابق کسی پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے بہر حال اسوقت جو کچھ کسی دوکان سے مل گیا وہ لیکر مسجد میں آگئے، پہلے عشاء کی نماز ادا کی پھر کھانے کے ارادے سے بیٹھے ہی تھے کہ ایک حاجی صاحب ایک طشت میں ہم تینوں کیلئے پورا کھانا لیکر مسجد میں تشریف لائے اور کہا کہ میں حضرت مولانا کا خادم ہوں آپ حضرت کے یہاں ہیں اور یہ کھانا گویا حضرت ہی کی طرف سے ہے اسکو آپ قبول فرمائیں، ان کی بات سے یہ اندازہ کر کے کہ اللہ کے مخلص بندے اور حضرت کے تربیت یافتہ ہیں ان کے شکریہ اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ اسکا کھانا ہی سعادت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ سمجھ کر کھایا کھانا بہت اعلیٰ قسم کا تھا جیسا کہ خاص مہانوں کے لئے اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے (یہ بات ظاہر تھی کہ فوری طور پر تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ پہلے سے تیار شدہ تھا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان حاجی

صاحب نے کیوں تیار کر کے رکھا تھا، پھر صبح کو انھوں نے ناشتہ بھی ایسا ہی کرایا اور اپنے ذاتی یکہ سے جو بہت اعلیٰ قسم کا تھا ہم لوگوں کو فنجیور تال نہ جا پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ انکو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے، ۳۰، ۳۲ سال پہلے کی بات ہے افسوس ہجو کا انکا نام اب یاد نہیں رہا۔ (غالباً یہ صاحب حاجی سلیمان عطار مرحوم یا حاجی عبدالرب صاحب رہے ہونگے جہاں)

راقم السطور کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا یہ پہلا موقع تھا حضرت نے بڑی عنایت فرمائی جتنی دیر مجلس میں حاضری رہی اصلاح نفس اور تزکیہ اخلاق ہی حضرت کی گفتگو کا موضوع رہا۔ اس وقت حضرت ممدوح میں ایک خاص اضطرابی اور سیاسی کیفیت محسوس ہوتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ پورے وجود میں کوئی برقی رد و دور رہی ہے۔ ہم لوگ صبح کو پہنچے تھے، اپنے پروگرام کے مطابق شام کو سو واپس آ گئے۔ حضرت کی خدمت میں اس پہلی حاضری اور زیارت کو راقم السطور نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت سمجھا۔

اسکے تین چار سال بعد ۱۹۴۹ء میں فنجیور تال نہ جا ہی میں حضرت کبھی خدمت میں دوسری دفعہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ کچھ ہی پہلے فرقہ وارانہ فسادات کی ایک طوفانی لہر بنگال سے اٹھ چکی تھی اور بہت سے مسلمانوں کے سامنے دشمنی کے بعد پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا نہیں۔ یہ عاجز انھیں دنوں میں کسی ضرورت سے سو گیا تھا وہیں ایک خواب دیکھا جس نے ذہن میں سوچ سوال پیدا کر دیا کہ حضرت مولانا شاہ وحی اللہ صاحب ہندوستان ہی میں مقیم رہیں گے یا پاکستان تشریف لیجائیں گے؟ میں نے ضروری سمجھا کہ فنجیور حاضر ہو کہ حضرت کی زیارت بھی کروں اور اگر موقع ملے تو اس بارہ میں دریافت کروں، چنانچہ حاضری کا پروگرام بنالیا (جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے سو سے کوپا گنج تک یکے چلتے تھے آگے فنجیور کے لئے کسی میل پیدل چلنا ہوتا تھا ایک دن میں ایک یکہ سے روانہ ہو گیا اس یکہ پر چار پانچ آدمی اوڑھلی سوار تھے جو سب کو پا جانے والے تھے۔ راستہ میں میں نے یکہ والے سے کہا کہ مجھے فنجیور تال نہ جا جانا ہے اور آج ہی واپس لوٹنا ہے اگر تم مجھے فنجیور تک پہنچا سکو تو

پہنچا دو کرایہ جو تم کہو گے میں خوشی سے دونگا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا۔ یکہ والے
 نے راستہ کی خرابی کا عذر کیا بالآخر وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ جہاں تک راستہ زیادہ نرا
 نہیں ہے وہ مجھے وہاں تک یکہ سے پہنچا دے گا۔ اسی یکہ پر ایک تعلیم یافتہ
 ہندو نوجوان بھی تھا اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فقیہ کس کے پاس جائیں گے؟ میں نے
 کہا وہاں ہمارے ایک بزرگ ہیں میں ان سے بس ملنے جا رہا ہوں۔ اس نے
 کہا اچھا وہ جو فقیہ کے شاہ صاحب ہیں آپ ان کے درشن کرنے جا رہے ہیں، میں نے
 کہا ہاں میں انہیں کے درشن کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس نوجوان سے پوچھا
 آپ انکو جانتے ہیں؟ اس نے کہا میں نے بس انکا نام سنا ہے، مجھے بھی ان کے
 درشن کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو ان کے درشن کرنے کا
 کیوں شوق ہے؟ اس نے کہا میں کانپور کا رہنے والا ہوں میرے ہاں رنگ کا بیوپار
 ہوتا ہے میں اس کے سلسلہ میں ملک بھر میں گھومتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں
 سے میرا واسطہ پڑتا ہے یہاں کوپا میں بھی ہمارے ایک بیوپاری حاجی صاحب
 ہیں وہ بڑے ایمان دار سچے اور دھرمی آدمی ہیں، ہاتھ میں ایسا آدمی میں نے کہیں
 نہیں دیکھا نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں۔ میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم
 ایسی سچائی اور ایمان داری کہاں سے آگئی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تو کچھ بھی
 اچھائی نہیں ہے میں تو بہت گندہ آدمی ہوں، ہاں یہاں سے قریب ہی فقیہ تال زجا
 ایک گاؤں ہے اس میں ایک بزرگ ہمارے مولانا صاحب ہیں میں ان کے پاس
 آتا جاتا ہوں اگر تمہیں میرے اندر کچھ اچھائی نظر پڑتی ہے تو وہ انکا اثر ہو گا اور بھی کئی
 آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے اسلئے مجھے بھی انکے
 درشن کرنے کا شوق ہے۔ اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش
 سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ میرے ملک کا بگاڑ جب ہی ٹھیک ہو گا جب ملک
 (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

کوپا گنج پہنچ کر یہ نوجوان اور دوسرے لوگ جو یکہ پر سوار تھے سب اتر گئے

مجھے اس یخ والے نے میل دو میل آگے وہاں تک پہنچا دیا جہاں تک راستہ یکہ کیلئے زیادہ خراب نہیں تھا اسکے آگے میں پیدل چل کر فتحپور پہنچ گیا۔

میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میری حاضری سے کچھ ہی پہلے سخت خونریز فسادات کا ایک سلسلہ بنگال سے شروع ہو چکا تھا جس نے مسلمانوں کے سامنے شہداء کے فساد کے بعد پھر یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا انھیں یہاں سے جانا ہی پڑیگا اور ایک خواب کی بنا پر خود حضرت مولانا کے متعلق میرے ذہن میں یہی سوال پیدا ہو گیا تھا، میں ایسے وقت پہنچا کہ حضرت قیلوہ فرما رہے تھے — جب حضرت ظہر کی نماز کے لئے باہر تشریف لائے تو ملاقات ہوئی — اسی وقت فرمایا مجھے تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے — ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت نے وہ گفتگو فرمائی اس وقت کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا حضرت نے مجھے ملکی حالات اور حکومتی معاملات کے بارہ میں باخبر اور صاحب رائے سمجھتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا اندازہ ہے جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہے کیا وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان فسادات اور لوٹ مار سے تنگ آکر مسلمان یہاں سے چلے جائیں یا یہ جو کچھ ہو رہا ہے انکی فشار کے خلاف ہو رہا ہے اور وہ قابو نہیں پاسک رہے ہیں — میں نے اس بارے میں تفصیل سے اپنا خیال عرض کیا جسکا حاصل یہ تھا کہ حکومت کے جو اصل ذمہ دار ہیں یعنی پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے خاص رفقاء کا رویہ تو یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کی زیادتیاں ہوں لیکن پچھلے سالوں میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان جس طرح کی کشمکش رہی اس نے اور پھر تقسیم کے فیصلہ اور پاکستان کے قیام نے عام ہندو ذہن کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا ہے ان کا خیال ہے کہ بٹوارہ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی حق نہیں رہا۔ خود کانگرس والوں میں بھی اس مسلم دشمنی کے رجحان کا اچھا خاصا غلبہ ہو گیا ہے اسلئے ان فسادات کو روکنے کے لئے جس قسم کی سختی کی ضرورت ہے حکومت کے ذمہ دار اسکی جرات نہیں کرتے۔

پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خود حضرت کا ارادہ ان حالات میں ہندوستان میں قیام کا ہے یا یہاں سے تشریف لیجانے کا؟ حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کے

بعض اجاب بہت دنوں سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں وہاں منتقل ہو جاؤں لیکن میرا ارادہ یہیں رہنے کا ہے اور میں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔

تنہائی کی یہ گفتگو غالباً آدھ گھنٹے سے بھی کم میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد حضرت کی عام مجلس شروع ہو گئی جس کا انداز حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کی ظہر بعد کی مجلس ارشاد سے بہت ملتا جلتا تھا۔ مجلس میں بعض طالبین اصلاح کے خطوط پڑھے گئے جن میں انھوں نے اپنے احوال کچھ تھے اور ہدایت و رہنمائی چاہی تھی اور حضرت کی طرف سے ان کے جوابات دیکھے گئے تھے وہ بھی پڑھے گئے۔ اس دوسری حاضری سے قلب میں حضرت کی عظمت میں اور اضافہ ہوا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ حاضری ۱۳۹۹ء میں ہوئی تھی اسکے کافی عرصہ بعد تک حضرت کا قیام اپنے اصلی اور آبائی وطن فتحپور ہی میں رہا جہاں پہونچنا طالبین کے لئے آسان نہ تھا اسوجہ سے چند قریبی اضلاع کے سوا دوسرے علاقوں کے اہل طلب خال خال ہی پہونچتے تھے پھر تفتیر الہی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اپنے بعض اہل وطن کی کچھ عنوانیوں سے آندہ وہو کر آپ گورکھپور تشریف لے آئے جو مشرقی یوپی کا بڑا اور مرکزی شہر ہے اور اسکو مستقر بنایا کئی سال ہاں قیام رہا اس زمانہ میں گورکھپور ایک دینی اور روحانی مرکز بن گیا اور طلب و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ راقم السطور گورکھپور کے اس زمانہ قیام میں بھی ایک عقیدت مند زائر کی حیثیت سے طلب و عار اور استفادہ ہی کی نیت سے چند بار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا پھر کچھ مدت کے بعد آپ نے وہاں سے الہ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ یہاں پہونچکر حضرت کی مقبولیت کا اسی پیمانہ پر ظہور ہوا جو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی طرقت سے اپنے بعض خواص ادیاء کے لئے ہوتا ہے۔

یہ عاجز اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہاں بھی حاضر خدمت ہوتا رہا اور اپنی نااہلی کے باوجود حضرت کی عنایت و شفقت میں برابر اضافہ محسوس کرتا رہا۔

الآباد ہی کے زمانہ قیام میں حضرت کی آمد و رفت بمبئی شروع ہوئی جگہاں ہری سبب تو یہ تھا کہ حضرت کو بعض ایسے امراض لاحق ہو گئے جن کی وجہ سے زیادہ گرمی بھی سخت مسفر اور زیادہ سردی بھی سخت خطرناک اور چونکہ بمبئی میں زیادہ سردی ہوتی ہے زیادہ گرمی اسلئے حضرت کے معالج اطباء نے مشورہ دیا کہ سخت سردی اور گرمی کے موسم میں حضرت کا قیام بمبئی رہا کرے چنانچہ کئی کئی مہینے حضرت کا قیام بمبئی میں رہنے لگا۔۔۔۔۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بمبئی میں حضرت کے اس قیام کو وہاں کے لوگوں کے لئے رحمت اور رشد و ہدایت کا ایسا وسیلہ بنا دیا کہ جس کے ظہور کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمبئی میں نور ہدایت پھیلنے کے لئے ایک غیبی انتظام تھا۔۔۔۔۔ شاید ہی اللہ کے کسی بندے سے اہل بمبئی کو اتنے وسیع پیمانے پر اس طرح کا دینی فائدہ کبھی پہنچا ہو۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں کے تاجروں اور دوسرے انچے طبقوں میں حضرت کے سیکڑوں عشاق پیدا کر دیئے جو دنیا دار تھے وہ اللہ والے بن گئے اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ پھر زندگی کے آخری سال سترہ میں تو آپ کا قیام الہ آباد میں کم اور بمبئی ہی میں زیادہ رہا اس عاجز کو اس آخری اور آخری سال میں وہ وفد بمبئی میں حضرت کی خدمت میں کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا۔ پہلی بار فروری میں حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی نیت سے بمبئی کا مستقل سفر کیا اور دو ہفتے تک حضرت ہی کا ہمان رہ کر بے انتہا عنایتوں اور شفقتوں سے متمتع ہوتا رہا، پھر اسکے قریباً ۶ مہینے کے بعد مارشیش اور حجاز مقدس جانے کے لئے میں ستمبر میں بمبئی پہنچا، اندازہ یہ تھا کہ ہوائی سفر کے قانونی مراحل ایک دو دن میں طے ہو جائینگے اور میں انشاء اللہ اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو جاؤنگا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ سے بھی زیادہ بمبئی میں قیام کرنا پڑ گیا اندنوں میں بھی میں زیادہ تر حضرت ہی کی خدمت میں اور آپ کا ہمان رہا۔۔۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے میرا بمبئی میں جبری قیام میرے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی خیر و برکت کا اور اس سفر کے لئے حضرت کی صحبت و ہدایات سے بہترین زاد راہ حاصل کر لینے کا ایک وسیلہ تھا۔

اپنے اس سفر سے پہلے ہی یہ بات معلوم تھی کہ حضرت مولانا کا ارادہ اس سال اپنے خاص
 رفقاء اور اعزہ کے ساتھ سفر حج کا ہے اور یہ بھی کہ غالباً رمضان مبارک سے پہلے ہی تشریف لیجائیں گے
 یہ عاجز اپنے پروگرام کے مطابق پہلے مارشیش اور ری یونین گیا اور وہیں سے رابطہ عالم اسلامی
 کے اجلاس کی شرکت کے لئے مکہ معظمہ چلا گیا، اجلاس سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی
 حجاز مقدس میں مجموعی طور پر قریباً ایک ہینڈ قیام کے بعد ۲۰ نومبر کی صبح بمبئی واپسی ہوئی رفیق محترم
 مولانا سید ابوالحسن علی میاں بھی واپسی سفر میں ساتھ تھے، ہم دونوں اسی دن ۱۰ بجے حضرت کینڈمت
 میں زیارت اور دعا کی درخواست کے لئے حاضر ہوئے۔ آپ دو ہی دن کے بعد
 ۲۲ نومبر کو سفر حج کے لئے مظفری جہاز سے روانہ ہونے والے تھے لیکن ہم دونوں کو ایک اہم
 ضرورت سے جلد سے جلد کھنڈ پہنچنا ضروری تھا اسی لئے اگلے دن ۲۱ نومبر کی صبح بمبئی سے دہلی
 جانے والے قطار میں غالباً جدہ ہی سے ریزورٹیشن کرایا گیا تھا اس مجبوری سے ہمارے لئے دو دن
 بھی قیام کی گنجائش نہیں تھی، اس لئے اسی ملاقات میں ہم دونوں حضرت سے رخصتی مصافحہ
 اور دعا کی درخواست کر کے واپس آ گئے۔ یہ عاجز حج سے متعلق اپنی دو کتابوں 'آپ
 حج کیسے کریں؟' اور 'آسان حج' کے چند نسخے حضرت کے قافلے کے لئے حضرت کی خدمت میں
 پیش کرنے کے لئے رات کو پھر حاضر خدمت ہوا، حضرت نے بڑی محبت کے ساتھ کتابیں قبول
 فرمائیں اس حاضری میں میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اسکا مکان ہے کہ مجھے کبھی اس سال حج
 میں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے اسکے لئے حضرت دعا بھی فرمادیں حضرت نے فرمایا
 میں دعا کرونگا کوشش کیجئے ضرور آئیے۔ وہم و وسوسہ کبھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ حضرت
 کی آخری زیارت اور آخری ملاقات ہے۔

یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں اپنے پروگرام کے مطابق ۲۱ نومبر کی صبح بمبئی سے
 روانہ ہو کر دہلی آ گئے اور اگلے دن ۲۲ کی صبح اپنے مستقر کھنڈ پہنچ گئے۔ اسی دن
 حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ مظفری سے حجاز مقدس کے لئے روانہ ہو گئے۔ تین ہی دن ہوئے
 تھے ۲۵ نومبر کی شام کو بمبئی سے سیٹھ عبدالستار صاحب کا دیا ہوا تارندوۃ العلماء میں موصول ہوا
 جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آج صبح مظفری جہاز میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا

وصال ہو گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) دو دن کے بعد، ۲ کو ہمارے ایک دوسرے مخلص حاجی محمد یعقوب کا ۲۵ نومبر ہی کو نکھا ہوا خط ملا جس میں یہ تفصیل تھی کہ — حضرت کے رفقا کا مظفری جہاز سے بذریعہ وارلینس دیا ہوا تار آج دن کے گیارہ بجے بمبئی پہنچا جس بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۶ بجکر منت پر حضرت کا وصال ہو گیا اور جہاز کے کپتان کا کہنا ہے کہ جہاز کے قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھ کر میت کو سمندر کے سپرد کر دیا جائے اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ میت کو جدہ لیجائیں آپ لوگ مغل کمپنی سے کیپٹن کو تار دلو ایسے کہ وہ جدہ تک لیجانے کی اجازت دے اور انتظام کرے — چنانچہ کوشش کی گئی اور مغل کمپنی نے جہاز کے کپتان کو تار کے ذریعہ اسکی ہدایت دے دی اور ایک تار سعودی عرب میں حکومت ہند کے سفیر، حجت کامل قدوائی کو بھی دے دیا گیا تاکہ وہ سعودی حکومت سے حضرت کی میت کو جدہ میں اتارنے اور مکہ معظمہ میں تدفین کی اجازت حاصل کر لیں — کامل قدوائی صاحب اور حجاز مقدس کے مقیم حضرت علیہ الرحمہ کے خدام مولوی امجد اللہ صاحب گورکھپوری وغیرہ نے انتہائی جدوجہد کر کے سعودی حکومت سے یہ اجازت حاصل بھی کر لی لیکن اللہ کی مشیت کہ اس اجازت کی اطلاع مظفری کے کپتان کو نہ پہنچ سکی اسلئے جدہ کے ساحل کے قریب پہنچ کر اس نے حضرت کے رفقا سے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ آپ لوگ نماز جنازہ پڑھ کر میت کو سمندر کے سپرد کر دیں چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا — اور اب معلوم ہوا کہ تقدیر الہی میں یہی طے ہو چکا تھا کہ بیت اللہ کے راستہ میں جہاز میں حضرت کا انتقال ہوا اور حجاز پاک ساحل آپ کا دفن بنے یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیدُ۔

کچھ صفات و امتیازات

حضرت کے احوال حیات اور صفات و امتیازات سے متعلق کچھ لکھنے کا حق دراصل انھیں حضرات کو ہے جنھیں حضرت کی خدمت میں طویل قیام اور استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی اس عاجز کی واقفیت کا طول و عرض تو بس وہی ہے جو اوپر کی سطروں میں لکھا گیا تاہم

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر چند سطروں میں اپنے بعض احساسات و تاثرات بھی عرض کروں

جلال و جمال

حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت سے پہلے آپ کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا اس سے یہ سمجھا تھا کہ بڑے صاحب "جلال بزرگ" ہیں پھر جب پہلی دفعہ (۱۳۵۷ھ یا ۱۳۵۸ھ میں) حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی — جسکا ذکر اوپر آچکا ہے — تو "جلال" کی وہ کیفیت تو نہیں تھی لیکن اسکا کچھ رنگ ضرور محسوس کیا تھا (اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور نہیں ہوں جنکا احساس ان امور میں کچھ زیادہ قابل اعتبار ہو) لیکن گورکھپور اور الہ آباد کے زمانہ قیام میں جب حاضری ہوئی تو عنایت و شفقت اور رحمت و رافت ہی کا رنگ غالب پایا اور گزشتہ دو تین سالوں میں تو جب حاضری ہوئی تو محسوس کیا کہ رگ وریشہ پیار و محبت سے بھر پور ہے۔

قرآن مجید میں "بالمؤمنین روف رحیم" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان فرمائی گئی ہے اسلئے اہل اللہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی خلفاء اور نائبین ہوتے ہیں الوان کے اختلاف کے باوجود سب ہی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس گہنگار کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں کو دیکھنا نصیب فرمایا ان سب اس صفت سے بھر پور دیکھا لیکن حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خاص کر حیات کے اس آخری دور میں اس صفت کا انتہائی غلبہ تھا جو بھی حضرت سے قریب ہوتا محسوس کرتا کہ رگ وریشہ میں شفقت و عنایت بھری ہوئی ہے — جو طالب بنکر آنا چاہتے کہ اسکے اعمال و اخلاق کی پوری پوری اصلاح ہو جائے اور اسکو تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے اسی کے ساتھ بہت سوں کی دنیوی ضروریات کی بھی فکر فرماتے اور انکی تکلیفوں اور پریشانیوں سے سخت بے چین ہوتے۔

غیر معمولی تاثیر

اس کے اظہار میں ہرگز کوئی بے ادبی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ظاہری و باطنی

والی شکل و صورت بالکل نہیں عطا فرمائی تھی، اسی طرح آپ صاحب زبان و بیان مقرر بھی نہیں تھے، آج کل کی اصطلاح کے مطابق صاحب قلم بھی نہیں تھے، اگرچہ مدت سے مہموں کا روزانہ صبح ایک عام مجلس میں کچھ اصلاحی بیان فرماتے تھے، جسکا طریقہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اگلے اکابر علم، محققین، مصلحین میں سے کسی کی کوئی کتاب ہاتھ میں لیکر اسکی کوئی عبارت پڑھتے اور اس پر کچھ فرماتے۔ لیکن ماٹورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھتے اور اسکے مضمون کی وضاحت فرماتے لیکن اس بیان کی زبان اور اسکا انداز اکثر و بیشتر اس قدر علمی ہوتا تھا اور اس میں دسی اور فنی اصطلاحات کا استعمال ہوتا تھا کہ خاص مناسبت رکھنے والے اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے، پھر آواز کبھی کبھی اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ مائیکروفون سامنے ہونے کے باوجود بہت سے حاضرین مجلس نہیں جانتے تھے کہ کیا فرمایا لیکن تواثر کے طور پر لوگوں سے سنا اور خود بھی محسوس کیا کہ تاثر سے شاید کوئی بھی طالب خالی اور محروم نہیں رہتا تھا اور اثر بھی ایسا جو اکثر و بیشتر کا یا پلٹ کر دیتا تھا۔

وفات سے قریب دو ہی مہینے پہلے آخر ستمبر میں جب ایک ہفتہ کے قریب حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا تو ایک دن مجلس میں حضرت اپنی جگہ پر تشریف تو لے آئے لیکن دیر تک خاموش بیٹھے رہے مجھے وہ حدیث یاد آتی رہی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک حال تھا کہ آپ بہت دیر تک خاموش رہتے اور محسوس ہوتا کہ مسلسل غم و غم کی حالت میں ہیں۔ پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ آپ لوگ یہ ضرور ہی نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ بیان کروں گا یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے بیٹھنے میں بھی اپنا فائدہ سمجھیں۔

بہر حال حضرت کی مجلس اس حقیقت کی روشن دلیل تھی کہ دینی فائدہ کا زیادہ تعلق زبان و بیان سے نہیں بلکہ قلب سے ہے۔ حضرت کی مجلس کے حاضر باشعور میں جو عظیم انقلاب آیا

۱۔ امام عبد الوہاب شہرانی کا مشہور مقولہ ہے من لم ینفعہ سکو تنالہ ینفعہ کلامنا یعنی جس کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اسکو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ ۱۲

ہر آنکھوں والا صرف ایک شہر بھنبی میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

علمی رسوخ اور وسعت مطالعہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عام شہرت اگرچہ ایک شیخ طریقت اور صاحب ارشاد مصلح و مربی کی حیثیت سے ہے لیکن علم میں بھی اتنا رسوخ اور استحضار تھا اور مطالعہ اتنا وسیع اور عمیق تھا کہ اس دور کے اصحاب درس و مصنفین میں بھی اسکی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

ایک نیا انداز اور جذب و سلوک کا امتزاج

مشائخ طریقت میں اکثر و بیشتر وہ ہوتے ہیں جن کا ارشاد و اصلاح کا سارا کام بالکل اپنے شیخ کے متوال و منہاج پر ہوتا ہے لیکن بعض ایسے شہباز بھی ہوتے ہیں جو شیخ کی کارمل محبت اور متابعت کے باوجود ایک مستقل انداز اور طریقہ کے بانی دیکھے جاتے ہیں اسکی مثال میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلفا میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے خلفا میں حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ کا نام لیا جاسکتا ہے اگر چھوٹے منہ سے کسی بڑی بات کے کہنے کا کوئی جواز ہو تو یہ عاجز حکیم الائمہ حضرت تھانویؒ کے خلفا میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا نام بھی اسکی مثال میں لے سکتا ہے۔ حضرت مددوح میں جذب و سلوک کا ایسا واضح امتزاج تھا جس نے ایک نرے قسم کا بانگ بین پیدا کر دیا تھا۔

در دست نہ تیریت نہ در دست کماں است ایں سادگی اوست کہ بسل دو جہاں است

در درمہاد جنبش لعل تو حکایت در میکدہ از مستی چشم تو نشان است

(توجہ: سبحان اللہ اس مددوح کا بھی کیا کہنا کہ اسکے ہاتھ میں نہ تیر ہے نہ کمان ہے مگر اسکی اس سادگی کے ساتھ یہ حال ہے کہ دونوں جہاں اسکا بسمل ہو رہا ہے۔ اور اے میرے مددوح تیری جنبش لب سے درمہ میں رونق اور قیل بیل ہے اور تیری آنکھ کی مستی کو جہ سے مہمان آباد ہے۔ اسکے ذریعہ مولانا نعمانی نے حضرت کے علم ظاہر اور علم باطن کی تعریف فرمنا چاہا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی اسکا کچھ حصہ عطا فرمائے۔ ۱۲ جاتی)

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ کا بیان "تحدیثِ نعمت" کا ختم ہوا اب آگے حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب دہلوی مدظلہ کے تاثرات "پُرانے چراغ" سے نقل کئے جاتے ہیں۔

”مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری“

فروری ۱۹۵۲ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میرا منوا عظم گڑھ میں جہاں ایک تبلیغی دورہ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ پہنچا ہوا تھا، میں نے مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری کی زیارت کے لئے مولانا کے وطن و مستقر فتحپور تال نرجا حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا خوش قسمتی سے مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب نے جن پر مولانا کی اس زمانہ میں خصوصی نظر عنایت تھی میری رفاقت منظور فرمائی اس وقت تک مولانا کی صرف زیارت ہی زیارت ہوتی تھی، شاید پہلی بار اپنے محلہ کی مسجد میں اور ایک دو بار مولانا تھا نوی رحمۃ اللہ علیہ کی مکھنوں کی مجالس میں مولانا کو دیکھا تھا مگر وہ دیکھنا نہ دیکھنا برابر تھا نہ گفتگو کی نوبت آئی نہ پاس بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا ہمارے بزرگوں سے اچھی طرح واقف تھے، اعظم گڑھ کے تمام قصبات و دیہات جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ پھر ان کے معنوی جانشین مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور آخر میں مولانا سید امین نصیر آبادی کی دعوت و اصلاح کی کوششوں سے واقف اور ان کے معتقد و حلقہ بگوش ہیں بالعموم حضرت سید احمد صاحب کو بڑے سید صاحب کے نام سے اور مولانا سید محمد امین صاحب کو چھوٹے سید صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا وصی اللہ صاحب کو بھی ہمیشہ اسی طرح ذکر کرتے سنا۔ مولانا کا ایک عزیز قریب نے والد مرحوم سے طب پڑھ لی تھی اور ان کے مطب میں بیٹھتے تھے، وہ مزید واقفیت و تعلق کا ذریعہ بنے ہوئے، بھائی صاحب مرحوم سے بھی مولانا کو اچھا خاصا تعلق اور موانست تھی اور غالباً انھیں سے ملنے کے لئے ایک بار ہماری مسجد میں تشریف لائے تھے بحیثیت طبیب کے بھی انکی طرف رجوع فرمایا ہو گا وہ میری نو عمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا نہ میں مولانا کے مقدم و مرتب سے واقف تھا اور نہ انکو میری طرف خصوصی توجہ کرنے کا اس وقت

کوئی سبب تھا، اسلئے اصل زیارت و ملاقات کہنا چاہیے کہ اسی سفر میں ہوئی۔
 نکلے جاڑے تھے ہم لوگ ایک یو پرمو سے کوپا گنج گئے اور وہاں سے فتحپور کا رخ
 کیا۔ میرے ساتھ میرے ایک رفیق سفر مولوی اشرف علی صاحب بکھنوی تھے، دوپہر کا کھانا
 ہو چکا تھا اور لوگ قیلوہ کے لئے لیٹ چکے تھے ہم لوگ فتحپور پہنچے، مولانا کو اسی وقت خبر ہو گئی میرے
 نام سے غالبانہ طریقہ پر واقف تھے اسی وقت بالا خانہ سے نیچے تشریف آئے اور نہایت شفقت
 کے ساتھ مجھے اوپر لے گئے۔ دیر تک ازراہ شفقت میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے رہے اور یہ مولانا کی خاص
 ادائیگی پھر اسی وقت کھانا گرم کر دیا، دسترخوان بچھوایا مجھے اس طرح کھلایا جیسے مائیں پاس بیٹھ کر
 بچوں کو کھلاتی ہیں کبھی کبھی رقمہ بنا کر میرے منہ میں دیتے مجھے حیرت تھی کہ میری بے کمالی اور اپنی
 بلند مقامی کے باوجود پہلی ہی ملاقات میں ایسی شفقت کیوں؟

کھانسنے فارغ ہو کر میں نیچے آگیا اور اس خانقاہ میں ٹھہر گیا جو مولانا کے دولت خانہ کے
 مقابل تھی، یہ ایک پختہ عمارت تھی جو کسی بڑے مدرسہ کا دارالافتاء معلوم ہوتا تھا، غالباً دو منزلہ
 عمارت تھی اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس وقت محترم حاجی نثار اللہ صاحب رئیس گوڑھپور
 سابق ام۔ ایل۔ سی جو مولانا کے مسترشدین اور محبین خاص میں سے تھے خانقاہ میں مقیم تھے ان سے
 اچھا لطف صحبت رہا، وہ بڑے دیندار اور باذوق انسان تھے اور ان سے پہلے سے نیاز حاصل
 تھا۔ ایک شب خانقاہ میں قیام رہا اگلے دن وہاں سے واپسی ہو گئی لیکن اس غیر معمولی برتاؤ
 اور شفقت بزرگانہ کا اثر بہینوں باقی رہا

یہ پہلا تخم محبت و عقیدت تھا جو مولانا ہی کے وطن میں دل کی سرزمین میں ڈالا گیا اور
 بار آور ہوا والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ یہ بھی یاد ہے کہ ایک مجلس میں مولانا نے
 حاجی نثار اللہ صاحب یا کسی حاضر باش سے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو کہ مشہور مصرعہ
 "مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے" کا پہلا مصرعہ کیا ہے؟ لوگوں نے سکوت کیا تو فرمایا کہ
 مستی کے لئے بوئے مے تند ہے کافی

میںاد کا محروم بھی محروم نہیں ہے

میں اس کو اپنے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں کہ کیا عجیب ہے کہ یہ اس عابرانہ بلکہ طائرانہ حاضری کی نظر اشارہ ہو۔

واپسی پر مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب کو ۹ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ "فروری ۱۹۵۴ء" کو جو خط لکھا اس میں یہ الفاظ آئے ہیں:-

"فتحپور کا مبارک اور پر لطف سفر برسوں نہ بھولے گا۔ آتے جاتے آپ کی مخلصانہ اور محبانہ ادائیں اور فتحپور میں حضرت والا دامت برکاتہم کی بزرگانہ شفقتیں اور نوازشیں اب بھی یاد آتی رہتی ہیں اور دل میں چٹکیاں لیتی ہیں، اللہ تعالیٰ پھر وہ پرست لمحات نصیب فرمائے اور آپ کی معیت میں فتحپور کا سفر نصیب ہو"

اس درمیان میں دو گھنٹے کے لئے دوبارہ اپنے مخدوم و محترم دوست صوفی عبدالرب صاحب کی معیت میں حاضری نصیب ہوئی۔ صوفی صاحب کے فرزند اکبر میاں خالد عمر ایم۔ ایس۔ سی سلسلہ حال انجینئر جده کی مختصر سی بارات ساتھ تھی، مولانا نے انکا نکاح اپنے دوسرے خادم و محب مولانا امجد اللہ صاحب رئیس گورکھپور کی صاحبزادی سے پڑھایا اور ہم لوگ رخصت ہوئے۔ اسی سفر میں مولانا نے خصوصی شفقت فرمائی اور مجھے اپنے پاس ہی چار پائی پر بٹھایا، اسکے بعد عرصہ تک نہ ملاقات کی نوبت آئی نہ مکاتبت کا شرف حاصل ہوا۔ سب سے پہلے عریضہ ۱۳ رمضان ۱۳۵۷ھ کو لکھا جس میں اس ماہ مبارک میں دعار کی خصوصی درخواست تھی، مولانا نے اسکا بڑی شفقت سے جواب دیا اور تحریر منبر مایا کہ "امثال اللامرد عار کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنی طلب صادق عطا فرمائے اور آپ کو اپنے مخلصین میں شامل فرمائے۔ آپ سے بھی اسی دعار کی درخواست ہے"

۷ مولانا امجد اللہ صاحب کا گزشتہ سال رمضان المبارک (۱۳۹۱ھ) میں مدینہ طیبہ میں انتقال ہوا اور بقیع شریف میں دفن ہوئے۔

اسکے بعد حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات میں سے مکتوب بہت و دوم کا ایک نہایت موثر مضمون نقل فرمایا کہ جس میں ماسویٰ اللہ سے انقطاع کلی اور عشق موتے میں اپنے نفس کو بلکہ سارے جہان کو خیر باد کہہ دینے کی تلقین تھی۔ اس کے بعد سے مکاتبت کا سلسلہ جاری ہو گیا جس میں طویل طویل وقفے بھی ہوتے رہے۔ اپنے خطوط میں دعا کی درخواست اور محبت و مناسبت کا ذکر اور حضرت کے گرامی نامہ میں شفقت و خصوصیت کا اظہار ہوتا رہا۔ اسکے بعد ایک مرتبہ گورکھپور میں حاضری ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ فتنہ پور سے دل برداشتہ بلکہ آزرده ہو کر گورکھپور تشریف لائے تھے اور حاجی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی میں مقیم تھے وہیں حاضری ہوئی، علالت کا سلسلہ کچھ عرصے سے جاری تھا اسلئے ملنے ملانے میں کچھ پابندیاں تھیں لیکن مجھے طلب فرمایا گیا اور نہایت شفقت فرمائی، جمعہ کی نماز کے لئے بھی میرے ساتھ ایک ہی رکشہ پر بیٹھ کر تشریف لے گئے۔ گورکھپور سے واپس آکر میں نے ایک عریفہ لکھا جس میں ان شفقتوں اور خور و نوازی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ سعدیؒ کا مشہور مصرعہ بھی لکھ دیا کہ۔

کلاہ گوشہ دہقان بافتاب رسید (دہقان کا سرو تارے خوشی کے آسمان تک پہنچ گیا)
اس خط کے ساتھ میں نے اپنی نو تصنیف کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" کا پہلا حصہ بھی اس تمہید و تقریب کے ساتھ بھیجا کہ جناب والا نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ "بیماری میں ہر چیز سے یہاں تک گفتگو کرنے سے بھی طبیعت برداشتہ ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں جی چاہتا ہے کہ کوئی اور گفتگو کرے اور ہم سنیں۔۔۔۔۔ میں نے اسکا بدل تجویز کیا ہے کہ اپنی ایک حقیر تصنیف "تاریخ دعوت و عزیمت" پیش خدمت کروں اور وہ کبھی کبھی حضرت

۵۔ مولانا، رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو فتنہ پور سے گورکھپور تشریف لے گئے وہاں ڈیڑھ سال قیام رہا۔ ۲۔ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ کو الہ آباد تشریف لے گئے اور آخر تک وہیں قیام رہا۔

کی مجلس میں پڑھ کر سنا دی جائے۔ اسکی جرأت اسلئے بھی ہوئی کہ اس کتاب کے بعض مضامین سے جو اکابر کے کلام و تالیفات سے مانع و ہیں حضرت کے اذواق و ارشادات کی تائید ہوتی ہے۔

مولانا نے سعدی کے مصرعہ کا ایسا جواب دیا جس نے الٹا شرمندہ کیا، تحریر فرمایا کہ :-

”اسکا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں پڑھتا کیونکہ ایک بادشاہ نے کسی دہقان کے یہاں نزول فرمایا تھا اس پر اس نے یہ کہا تھا تو آپ کی مثال بادشاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک دہقان کے یہاں بھی نزول فرما کر اسکو شرف بخشا، اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں، صر“

کلاہ گوشہ دہقان بافتاب رسید

بلکہ پورے قطعہ ہی کو دہراتا ہوں کہ

ز قدر و شوکت سلطان نگشت چیزی کم ز التفات بہماں سرایے دہقانے

کلاہ گوشہ دہقان بافتاب رسید کہ سایہ بر سرش انداخت چو لے سلطانے

(دہقان کا سر تو مارے خوشی کے آسمان تک پہنچ گیا، شاہ کی قدر و منزلت میں کیا کمی آجائے اگر وہ ایک غریب دیہاتی کے غریب خانہ کا رخ فرما دے بلکہ دہقان کا سر تو آسمان سے باتیں کرنے لگے گا جبکہ آپ جیسے سلطان کا اس کے سر پر سایہ ہو جائے۔)

پھر کتاب کی پیشکش کے متعلق ایسی بات تحریر فرمائی جس سے اپنی غلطی پر تنبہ اور ندامت ہوئی اور مولانا کے مصلحانہ شان اور دیدہ وری کا اظہار ہوا، تحریر فرمایا گیا کہ

اور آپ نے اپنی بعض تصانیف کے متعلق جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ

مرض کی وجہ سے گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تو مجلس میں اسکو

پڑھ کر سنا یا جائے تاکہ تفریح طبع کا ذریعہ ہو سکے اسکے متعلق میرا

خیال یہ ہے کہ چونکہ اسکے مضامین ارشاد می ہیں جیسا کہ آپ نے

بیان فرمایا تو میں ارشاد می مضامین کو تفریح کا سبب نہیں بن دے گا
 کیونکہ یہ اسکی ناقدری ہوگی بلکہ میں یہ کروں گا کہ اسکا اند خود مطالعہ
 کروں گا اور جس طرح سے بزرگوں کے اقوال سے اثنائے گفتگو
 میں استدلال کرتا ہوں اسی طرح اسکے مضامین کو بھی لوگوں کے
 سامنے پیش کروں گا لیکن یہ سب کچھ ابھی نہیں بلکہ معتد بہ قوت کے بعد
 کروں گا۔

(مکتوب ۲۴ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ از گورکھپور)

اسکے کچھ عرصہ بعد مولانا گورکھپور سے الہ آباد تشریف لے آئے اور الہ آباد کیا
 تشریف لائے الہ آباد اور الہ آباد والوں کی قسمت جاگی اور وہ شہر جو عرصہ دراز تک
 تصوف و معرفت کا مرکز رہ چکا تھا اور یہاں کے بارہ دائرے مشہور تھے اب
 ذکر اللہ اور دعوت الی اللہ کی برکت سے اسم بسمیٰ اور صحیح معنیٰ میں الہ آباد
 ہو گیا۔ مولانا گورکھپور سے ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ میں الہ آباد تشریف لائے کچھ عرصہ
 حسن منزل میں قیام رہا پھر روشن باغ کا محلہ آپ کے قیام سے منور و
 روشن ہوا اور وہاں ایک خانقاہ اور دارالتر بیت قائم ہو گیا۔

اسی زمانہ میں محب محترم مولوی شاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے
 انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ میں تقریر کے لئے مدعو کیا جو بڑے دھوم دھام
 سے ہر سال الہ آباد میں ہوا کرتا تھا، خان صاحب کئی سال سے مدعو فرما رہے
 تھے لیکن چونکہ میرا معمول جلسوں میں بہت کم جانے کا تھا برابر معذرت کرتا رہا
 اس مرتبہ اس میں ایک دوسری کشش شامل ہو گئی، یہ مولانا کی موجودگی تھی
 جلسہ کا تو ایک بہانہ تھا، میں نے الہ آباد کا قصد کر لیا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری
 اور کچھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔ مولانا نے حسب معمول نہایت
 شفقت فرمائی، مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی جو اس سفر کی اصل
 قیمت تھی، اس وقت ذرا قریب سے اور کچھ زیادہ غور سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا

ایک اضطرابی اور سیما بی کیفیت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں، مسلمانوں کے حالات، اخلاق و معاملات کے بگاڑ، صدق و اخلاص کی کمی اور 'نفاق' کے کھلی آنکھوں مشاہدے نے بے قرار و مضطرب بنا رکھا ہے، اصلاح حال اور دعوت قرار الی اللہ کا جذبہ قلب و دماغ و اعصاب پر مستولی ہو گیا ہے اور وہ حال ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے ۵

شعلہ آخر زہر موسیٰ دمید از گد اندیشہ ام آتش بکبید
مولانا کی اس بقراری اور سیما ب وشی کو دیکھ کر بے اختیار مولانا محمد الیاس صاحب یاد آ گئے وہی خیمت جنت، وہی گفتگو میں تکلفات، انداز خطا بہت سے بے نیازی، وہی موسیٰ رنگ کہ زبان سینہ کے جوش اور دل کا ساتھ نہ دے سکے، وہی فکریں ڈوبا ہوا سکوت، وہی اضطراب سے لبریز تکلم، دعوت کے موضوع کا ضرور فرق تھا لیکن اپنے موضوع سے عشق اور اپنے کام کی فکر کا وہی حال تھا۔ صبح اور شام کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ایسے جذب کی کیفیت تھی جس پر عقل و سلوک کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے، کبھی کبھی بعض مخلص خادموں کے سر پکڑ کر ملا تے اور انکو کسی نکتہ یا ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے الہ آباد کی مجالس میں خاص طور پر تذکیر بالآخرت اور نعمائے جنت و عذاب جہنم کی ترغیب و ترہیب پر خاص طور پر زور تھا، اور یہ کہ قرآن مجید کا اسلوب اور طریقہ موعظت سب سے زیادہ مفید اور موثر ہے۔ نیز یہ کہ علماء اور واعظین نے آخرت کے مضمون اور جنت و دوزخ کے تذکرہ کو بالکل فراموش و نظر انداز کر دیا ہے اور انکو اس سے شرم آنے لگی ہے گویا وہ ایک خلاف فیشن بات ہے۔ الہ آباد سے واپسی پر ۲۵ شوال ۱۳۷۷ء کو لکھنؤ پہنچ کر جو عریضہ لکھا اس میں انھیں تاثرات کا اظہار تھا خاص طور پر اس غیر معمولی شفقت پر اپنے گہرے تاثرات و تشکر کا اظہار کیا گیا تھا جو اس دور و زہ قیام میں دیکھنے میں آئی، مولانا نے اسکا جو جواب دیا وہ میرے لئے

سرایہ سعادت ہے اور یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے

حبیبی و محبی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمات نامہ نے شرکت صدوزنختا، باعث ازدیاد محبت و
و خلوص ہوا جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد و رفت فرماتے ہیں ان
میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے
ارقام فرمایا ہے کہ جس اہم و بہا یک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے
وہ میری اصلاح و تعلیم کے لئے بہت مفید تھی ہم لوگوں نے
اس موضوع و مضمون کو بالکل فراموش اور نظر انداز کر دیا ہے اسکو
سن کر بیاختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۵

لگ چلا تھا دل آفس میں پھر پریشاں کر دیا ہمصنفیر و تم نے پھر ذکر گلستاں کر دیا
اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں کچھ عرض کرنے کی، بعد
آنے اجازت نامہ کے قدرے تفصیل سے عرض کرونگا۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

اس حاضری اور تاثر اور تحریک کا نتیجہ مولانا کا وہ بیش قیمت مضمون "التذکر
بالقرآن" تھا جو میری واپسی کے بعد سپرد قلم فرمایا گیا اور "المنہقان" اور دوسرے
رسالہ میں شائع ہوا اور علیحدہ کتابی شکل میں چھپ گیا۔ یہ مضمون باوجود عجز آرائی
اور تکلفات سے دور ہونے کے نہایت موثر اور مفید ہے اسکے بعد غالباً ایک بار
اور اصلاح المسلمین کے جلسے میں اور حقیقتاً مولانا کی مجالس میں شرکت اور استفادہ
کے لئے الہ آباد جانا ہوا، قیام تمام تر مولانا کے دولت خانہ پر رہا مجالس اور حلقہ افادہ
و استفادہ کا وہی معمول تھا جو پہلے دیکھنے میں آیا تھا یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی
کہ شہر کے ذی علم اور فہیم حضرات حاضری دیتے ہیں اور اسکو اپنی سعادت
سمجھتے ہیں۔

۱۔ سکے بعد پھر ایک بار ۱۹۶۴ء میں الہ آباد عافری ہوئی تقریب عافری تھی کہ ۲۰ مارچ کو دینی تعلیمی کونسل جس کی صدارت کا شرف شروع سے حاصل رہی الہ آباد میں صوبائی کانفرنس تھی اسکا پہلے سے قصد تھا کہ قیام مولانا ہی کے یہاں رہے گا غلطی سے مولانا کو اپنی آمد اور پہنچنے کے وقت کی اطلاع دیدی، غلطی اس لئے کہ جب بیس جون کو صبح الہ آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ مولانا خود اسٹیشن تشریف لائے ہیں گاڑی ذرا تاخیر سے پہنچی تھی مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ اس خیال سے کہ وہ وقت چائے اور ناشتہ کا ہو گا میں چائے اور ناشتہ اسٹیشن پر لایا ہوں کہ تاخیر نہ ہو لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے اس لئے اب گھر ہی پر ناشتہ ہو جائے گا۔ میں اس لطف و کرم اور اہتمام کو دیکھ کر پانی پانی ہو گیا اور اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ پہنچنے کے وقت کی اطلاع کیوں دی اس سفر میں مجھے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی برادرم مولوی سید ابوبکر صاحب حسنی ایم۔ اے (حال استاذ نہرو یونیورسٹی دہلی) جو مولانا کی زیارت و ملاقات کے بڑے مشتاق تھے اور عزیز می سید محمد مسلم حسنی بھی ساتھ تھے، ہم سب مولانا ہی کے ہمان رہے کیونکہ شدید گرمی کا زمانہ تھا اسلئے شب کا قیام ایک نوخیز مکان کے صحن میں رہا مولانا نے ہماری راحت کا بڑا اہتمام فرمایا تھا اس زمانہ قیام میں مولانا نے مسلمانوں کے حالات و مسائل سے اپنی گہری دلچسپی اور فکر مندی کا بار بار اظہار فرمایا بعض مرتبہ مولانا جامی صاحب یا مولانا سراج الحق صاحب کو خصوصی پیغام دیکر میرے پاس اس وقت بھیجا جب میں کانفرنس کے سلسلہ میں کسی کمیٹی یا مجلس کے مذاکرات میں شریک تھا۔

مولانا کے قیام سے الہ آباد میں دینی رونق پیدا ہو گئی تھی، جس محلہ میں قیام تھا اس مسجد کی توسیع کی ضرورت جلد پیش آگئی، مدرسہ بھی قائم ہو گیا اور مولانا کی برکت سے لوگوں میں اپنی اصلاح و تربیت کی طرف توجہ پیدا ہو گئی

مولانا کو مساجد کی تعمیر کا بڑا ذوق تھا جہاں کچھ عرصہ قیام فرماتے وہاں ضرور کچھ نئی مسجدیں تعمیر ہو جاتیں۔ گورکھپور میں بھی ایسا ہی ہوا اور الہ آباد کے اسٹیشن کے قریب کی مسجد جسکی بنیاد شاید پہلے پڑ چکی تھی مولانا کے من توجہ سے تکمیل کو پہنچی اور اسکا شمار خوبصورت مسجدوں میں ہونے لگا۔

مولانا کے اس تعلق قلبی اور شفقت بزرگانہ کا پورا اظہار اسوقت ہوا جب میں اپنی آنکھ کی تکلیف کے سلسلہ میں شہر میں سیتاپور میں مقیم تھا اور یکے بعد دیگرے آپریشن ہو رہے تھے کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا اسوقت مولانا کے نامہ و پیام برابر آتے تھے اور الہ آباد سے مولانا کے اہل تعلق میں جو بھی آتا وہ بیان کرتا کہ مولانا بہت فکر مند اور بیچپن میں بعض اوقات لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں انکی اس تکلیف میں کس طرح کمی کر سکتا ہوں؟ یہاں کے قیام کے آخر زمانہ میں مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ ”میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو وہاں کے علاج سے فائدہ نہ ہوگا آپ لکھنؤ چلیں اور ہومیو پیتھک علاج کریں“ میں اور میرے تیماردار بھی اس قیام سے عاجز آ گئے تھے یہ ایک اشارہ غیبی معلوم ہوا اور میں لکھنؤ آ گیا اور مجبور ہو کر ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر جو بہت زیادہ نامور بھی نہ تھا رجوع کیا خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جو تکلیف بار بار کے آپریشنوں سے بھی نہیں گئی تھی وہ باذن اللہ ایک خوراک سے جاتی رہی اور الحمد للہ پھر کبھی نہیں ہوئی نام تو اس ڈاکٹر کا ہو گیا اور اس معرکہ الار علاج سے خود اسکو بہت فائدہ ہوا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں دوا سے زیادہ دعار اور ایک مرد خدا کی اور بہت سے مخلصین کی سوز قلبی اور درد مندی کا ہاتھ تھا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں

مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(اے محبوب! مشک کی خوشبو پھیلا نا دراصل کام تو آپکی زلف کا ہر لیکن عاشقوں اور شاعروں کی مصلحت اسکو چھین کر نہ کرنا چاہیے)

اس تکلیف سے نجات پانے کے بعد میں نے الہ آباد کا مستقل سفر کیا جس کا محرک محض جذبہ شکر اور مولانا کی مسرت قلبی کی توقع تھی۔

گرمی کا زمانہ تھا مولانا نے نیچے کی منزل میں قیام کا انتظام فرمایا تاکہ گرمی میں اوپر آنے کی زحمت بالکل نہ کی جائے۔ اسکا بھی اہتمام کیا گیا کہ کسی ضرورت کے لئے باہر نہ نکلنا ہو، کئی بار انارٹھریس کے دانے اس پیغام کے ساتھ بھیجے گئے کہ یہ آنکھوں کے لئے مفید ہیں۔ پھر شام کو بڑی شفقت کے ساتھ ملاقات فرمائی، کھانے کا اہتمام فرمایا ان نواز شوں میں محض بزرگانہ نہیں بلکہ مادرہ شفقت کی جھلک بھی نظر آئی تھی جو نابین رسول کا امتیاز ہے عزیز علیہ ما عندہ حریم علیکم

ایک بار مجلس مشاورت کے جلسے کے سلسلہ میں جو الہ آباد میں ہونا طے پایا تھا الہ آباد جانا ہوا، مولانا ہی کے دولت خانہ پر قیام مقاصد مجلس ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف لائے تھے ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی اور کچھ ایسا بھی سنا جاتا تھا کہ وہ داخل سلسلہ بھی ہو گئے ہیں مجلس کے بعض دوسرے قائدین بھی الہ آباد آئے ہوئے تھے وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے تھے۔ مولانا ابواللیث صاحب ندوی (امیر جماعت اسلامی) خاص طور سے حاضری کا اہتمام کرتے تھے اور مولانا بھی ان پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اب وہ وقت آگیا کہ مولانا کے لئے اپنے مرض رعاف کیوجہ سے الہ آباد کی گریوں میں رہنا مشکل ہو گیا اور معالجین نے معتدل آب و ہوا کے کسی مقام پر گرمیاں و سردیاں گزارنے کا مشورہ دیا اس علاج و مشورہ میں ہمارے شہر بکھنؤ کے نامور طبیب یونانی شفا الملک مولانا حکیم خواجہ شمس الدین صاحب پیش پیش تھے جنکو اپنی صداقت نیز مناسبت و عقیدت کیوجہ سے مولانا کے خاص معتمد و مقرب بننے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ اب بمبئی کی قسمت نے زور کیا، ظاہر میں سمجھے کہ مولانا اپنے علاج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں لیکن حقیقت میں اہل بمبئی کا علاج مقصود تھا اور وہاں ایک روحانی مطب کھلنے کا قضا و قدر میں فیصلہ ہو چکا تھا، مولانا کی دہشتگی (جسکے ساتھ اہل بمبئی کی دلکشی و وابستہ تھی) بمبئی اور اہل بمبئی سے بڑھتی گئی اور اہل بمبئی کو بھی مولانا کی ذات سے گرویدگی اور عقیدت آنا فانا ترقی کرتی گئی سارے قرآن و اسباب ابات کے مؤید تھے کہ مولانا کی آمد و قیام سے ہندوستان کے اس عظیم ترین شہر دھکا مزاج ہمیشہ سے تجارتی اور کاروباری رہا ہے اور کسی زمانہ میں مسلک دیوبند کے

داعیوں اور علم برداروں کے لئے ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا) کے ساکن سمندر کی سطح میں ادنیٰ سا توجہ و حرکت بھی پیدا نہ ہوگی مولانا کے پاس ان اسلحہ اور وسائل میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی جو بمبئی کے لوگوں کو گردیدہ اور متاثر کر سکتی یعنی خطابت، ظاہری وجاہت پر و پیگنڈا اور ظاہری شان شوکت وغیرہ لیکن قضا و قدر کے فیصلے ان میں سے کسی چیز کے بھی تابع اور پابند نہیں لوگوں نے جو کچھ دیکھا تمام تر قیاسات کے برخلاف تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت کام کر رہی ہے اور لوگوں کے دلوں اور دعوں کو انکی طرف متوجہ کر رہی ہے میں نے ان تاجروں اور بمبئی کے چوٹی کے کاروباری لوگوں کی عقیدت و رجوع کو دیکھا جو اس سے پہلے کسی دینی دعوت و تحریک سے متاثر نہیں ہوئے تھے اور جو علمائے حق کی طرف سے شدید بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا تھے انکار رجوع برابر بڑھتا گیا اور تیزی سے ان میں اصلاح و تغیر آنے لگا دیکھتے دیکھتے انکی صورت و سیرت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں مجھے شہ سے بمبئی جانے کا برابر اتفاق ہوتا رہا اور اس میں مشکل سے کسی سال وقفہ ہوتا تھا لیکن اب مولانا کے قیام کے بعد جو بمبئی جانا ہوا تو وہاں کی حالت ہی دوسری دیکھی، جن لوگوں کو مولانا کی مجلس میں دیکھنے کی بالکل امید نہ تھی انکو وہاں سر بہ زانو پایا حالانکہ یہاں کشش کے وہ سب اسباب مفقود تھے جو بمبئی کے لئے ضروری تھے ۱۹۶۷ء میں حجاز جاتے ہوئے چند روز بمبئی میں ٹھہرا، میں ایک دن صبح کڑا جہاں مولانا کا قیام رہتا تھا ٹھیک صبح کے درس کے وقت پہنچا، مجھے مولانا کی کرسی کے پایہ کے پاس جگہ دی گئی، مولانا تشریف لائے میکروفون سامنے تھا کچھ بیان فرمانا شروع کیا درمیان میں تفسیر و حدیث کی کتابیں منگو کر ان کی عبارتیں سناتے اور تقریر فرماتے میں پایہ سے لگا بیٹھا ہوا تھا مولانا کے لہجہ اور طرز کلام سے کبھی مانوس تھا لیکن خود بھی گفتگو کا خاصا حصہ نہیں سمجھ سکا لیکن دیکھتا تھا کہ لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں گہرا اثر ہے، کسی بار کی طرح اس موقع پر بھی اندازہ ہوا کہ تاثیر کے لئے خطابت و الفاظ کی کوئی شرط نہیں، ”سیار شیوہ ہست بتاں را کہ نام نیست“ ورنہ اس کے برخلاف بڑے بڑے شیوہ بیان مقرر تقریر کا سماں باندھ دیتے ہیں لیکن نہ قلوب پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی انقلاب اس لئے کہ بقول جگر

آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پر یقین کا نور نہیں

اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کے سفر و قیام کا سلسلہ چند سال اور قائم رہتا تو شاید بمبئی میں خاصے وسیع پیمانے پر دینی بیداری، اصلاح حال، اتباع سنت کا ذوق اور بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا لیکن خدا کی حکمت اور اسرار الہی کوئی نہیں جانتا نمبر ۶۷ء کو یہ سلسلہ غیر و برکت اچانک ختم ہو گیا اور صرف بمبئی ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان اور عالم اسلام اس مبارک وجود سے محروم ہو گیا جس نے مشائخِ پیشین اور مصلحین اولین کی یاد تازہ کر دی تھی اور اور ثابت کر دیا تھا کہ اخلاص و دردا اپنے کام کی دھن اور لگن اور روحانی قوت بڑے سے بڑے ناسازگار حالات اور سخت سے سخت مادہ زدہ اور ظاہر پرست دور اور ماحول میں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ 'ع'

جہانے را در گروں کر دیک مرد خود آگاہے

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مولانا کے قلب میں زیارت بیت اللہ اور کچھ عرصہ اسکے سایہ میں قیام کرنے کا جذبہ اور شوق اس طرح موجزن ہوا کہ کوئی طبی مصلحت اور اصلاحی ضرورت اس پر غالب نہ آسکی، مولانا نے حج کا عزم فرمایا اور اپنے خصوصی مخلصین کو بھی اس پر آمادہ فرمانا شروع کیا، یہ جذبہ اس قوت اور شدت سے پیدا ہوا تھا کہ کوئی مشکل اسکی راہ میں حائل نہ ہو سکی اور خدا کی کچھ ایسی مدد ہوئی کہ موانع مرتفع ہوتے چلے گئے اور ہمرکابی کے لئے ایک اچھا خاصا قافلہ تیار ہو گیا، میں اسی زمانہ میں رابطہ کے جلسے میں شرکت کے لئے سفر حجاز پر روانہ ہوا تھا بمبئی میں جب بغرض ملاقات حاضر ہوا تو اپنے ارادہ کا جس کا عام طور پر اعلان نہیں ہوا تھا ذکر فرمایا، رخصت ہو کر جب موٹر پر آکر بیٹھ گیا تو مولانا جاتمی صاحب کو یہ خصوصی پیغام دیکر بھیجا کہ واپسی میں عجلت نہ کیجئے گا میرا انتظار کیجئے گا لیکن میں بعض اسباب کی بنا پر زیادہ نہ ٹھہر سکا اور جلسہ سے فارغ ہو کر بمبئی واپس ہوا، وسط نومبر ۱۹۶۷ء کی غالباً ۱۹، ۲۰ تاریخ تھی مولانا سے ملا عرض کیا کہ میں آؤں گا لیکن مجھے بعض اسباب کی بنا پر تو قیام کرنے میں رمضان المبارک میں حاضر ہونا پڑے گا اور اس طرح کچھ عرصے وہاں آپ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملے گا مولانا بہت خوش ہوئے

اور فرمایا کہ ضرور ضرور کوشش کرتا۔

واپسی کے سفر میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی ساتھ تھے مولانا کی روانگی سے ایک دو روز پیشتر ہم لوگ لکھنؤ روانہ ہونے والے تھے، ایک شام ایک معتقد کے یہاں جو ایک بڑے تاجر تھے مولانا کی چائے کی دعوت تھی، ہم دونوں اور مولانا ابراہیم صاحب بھی مدعو تھے مولانا نے اپنے گدے پر دائیں اور بائیں اپنے قریب ہم دونوں کو بٹھایا پھر بڑی رازداری سے لب مبارک کو میرے کان کے پاس لا کر فرمایا۔ ”دعا کرو کہ حاضری ہو جائے“۔ میں اس جملہ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا کہ اب حاضری میں کیا تردد؟ چند دن کا معاملہ ہے لیکن بعد کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ یہ جملہ بڑا معنی خیز تھا اور تقدیر الہی کو وہاں حاضری کے بجائے کچھ اور منظور تھا وکان امر اللہ قد رامقدورا۔

روانگی چہار شنبہ کے روز ۲۲ نومبر ۱۹۷۷ء کو ہوئی ابھی جہاز کو روانہ ہوئے دوسری روز ہوئے تھے کہ ۲۴ نومبر بعد نماز مغرب غشی کا دورہ پڑا اسی شب میں چند گھنٹے کے بعد گیارہ بجے شب میں بیت کے بجائے رب البیت سے جا ملے اور مکان کے بجائے مکین سے واصل ہوئے ان الی ربك الرجعی

یہ خبر جب وائریس سے حجاز پہنچی تو وہاں کے مخلصین نے اور خود مدحت کامل صاحب سفیر متعین سعودی عرب نے جنت معلیٰ میں تدفین کے لئے حکومت سعودیہ کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی اور بالکل استثنائی طریقہ پر جسد مبارک کو البلد الامین لانے کی سرکاری طریقہ پر اجازت ملی، جنت المعلیٰ میں شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہاجر ملی کی لحد کی جگہ پر قبر تیار بھی کر لی گئی اور مدرسہ صولتیہ میں غسل کی تیاری بھی شروع کر دی گئی لیکن یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ رہا اس غلط فہمی کی بنا پر کہ اجازت نہیں ہوئی ہے غسل تکفین اور نماز جنازہ میں عجلت سے کام لیا گیا اور جسد مبارک جہاز کے قوانین کے مطابق سمندر میں اتار دیا گیا۔ سنا ہے کہ مولانا بمبئی سے رخصت ہونے سے پہلے بار بار یہ شعر پڑھتے تھے

پھول تربت پر مری ڈالو گے کیا؟ خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائیگی

یہ واقعہ جس طرح پیش آیا اس میں تدبیر کی بے بسی اور تقدیر کی قہارمی صاف نمایاں تھی تفصیل کا یہ موقع نہیں "واللہ غالب علی امرہ" ولكن اکثر الناس لا یعلمون "اس طرح ان بزرگوار کی نورانی فہرست میں جن کے مدفن ہونے کا ثروت بجائے آغوش خاک سمندر کے سینہ کو عطا کیا گیا اور جن میں حضرت مولانا مفتی عثمانیت احمد صاحب کا کوروی مصنف "علم الصیغہ" اور "تاریخ حبیب الہ" اور قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف "رحمۃ للعالمین" جیسے صلی اور مقبولین شامل ہیں، ایک اور مرد کامل کا اضافہ ہوا اور سمندر کو شکایت نہ رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم ہے جو زمین کے نصیب میں آئی ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ کا بیان جو پرانے چراغ سے ماخوذ تھا ختم ہوا اس سے قبل حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ کے قلم سے حضرت مصلح الائمہؒ سے ملاقات کے واقعات اور خود مولانا کے تاثرات ملاحظہ سے گزر چکے ہیں، اسی سلسلہ میں چند باتیں اور عرض ہیں جو راقم کے اپنے مطالعہ اور تاثر سے متعلق ہیں وہ یہ کہ :-

آخری دور میں مولانا نعمانی مدظلہ اور حضرت مصلح الائمہؒ میں بہت ہی قریبی اور مخصوص تعلقات ہو گئے تھے یعنی ایسے کہ مولانا نعمانی حضرت والا کو اپنے حق میں ایک ایک مربی سے کم نہ تصور فرماتے تھے اور حضرت والا بھی ان کے حالات اور انداز ملاقات سے یہ سمجھتے تھے کہ مولانا کو اب اشارۃً طریق سے بھی خاصا تعلق ہو گیا ہے جسکی وجہ سے اہل طریق سے یہ انس و محبت ہے اس لئے حضرت والا کے قلب میں بھی مولانا نعمانی کی خاص قدر و محبت تھی۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بمبئی کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ مولانا نعمانی حضرت مصلح الائمہؒ کے یہاں کرا لا تشریف لے گئے اور چند دن حضرت ہی کے یہاں رہے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے کسی کمرہ کے ایک گوشہ میں جگہ دیدہ بجائے اہل بمبئی سے مولانا نعمانی کا جو تعلق تھا ظاہر ہے۔ چنانچہ علم ہونے پر معتقدین اور مخلصین ملنے آئے اور ہر چند اصرار کیا کہ مولانا ان کے یہاں قیام کریں اور جب جب حضرت والا

کے یہاں آنا چاہیں گے کار کا انتظام رہے گا بے تکلف آجاسکیں گے۔ لیکن مولانا نے
نے وہاں کی خانقاہ کے گوشہ اور چٹائی کو ترجیح دی اور کسی پر تکلف اور آرام وہ قیام گاہ
پر تشریف لیجانا پسند نہیں فرمایا اور یہی فرماتے رہے کہ میرا یہ سفر اپنی ایک ضرورت سے
حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی غرض سے ہوا ہے۔ چنانچہ اس سفر میں مولانا نے کسی
وعظ و تقریر یا تبلیغی وغیر تبلیغی کسی پروگرام کو بھی منظور نہیں فرمایا اور یہی فرماتے رہے
کہ اس وقت تو میرا یہ سفر ایک دوسری ہی ضرورت سے ہوا ہے اس میں دوسرے امور کو شریک
نہیں کرنا چاہتا۔

اب آپ خود خیال فرمائیے کہ حضرت والا کو جب مولانا نعمانی کی اس نیت کا
حال معلوم ہوا ہوگا تو آخر حضرت پر کبھی اسکا کچھ اثر ہوا ہوگا یا نہیں؟ بزرگوں کے پاس
اس طرح کے آنے جانے والے آج دنیا میں کتنے ہیں؟ اور مشائخ اور بزرگ تو بجا خود
رہے آج حج کو جانے والوں اور زیارت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غرض سے
سفر کرنے والوں کی نیتوں کا خالص ہونا مشکل ہو رہا ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اسی نیت
کے مسئلہ کو خود حضرت مصلح الامۃ ہی کی زبان فیض ترجمان سے آپ یہاں بھی سن لیں۔
ایک سلسلہ کلام میں فرمایا کہ

”سینے! ہر آدمی اپنے تجربہ و دیانت کا مکلف ہے۔ میں دیانت سے
کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں سبھی لوگوں کی نیت بزرگوں کے پاس آنے جانے
میں دین ہوا اس میں مجھے کلام ہے۔ لیکن آپ لوگ اس کو سینے کا نہیں
اور میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آج جو عوام خراب ہوئے ہیں تو خواص کی وجہ سے
جب ہمارے خواص اچھے تھے تو عوام بھی اچھے تھے، صاف کہتا ہوں کہ
عوام کو ان علماء نے خراب کیا ہے۔ اور میرے سوا تم اسکو کسی اور سے نہ سنو گے
ہم لوگوں کا تم نے بہت امتحان لیا، ہمارا ایک تماشا بنایا ہے اس کو
کہتا ہوں سنتے ہو تو سنو اور یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ باتیں تمکو سخت لگیں گی لیکن
مجھے اسکی پرواہ نہیں ہے بہت نرم نرم کہہ کر دیکھ لیا جب سخت بات

کہنی جائے گی تو سخت معلوم ہی ہوگی اسی لئے تو سخت کہہ رہا ہوں کہ آپ
اثر لیں اور یہ میں عوام کو نہیں علماء کو کہہ رہا ہوں۔“

(ص ۴ معرفت حق جنوری ۱۳۶۹ء)

سبحان اللہ! کیا کلام کی شان ہے، دیکھئے اصلاحی کلام ہے اور واقعی قدرے
تلخ بھی ہے لیکن اخلاص کی شکونے اسکو کیسا شیریں اور پیارا بنا دیا جو جی چاہتا ہے کہ
حضرت والا اسی طرح کی باتیں فرماتے جائیں اور ہم سنتے جائیں افسوس آج اسی قسم کی باتیں
سننے کو تو طبیعت ترس گئی ہے۔

”الحمد للہ مولانا نعمانی مدظلہ کے اس عمل میں ہمارے لئے یہ تعلیم ہے کہ کسی دینی سفر میں
بڑا اہم معاملہ نیت کا ہے۔ چنانچہ میرے علم میں ہے کہ ایک دفعہ گورکھپور میں جب حضرت والا
کا قیام تھا اور حضرت زیادہ علیل ہو گئے تھے اسوقت بھی مولانا نعمانی مدظلہ حضرت کی عبادت
کے لئے تشریف لے گئے تھے ظاہر ہے کسی کی عبادت ایسی کوئی چیز نہیں کہ اسکے ساتھ کسی
اور شے کی شرکت عرفاً کچھ قبیح شمار ہو، چنانچہ شہر کے اہل تبلیغ تشریف لائے اور مولانا نعمانی
سے خواہش ظاہر کی کہ ایک تقریر اور ایک اجتماع تبلیغی سلسلہ کا آپ کی صدارت میں
ہو جائے تو اچھا ہے، مولانا نے وہاں بھی اسکو منظور نہیں فرمایا اور کسی طرح تیار نہیں ہوئے
بعض لوگوں نے کہا بھی کہ حضرت والا سے ہم اجازت لئے لیتے ہیں مگر مولانا یہی فرماتے
رہے کہ نہیں بھائی اسوقت میرا یہ سفر صرف حضرت کی عبادت اور جتنا وقت مل سکے حضرت
کی صحبت اور خانقاہ میں قیام کے لئے ہوا ہے اس سفر میں میرا اور کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔
اس جواب پر اہل شہر تو مایوس ہو کر چلے گئے لیکن جب آقا قدس کو اسکی اطلاع ہوئی تو دیکھتے
حضرت نے کیا معاملہ فرمایا (سبحان اللہ! سبحان اللہ! حضرت واقعی حکیم تھے اور اللہ تعالیٰ
نے موقع شناسی اور تیقظ اور مقتضائے حال کے مطابق کوئی حل تجویز فرمایا لے کا تو ملکہ
عطا فرمایا تھا)۔ شہر کے با اثر علماء مولانا افتخار احمد صاحب اور مولانا سید وصی الدین
صاحب کو طلب فرمایا اور غالباً حکیم وصی الدین سلمہ کو بھی بلایا کہ ان دونوں حکیم صاحب ہی
کے مکان میں حضرت کا قیام تھا اور فرمایا کہ آپ لوگ مولانا محمد منظور صاحب کے پاس

جا کیے اور اپنی جانب سے ان سے یہ درخواست کیجئے کہ حضرت آپ جامع مسجد میں آج وعظ فرمادیں اور ہم لوگوں نے حضرت سے اجازت لیکر آپ سے یہ درخواست کی ہے لہذا اب آپ ہماری اس درخواست کو رد نہ فرمائیے ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ کا یہاں ایک وعظ ہو جائے۔ اب صورت حال ایسی آن پڑی تھی کہ مولانا کو یہ درخواست منظور ہی کرنی پڑی۔ چنانچہ جامع مسجد میں وعظ ہوا اور حضرت مولانا نعمانی مدظلہ نے جب ابتداء بقدر اخلاص کا معاملہ فرمایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انتہا تک اسے باقی رکھا یعنی مولانا نے کسی معروضہ عنوان پر وعظ نہیں فرمایا بلکہ خالص خانقاہی قسم کی باتیں بڑے اچھے اور موثر انداز میں بیان فرمائیں یعنی نفس کی شرارت، اصلاح نفس کی ضرورت، بزرگوں کی صحبت، طریق اور اہل طریق کے آداب کی رعایت غرض یہی ساری باتیں موضوع وعظ رہیں۔

غرض مولانا نعمانی نے ہر طرح سے حضرت کے ماننے کا ثبوت دیا تو پھر حضرت والا بھی دل سے مولانا کی طرف متوجہ رہے چنانچہ بمبئی کے اسی سفر میں یا کسی دوسرے سفر میں میرے ہی واسطے سے حضرت والا نے مولانا نعمانی مدظلہ کے پاس کہلایا کہ مولانا سے جا کر کہو کہ میں آپ کو کچھ دینا چاہتا ہوں آپ بھی اسکے لینے کے لئے تیار ہیں؟ یہ سنا کہ مولانا نعمانی مدظلہ متاثر ہوئے اور کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ چلئے اسکا جواب میں خود حضرت سے عرض کر دوں اور حضرت والا کے کمرہ میں تشریف لے گئے خادم بھی ہمراہ تھا مولانا کچھ ابدیدہ سے تھے، حضرت نے خادم سے فرمایا کہ تم نے میری بات مولانا سے کہی؟ خادم نے عرض کیا کہ جی ہاں عرض کر دی مولانا خاموش تھے حضرت نے فرمایا پھر مولانا کیا فرماتے ہیں؟ اتنے میں مولانا خود بمشکل لب کشا ہوئے کہ حضرت کا نہایت ہی کرم ہے اس پر میں اللہ تعالیٰ کا جس قدر بھی شکوہ ادا کروں کم ہے۔ بس حضرت والا سے اپنے لئے دعا چاہتا ہوں۔ حضرت والا مسکرائے اور فرمایا کہ ہاں دعا تو آپ کیلئے کرتا ہی ہوں۔

اسی کو میں نے عرض کیا تھا کہ آخر آخر مولانا نعمانی علیہ السلام کے تعلقات حضرت مصلح الامۃ سے دلی اور محبت کے ہو گئے تھے۔

حضرت الائمۃ کی اصلاحی مساعی

حضرت والا کے مسند ارشاد پر فائز ہونے اور اصلاحی کام کے شباب پر ہونے کا ذکر کر رہا تھا درمیان میں حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ العالی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہ کے بعض تاثرات کا جواب انہیں کے قلم سے کہئے ہوئے تھے ذکر آگیا اس کے بعد پھر اپنا سلسلہ کلام سابق سے جوڑتا ہوں۔

حضرت مصلح الائمۃؒ کی خانقاہ فتچپور میں طالبین اور سالکین کا ایک مجمع ہر وقت رہا کرتا تھا، اعظم گڑھ کے دیہات اور قصبات کے علاوہ اطراف کے شہروں سے بھی جوق در جوق لوگوں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ گورکھپور، غازیپور، بنارس، بلیا، دیوڑیا، جونپور اور الہ آباد کے علاوہ دور دور مثلاً کلکتہ، کٹک، مدراس اور بھوپال وغیرہ سے بھی لوگ آنے لگے تھے، خانقاہ دو منزلہ بن چکی تھی، مسجد کی توسیع ہو چکی تھی، جمعرات اور اتوار کو باوجود اس وسعت کے بھی خانقاہ میں جگہ نہ رہ جاتی اس لئے زیادہ تر لوگ مسجد ہی میں آکر ٹھہرتے اور بعد ظہر مجلس میں شرکت کر کے بعد عصر واپس ہو جاتے اور یہ لوگ اطراف و جوانب کے ہوتے تھے طلبہ اور مدرسین کو خیشنبہ کو موقع ملتا تھا اور اتوار کو منو کا بازار بند ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر لوگ اس اطراف کے اسی دن کو اپنی حاضری کے لئے مخصوص کئے ہوئے تھے اس طرح سے ہر طبقہ کو حضرت والا کی مجلس سے استفادہ کا موقع ملتا تھا اور خود حضرتؒ کی نظر عوام و خواص سب ہی کی اصلاح پر تھی۔ چنانچہ عوام کی اصلاح کے لئے واعظین اور دُعاة کا بند و بست فرمایا اور قاری ریاست علی صاحب مرحوم مولوی محمد امین صاحب مرحوم مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ اور مولوی عبدالحکیم صاحب مدظلہ کو فتچپور اور اسکے اطراف جوانب کی بستیوں میں وقتاً فوقتاً وعظا کے لئے بھیجنا شروع فرما دیا۔ فتچپور میں تو خود حضرتؒ ہی کی ذات موجود تھی یہاں کے لوگوں کو جمع فرما کر دین و دیانت کی ترغیب، اتفاق و اتحاد کے ساتھ رہنے کا مشورہ اور دوسری جگہوں کے لوگوں کے لئے دین کا ایک عمدہ نمونہ بننے کی برابر ترغیب دیا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنی بستی میں کچھ کام نکروں اور دوسری جگہ جا کر

ان سے دین کا مطالبہ کروں مجھے اس سے بہت شرم آتی ہے ہاں پہلے اپنے یہاں کچھ کام کر لوں تو پھر دوسری جگہ کہنے سننے کی ہمت پڑ سکتی ہے اور وہ لوگ اسکی وجہ سے اثر بھی قبول کریں گے اسکے لئے اصول تنظیم مقرر فرمائے اور انکو آنے جانے والوں کو سنائے بعضوں کو لکھوائے کہ لوگ بات کو خوب سمجھ لیں۔ چنانچہ اسی زمانہ میں یہ چند اصول زریں مرتب فرمائے۔

اصول تنظیم

۱۔ ہمارا کام آج اس لئے خراب ہوا کہ ہم میں کوئی تنظیم نہیں، ہمارا کلمہ مجتمع نہیں ہر شخص اپنی رائے میں آزاد ہے کوئی کسی کا اتباع کرنا نہیں چاہتا غیروں کو جانے دیجئے خود مریدین کو دیکھئے کہ اپنے مشائخ کی کامل اتباع نہیں کرتے اب آپ ہی بتائیے کہ جب کوئی مرید ہی اپنے شیخ کی بات نہ مانے گا تو اسکی آواز میں کیا قوت اور اسکے فعل میں کیا اثر ہوگا۔ لوگ اس بات کو تو دیکھتے نہیں اور کام بھی چاہتے ہیں، کسی کام کے جو اصول و شرائط ہیں انھیں اختیار نہیں کیا جاتا تو پھر کام ہو تو کیسے ہو؟ حدیث شریف میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی بیعت کا تذکرہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات بیعت کے معنی کامل حوالگی کے سمجھتے تھے اور اسکے بعد پھر اپنی رائے اور اپنے ارادہ کا نام تک نہ لیتے۔ حضرت عبادة بن الصامتؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ (آپ کی تمام باتیں) سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی، نشاط والے امور میں بھی اور ان امور میں بھی جو نفس پر شاق ہوں اور اس بات پر بھی کہ اگر کسی امر میں (مثلاً تقسیم غنائم یا تفویض مناصب میں) ہمارے غیر کو ہم پر ترجیح دی جائیگی تو ہمکو کوئی ناگواری نہ ہوگی (ہم دل سے اس پر راضی رہیں گے) اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم کسی معاملہ میں اس کے اہل سے منازعت نہ کریں گے اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت

کہنوالے کے ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔

آج اپنا حال دیکھئے کہ تشیخ اگر کوئی کام کسی کے حوالہ کر دے تو دوسروں کو اس شخص پر حسد اور تشیخ کے فعل پر دل ہی دل میں انکار ہوتا ہے۔ ”تنظیم کا جو پہلا زنیہ ہے وہی درست نہیں ہے

۲۔۔۔۔۔ آج مسلمانوں کا کام اسلئے بھی خراب ہو رہا ہے کہ لوگ مل جل کر کام نہیں کرتے اور کوئی شخص کوئی کام اٹھاتا ہے تو دوسرے لوگ اس کی پوری طرح اعانت نہیں کرتے اور وجہ اسکی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں خلوص تو ہوتا نہیں دیکھتے ہیں کہ کام ہم کرتے ہیں اور نام دوسرے کا ہوتا ہے اسلئے علیحدہ رہتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقام پر کسی ایسے شخص کے ذریعہ کام ہو رہا ہو تو وہاں کسی شخص میں حرکت ہوتی ہے کہ میرے یہاں یہ اپنا اثر پیدا کر لیں اور میں منہ دیکھتا رہ جاؤں اسلئے اسکا اثر زائل کرنے کے لئے خفیہ ریشہ دوانی شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اس سے پہلے کبھی انکو اسکی ہوس بھی دل میں نہیں گزرتی اگر اخلاص ہوتا تو سوچتے کہ مقصود کام ہے نہ کہ نام اور یہ تو بہت اچھا ہے کہ کام میں ہماری شرکت ہو اور نام نہو، ہم اسکی وجہ سے ربا و دھند سے بچ جائیں گے ہمارے اجر میں اضافہ ہوگا اور جس کا نام ہو رہا ہے وہ تو آزمائش میں پڑ گیا اگر اپنے کو نہ سنبھالا تو اجر سب برباد ہو جائیگا اور نام و دھند کا جو وبال ہوگا وہ الگ ہے ایک وجہ لوگوں کے اعانت نہ کرنے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کو کام کر نیوالوں سے حد ہوتا ہے اور وجہ اسکی اوپر گزر چکی ہے یہی انکو حمایت سے باز رکھتا ہے۔

۳۔۔۔۔۔ مہلکانوں کی جو حالت آج درست نہیں ہو رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر بستی، ہر گاؤں، ہر قصبہ اور ہر شہر میں کچھ اہل علم حضرات یا چودھری صاحبان یا (دکیل اور) طبیب صاحبان ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کا ہر ایک طالب جاہ ہوتا ہے اور ان میں آپس میں اقتدار کی لڑائی ٹھنی رہتی ہے، رہے ہمارے عوام الناس تو انہیں سے جس کسی کو جس سے عقیدت اور مناسبت ہوتی ہے اسکے ساتھ ہو جاتا ہے اس پر ساری قوم ٹولیوں ٹولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور انکے اتفاق و اتحاد کا شیرازہ بالکل

منتشر ہو جاتا ہے پھر کوئی کام سکون و اطمینان کے ساتھ نہیں ہو پاتا۔

اس خرابی کی اصلاح کی یہی صورت ہے کہ پہلے ان مقتداؤں میں اتفاق ہو اور ایک دوسرے کی شکایت نہ کرے، اور اپنے معتقدین سے نہ دوسروں کی شکایت کرے نہ ان سے دوسروں کے معتقد فیہ کی شکایت سنے اور اگر کوئی کسی کی شکایت کرے تو سختی سے زجر کرے بلکہ اسکو اپنے یہاں سے نکال دے۔

۴۔ ایک خرابی آج مسلمانوں میں یہ ہو گئی ہے کہ لوگ ٹولی ٹولی میں تقسیم ہو گئے ہیں اور ہر شخص اپنی ٹولی کو بڑھانا چاہتا ہے یہ چیز نہ صرف یہ کہ عوام ہی میں پائی جاتی ہے بلکہ اس سے متجاوز ہو کر مدارس اور خانقاہ تک میں بھی موجود ہے اب لوگ مشائخ کے یہاں بھی جاتے ہیں تو اسلئے نہیں کہ انکا اتباع کریں گے بلکہ اس لئے کہ شیخ کو بھی اپنی ٹولی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، الا ماشاء اللہ چاہتے یہ ہیں کہ مشائخ ہمارا اتباع کریں اور ہم انکی اتباع نہ کریں۔

۵۔ اس زمانہ میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ بعض لوگوں کو اپنے مقتداؤں پر اعتماد کم ہوتا ہے اور اعتماد کی کمی اعتقاد کی کمی سے ہوتی ہے۔ رائے میں، امانت میں اور مسلمانوں کی بہبودی پیش نظر رکھنے میں انکو اپنے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ فواہ وادیلہ ویا حستراہ۔

نیز اس زمانہ میں سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کا ہے۔ سب سے اہم چیز یہ ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی اور باقی رکھنے کی کوشش کی جائے اور یہ صرف اسی طور پر ہو سکتا ہے کہ دوسروں کی نسبت حسن ظن رکھا جائے اور زبان بند رکھی جائے اور طعن و تشنیع، اعتراض و انکار اور سب و شتم سے غایت درجہ اجتناب کیا جائے بالخصوص مجالس و محافل میں لیکن آج ہم ان دونوں امر کے شکار ہیں (یعنی نہ ہم میں اتحاد ہے نہ دوسروں کے ذکر سے ہماری کوئی مجلس ہی خالی ہے۔)

۶۔ آج مسلمانوں کی زندگی کا نہ کوئی اصول رہ گیا ہے نہ ان کے سامنے کوئی نصب العین ہی ہے نہ کوئی نظام ہے اسلئے وہ ادھر ادھر دوسری جماعتوں

میں داخل ہونے پھرتے میں، انکو اپنے گھر کی بھی خبر نہیں ہے

یک سید پرناں ترا بر فرق سر تو ہی جوئی لب نان در بدر
قاعدہ ہے کہ جس شخص کی اپنے گھر عزت ہوتی ہے وہ جہاں بھی جاتا ہے معزز ہی ہوتا
ہے اور جس کی خود اپنے گھر ہی میں عزت نہ ہوئی وہ ہر جگہ ذلیل و خوار رہتا ہے۔
دیکھئے جو شخص اپنے گھر کا رئیس ہوتا ہے جہاں جاتا ہے اسکی خاطر تواضع کیجاتی ہے
اور فقیر و درگھومتا ہے مگر کوئی ایک ٹکڑا روٹی کو بھی نہیں پوچھتا۔ اسی طرح آج مسلمان
کا حال ہے کہ اپنے دین و مذہب سے بالکل غافل ہیں اسلئے کہیں بھی انکی قدر نہیں
عزیز ہے کہ از در گہش رو بتافت بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

(وہ ایسا عزیز اور غالب ہے کہ جس شخص نے بھی اسکی درگاہ سے منہ موڑا تو پھر وہ جہاں بھی گیا اسکو عزت نہیں ملی)
اگر دین کو مضبوطی سے پکڑے ہوتے تو جہاں کہیں جاتے انکی عزت ہوتی۔

(۷) ————— نو جوانوں کو معاملات اور اخلاق کی درستی کی طرف متوجہ کریں
اور اسکی نگرانی رکھیں، اہم چیز معاملات کی اصلاح ہے کیونکہ سارے جھگڑے
اسی (بد معاہدگی) سے پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن معاملات سے بھی اہم اخلاق کی اصلاح
ہے۔ اخلاق کی اصلاح کی صورت میں بد معاہدگی کی نوبت ہی نہ آئیگی کیونکہ
بد اخلاقی ہی کی فرع بد معاہدگی ہے (جب اصل ہی موجود ہوگی تو فرع کا تحقق
کیونکر ہوگا۔)

۸ ————— اہل اسلام کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کریں
اور ہر شخص کے ذمہ لازم کر دیں کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی مقدار میں تعلیم دین ضرور دلائے
جس سے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنے دین و ایمان سے ناواقف نہ رہیں اور جو بچے
دنیوی تعلیم مثلاً (انگریزی یا ہندی) حاصل کر رہے ہیں انکے لئے بھی انکے اوقات تعلیم
کے علاوہ کوئی وقت مقرر کیا جائے جس میں وہ دین سیکھیں۔

ان اصول کو عوام میں ترویج دینے کے ساتھ ساتھ علماء اور خواص پر بھی

نظر ہی اور مدرسین اور طلبہ کی اصلاح سے بھلی غافل نہیں رہے کیونکہ حضرت اقدسؒ
 یہ سمجھتے تھے کہ اصلاح کا کام تو علماء ہی کر سکتے ہیں لیکن کب جبکہ وہ اپنی اصلاح خود
 کر چکے ہوں اور ذاکل نفس سے چھوٹ چکے ہوں اور اسکے عادت ہو چکے ہوں ورنہ تو
 صفا و خویش تن گم است کرا رہبری کند کا مصداق ہوگا۔ چنانچہ ایک بڑے مدرسہ کے
 بڑے عالم کے پاس تحریر ارسال فرمائی (اس مدرسہ کے اکثر مدرسین حضرت والا ہی سے
 منسوب تھے اور بستی کے عوام و خواص کا اکثر طبقہ معتقد تھا اور حضرت کو مانتا تھا، تحریر یہ گئی

”یہ تحریر یعنی پیغام و ہدایت حضرت والا مدظلہ العالی کی جانب سے گو
 آپ کے نام لیکن مخاطب جملہ مدرسین صاحبان مدرسہ ہیں امید کہ اس مختصر تحریر
 کو کافی سمجھتے ہوئے اپنے اپنے حالات کا جائزہ لیں گے اور از سر نو
 عزم اور اخلاص سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاغل میں نہایت سکون و
 اطمینان کے ساتھ لگے رہیں گے۔“

اولاً: یہ سمجھئے کہ اصل چیز اخلاص ہے اسکے پیدا کرنے کی اور ہمیں
 اضافہ کی بارسعی کرنی چاہیے۔ ہر معاملہ میں اسکو پیش نظر رکھا جائے کہ ہمارے
 اخلاص کا کیا تقاضا ہے اور اسکی رد سے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

ثانیاً: مسلمانوں کے بچے جو مدرسہ میں آتے ہیں یہ قوم کی بیش بہا
 امانتیں ہیں ہمیں انکا حق ادا کرنا چاہیے ہمارے ہی توجہ سے یہ بھلی بن سکتے
 سکتے ہیں اور ادنیٰ عدم توجہی سے انکا ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا ہے
 ہر طالب علم کے متعلق یہ خیال ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے

در اقم عرض کرتا ہے کہ یہ جو فرمایا کہ انکا ناقابل تلافی نقصان ہو سکتا ہے وہ بالکل ظاہر ہے
 کہ آج اسلام کے یہی ٹوٹے پھوٹے عربی دینی مدارس سے جو لوگ پڑھ کر نکلتے ہیں آئندہ
 چل کر یہی لوگ قوم کے دینی پیشوا ہوں گے کیونکہ نہ کوئی دوسرا دین کی تعلیم پڑھتا ہے
 نہ اسکی ضرورت محسوس کرتا ہے تو جب اساتذہ کی بے توجہی سے یہ نوہالان اسلام
 کج روی اختیار کر لیں گے اور راہ سے بے راہ ہو جائیں گے، دین کی اشاعت اور

اور دھن کی جگہ انکشتی انداز پیدا ہو جائے گا اور اقتدار کی ہوس قلوب میں جاگزیں ہو جائے گی تو پھر جس منصب کے لئے انھیں تجویز کیا گیا تھا اور جو کام ان سے متوقع تھا ظاہر ہے کہ وہ خاک حاصل ہو سکے گا اور ان حالات کے ساتھ وہ اگر کچھ پڑھ لکھ بھی لیں گے تو بقول حاکمِ مرحومؒ ”وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر“ اور بقول حضرت انور شاہ کشمیریؒ ”یہ لوگ عالم جاہل ہوں گے“ اور حسب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فضلو اواضلو کا مصداق ہی ہوں گے۔ یہی ہے وہ ناقابل تلافی نقصان جسکا اندیشہ حضرت مصلح الامۃ فرما رہے تھے۔ افسوس کہ حضرت کا یہ اندیشہ صرف اندیشہ ہی نہیں رہا بلکہ ہماری شامت اعمال نے ہمکو آج وہ دن دکھائی دیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

بس اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہے مدارس دینیہ کی صلاح و فلاح اور اصلاح غالباً سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے خواص امت کو خطاب کر کے فرمایا تھا یا ملاح الارض اصاحوا اے وہ لوگو جو بمنزلہ نمک کے ہو خود اپنی اصلاح کر لو کیونکہ ہر نمکین چیز کا ذائقہ نمک ہی سے درست ہوا کرتا ہے لیکن اگر کہیں نمک ہی فاسد ہو جائے تو پھر اسکی اصلاح کی کوئی صورت نہیں یہ تھا وہ ناقابل تلافی نقصان جسکا ردنا حضرت مصلح الامۃؒ فرما رہے ہیں)

مثلاً: ”آپ حضرات کے باہمی اخلاق کا اثر طلبہ پر ضرور پڑے گا اور دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ ہی کے آئینہ میں دیکھیں گے چنانچہ عوام کا اپنے اپنے بچوں کو عربی پڑھانا اور آپ ہی کے مدرسہ میں پڑھوانا آپ ہی حضرات کے اخلاق پر موقوف ہے۔ لہذا اخلاق کے اس قحط کے زمانہ میں اہل مدارس کو اخلاق نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مکمل نمونہ ہونا چاہیے اس میں جو صاحبِ حقینی زیادہ بھی ترقی کر سکیں کریں۔“

(راقم عرض کرتا ہے کہ یہ جو فرمایا کہ ”دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ کے آئینہ میں دیکھیں گے“ مطلب یہ ہے (واللہ تعالیٰ اعلم) کہ ہر انسان اپنے بچے کو اسی شاہراہ پر لگانا چاہتا ہے جس کو وہ بہتر سے بہتر سمجھتا ہے چنانچہ آج قوم کا جوق در جوق

کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں ہر ایک کا دنیوی تعلیم کی جانب رخ کرنا بھی اسی امر کی ایک کڑی ہے کہ لوگ دنیوی تعلیم میں نفع عاجل (فوری نفع) دیکھ رہے ہیں کہ اسے پڑھ کر کوئی انجینئر، کوئی کمشنر، کوئی جج، کوئی کلکٹر، کوئی وکیل، کوئی ڈاکٹر، کوئی پروفیسر، کوئی ٹیچر، کم از کم کلرک تو ہو ہی جاتا ہے اور عربی تعلیم میں انتہائی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی ہو سکتا ہے کہ ایک کلرک کی تنخواہ سے اسکی تنخواہ کم ہی ہو اسلئے کون اپنے سخت جہد کو فقیر بنانا پسند کر سکتا ہے عوام کے اسی جذبہ کی ترجمانی کرتے ہوئے اکبر مرحوم نے کہا تھا کہ

نہیں پرسش ہے اسکی طاعت اللہ کتنی ہے؟ یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ لیکن یہ اس طبقہ کا حال ہے جسکے نزدیک بس دنیا ہی دنیا ایک چیز ہے۔ اخلاقی اقدار اللہ تعالیٰ کی طاعت، خصلت نیک اور دینداری، دیانت و امانت، خدمت خلق وغیرہ سے اتصاف ان کے نزدیک کوئی قابل قدر چیز نہیں۔ تاہم دنیا ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے جنکے نزدیک دنیا کی ضرورت تو ہے لیکن دین کی وقعت ان کے یہاں ابھی دنیا سے زیادہ ہے اور وہ اہل دنیا کی (دنیا کی بہتات کے باوجود) بد اخلاقیوں سے تنگ آکر وہ راہ نہ خود چلنا چاہتے ہیں نہ اپنی اولاد کے لئے پسند کرتے ہیں اور اکبر مرحوم کے اس شعر کو دل سے پسند کرتے ہیں

انہوں نے دین کب سیکھا ہو رہ کر شیخ کے گھر میں پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں چنانچہ اپنے بچوں کے لئے یہ درجہ انھیں قطعی ناپسند تھا اس لئے اس سے ہٹ کر اہل دین کی طرف انکا قدرے جھکاؤ ہوا دیکھا کہ ایک بچہ مکتب میں عربی پڑھ رہا ہے بڑے سلیقہ کا انسان ہے نہایت مہذب اور شائستہ، پڑھنے میں مگن ہے، استاد کا ادب بیدار، ماں باپ کی خدمت کے لئے مستعد نماز باجماعت کا پابند، صفائی معاملہ اور صدق گفتار و کردار و احوال سے متصف، کسی سے لڑائی نہ باہم بھائی بہنوں میں گالم گلوچ۔ چونکہ ان صفات کی بھی اللہ تعالیٰ نے ایک قیمت رکھی ہے اسکی لالچ سے اس نے طے کر لیا کہ اپنے بچے کو دینی تعلیم دیگا کہ بلا سے میرا بچہ دنیا زیادہ نہ کما سکے گا لیکن "مال" سے بھی بڑھ کر جو شے "عزت" وہ اس عطا کر نصیب ہے

چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ مدرسہ کے مولانا صاحب کس قدر باعزت و باعزت رہتے ہیں ہر شخص کے دل میں انکی وقعت ہر شخص کے نزدیک انکا ادب و احترام۔ اس لئے میں بھی اپنے بچہ کو ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہوں قوم کی دینی خدمت کو جہ اندک کرے جس کا لازمی نتیجہ انکی جانب سے اکرام و تعظیم کا ہے خلق بھی خوش اور خدا بھی راضی۔

تو ملاحظہ فرمایا آپ نے ایک شخص کو دین اور دینی تعلیم کا خیال مدرسہ کے مولوی صاحب کے کردار کی خوبی، احتلاق کی بلندی اور طلبہ کے حسن تربیت کی وجہ سے ہوا اب اگر کسی دینی مدرسہ کا حال اس سے مختلف ہو جائے یعنی وہاں کے طلبہ کے یہاں صرف مطالبات کا انبار ہو اساتذہ کا ادب و تعظیم بجائے خود رہی وہاں کے ہر استاد کو اپنی عزت بچانی مشکل ہو رہی ہو اور درس و تدریس میں المسلم من سلم المسلمین من لسانہ و یدہ پڑھکر آنے کے بعد اسکی تکرار اس طرح کی جارہی ہو کہ کہ باہم کسی بحث میں دست و گریباں ہو جانا تو معمولی بات ہے لاکھمی ڈنڈے وغیرہ کے استعمال میں بھی تکلف نہ ہو تو آپ خود فرمائیے کہ اس منظر کے دیکھنے کے بعد کون شریف اور ذمی جس انسان اپنے بچے کے لئے اسی ماحول کی زندگی دیکھنا پسند کرے گا اور اگر سب مدارس و نیوے اسی انداز کے ہو جائیں یہ کہہ کر کہ ہمارے ایک بڑے مرکزی مدرسہ کا یہی حال ہو تو پھر بتائیے دین کا کیا حشر ہوگا؟ بادی النظر میں تو یہ لاکھمی اور چاقو انسانوں پر چلتے نظر آ رہے ہیں لیکن ارباب حقیقت جانتے ہیں کہ اسکے ذریعہ دین کو شکست کیا گیا اور اخلاق کو ذبح کیا گیا۔

ایک طبقہ نے تو پہلے ہی سے تعلیم دین سے بیزاری اختیار کر لی تھی دوسرے نے اب ان حالات کو دیکھ کر اس میدان میں قدم رکھنے سے کان پکڑا اب آپ ہی فرمائیے کہ والبادی ان ظلم اور من ستن سنہ سینہ کا کیا مطلب ہوا؟ اور اگر ہمارے اس طرز سے اسلام یا تعلیم دین کو کچھ نقصان پہنچ رہا ہے تو خدا تعالیٰ کے یہاں ہمارے لئے اس سے عہدہ برآری کی کیا صورت ہے؟ اپنی ان صفات کے ساتھ ہم لوگ چشمہ کے منہ کا پتھر بن گئے ہیں کہ نہ خود اس سے پانی پیتا ہے اور نہ دوسروں کو پینے دیتا ہے۔ پھر ایسی حالت میں کسی کو دین اور دینی علم کی جانب رغبت ہو تو کیونکر ہو اور کوئی کیا نفع دیکھ کر اپنے تخت جگہ کے لئے دینی تعلیم تجویز کرے کیونکہ

”دوسرے لوگ اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ ہی کے آئینہ میں دیکھنا چاہیں گے“

اس موقع پر ایک بات یاد آگئی حضرت مصلح الامۃ نے ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے کسی عزیز بچے سے پوچھا کہ میاں فلاں تمہیں انگریزی پڑھنا پسند ہے یا عربی۔ اس نے برجستہ کہا کہ عربی۔ حضرت نے پوچھا کہ کیوں اس بچے نے کہا کہ اس لئے کہ بڑے بڑے انگریزی دان ٹی ٹی کلر وغیرہ آپ کا جوتا اٹھاتے ہیں اور آپ کسی کا جوتا نہیں اٹھاتے یعنی آپ کو ان سب میں گویا جاہ میں تقدم حاصل ہے۔ یہ اس نے اپنے فہم کے مطابق ایک بات کہی اور اس میں شک نہیں کہ خوب بات کہی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اخلاص تو ہم لوگوں میں ہے نہیں کسی لالچ ہی سے لوگ کوئی کام کرتے ہیں مال کا خیال ہو یا جاہ کا، دین پڑھنے والوں کے لئے ال و دنیا کا نفع تو اہل دنیا نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا، باعزت و جاہ کا نفع وہ ہم نے اپنے ہاتھوں خود ختم کر لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون شاید ایسے ہی حالات میں ایک مسلم کو ابھارنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ من احیا سنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائتہ شہید جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میں میری سنت کو زندہ کرے گا اسکو سو شہید کا ثواب ملے گا

آپ خود غور فرمائیے کہ ایسی حالت میں دین کس قدر غریب اجنبی اور کس پرسی کے حال میں ہو جائیگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل صادق آجائے گا کہ ان الاسلام بدأ غریبا و سيعود غریبا فطوبی لدغریاء اسلام اپنے ابتدائی دور میں بالکل ایک اجنبی مسافر غریب الدیار سا ہو کر آیا تھا جس کا نہ کوئی ثنا سا ہو اور جس سے کسی کی راہ و رسم ہو اور آخر زمانہ میں پھر ایسا ہی ہو جائیگا۔ حالات زمانہ نے وہی دور ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ لیکن اسکے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ فطوبی لدغریاء یعنی جو لوگ سارے ماحول کے خلاف میری سنت کو زندہ کرنے کے درپے ہوں اور دین کو اختیار کئے ہوئے ہوں ان کے لئے خوشخبری ہو جنت کی، خدا کی رضا کی، میری خوشنودی کی۔ آج یہی زمانہ ہے کہ بلاشبہ علم دین کی تحصیل کے داعی کم بلکہ ختم ہو گئے ہیں لیکن اسکے باوجود جو اللہ کا محبوب بندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محب امتی اس راہ کو اپنے لئے پسند کرے گا وہ لائق صدمبارک باد ہے۔ انہیں حالات کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہؓ سے فرمایا کہ سنو! آج کے

دن دین کے دس حصوں میں سے اگر تم لوگ نو پر عمل کرو گے اور ایک کو ترک کر دو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے اور میرے بعد ایک ایسا زمانہ آئیگا کہ لوگ اگر دین کے دس حصوں میں سے صرف ایک حصہ کو اختیار کرینگے تو کامیاب ہو جائیں گے، اسکی وجہ اس قسم کے حالات کا پیدا ہو جانا ہے کہ جس میں دین اختیار کرنا انسان کے لئے ہاتھ میں انگارہ لینے سے زیادہ دشوار ہوگا اسلئے ناامید ہونے کی اور مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہمت کے ساتھ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر ایمان لاتے ہوئے اپنی جانب سے سعی و کوشش میں کمی نہ کرنی چاہیے، حالات کو سازگار بنا دینا کارساز حقیقی کا کام ہے

کارساز مابساز کا ربا نکر ما در کار ما آزار ما
 رابعاً: "طلبہ میں اس زمانہ میں بالعموم بہت ہمتی، کم ظرفی، کم وصلگی اور جھبن و
 بزدلی کا مرض عام طور پایا جاتا ہے، شروع ہی سے ان امور کے اندر کی ضرورت
 ہے اور ضرورت ہے کہ ان میں عالی ظرفی، بلند وصلگی، جرأت وغیرہ پیدا کی جائے
 اور غصہ و کبر، چوری و جھوٹ وغیرہ کی سختی کے ساتھ نگرانی کی جائے۔ نیز بڑے طلبہ
 میں دوسرے قسم کی بداخلاقیات جو ہو جاتی ہیں انکی طرف سے بھی غافل نہ رہا جائے،"
 خاصاً :- "اپنی جانب سے سعی و کوشش کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ
 سے اعانت طلب کی جائے کیونکہ بدون انکی امداد کے ہمارے کسی کام میں برکت
 نہوگی اور بفضل خداوندی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری طرف سے تعلق و
 نسبت قوی ہو جتنی نسبت قوی ہوگی اسی قدر ادھر سے اعانت عام و تام دیکھے گا"
 والسلام - وصی اللہ عفی عنہ

ملاحظہ فرمایا اپنے اصلاح امت کے سلسلے میں حضرت مصلح الامۃ نے عوام کے اتفاق و اتحاد
 کے لئے اصول تنظیم مقرر فرمائے اور خواص یعنی علماء اور طلبہ کو الگ فرمان جاری فرمائے گئے کہ
 مدرسہ میں کیا ہونا چاہئے اور کیا ہو رہا ہے۔ اہل مدارس خدا تعالیٰ کے یہاں کی باز پرس سے غافل نہ ہوں
 اور یہ امر پیش نظر رکھیں کہ انکے اخلاق و کردار کا اثر متعدی ہوا کرتا ہے۔ اب انکے طلبہ میں حسن خلق
 حسن ادب، حسن سیرت پیدا ہو رہی ہے یا کچھ اور اسکے وہ خود ذمہ دار ہیں۔

اسکے ساتھ ساتھ خواص اہل سلوک سے بھی غافل نہیں ہوتے تھے حتیٰ کہ اگر کسی کو اجازت
 تک دیدی ہے تب بھی اسکے ہر حرکت و سکون پر کڑی نگاہ رکھتے تھے کہ ایک انسان بڑی مشکل سے انہیں
 بتاتا ہے۔ اسکا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ — ایک جزئی غلطی پر اپنے ایک خلیفہ کو کس قدر رنج و جھنج
 فرمائی ہا رہی ہے۔ مضمون غلط سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کے کسی مجاز (خلیفہ) کے یہاں
 کوئی دوسرے صاحب ملنے گئے غالباً وہ بھی خلیفہ اور مجاز ہی تھے لیکن اول الذکر ذرا آن بان سے
 رہتے تھے اور خلافت کی ظاہری شان سے بھی متصف تھے اور ثانی الذکر ایک فانی قسم کے آدمی
 سادہ وضع بلکہ کچھ دیہاتی وضع و قطع رکھتے تھے جسکی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ انکی اجازت اور ان کے
 باطنی نظام کا علم ان اول الذکر بزرگ کو اب تک نہ رہا ہو، انھیں اول الذکر بزرگ کے نام حضرت کا
 یہ عتاب نامہ گیا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ میرے یہاں اخلاق کی درستگی کا کس قدر اہتمام رہتا ہے
 باوجود اسکے آپ نے یہ کیا کہ آپ کے یہاں ۔۔۔ صاحب گئے اور اپنا آدمی سمجھکر
 آپ سے ملے تو آپ نہایت ہی بے التفاتی اور بے توجہی سے ان سے پیش آئے
 اور انکو زجر کر دیا (یعنی کسی بات پر انکو ڈانٹ دیا)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ تعلیم و تلقین کزیسے اہل نہیں ہیں لہذا میں آپکی اجازت
 کو نسخ کرتا ہوں اور آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اب آپ میری طرف سے کسی کو تعلیم
 و تلقین نہ کیجئے اور نہ (مجھ سے) خط و کتابت رکھیئے اور نہ یہاں آنے کی زحمت
 گوراجیئے، اور دوسرے لوگوں کو بھی اس امر کی اطلاع کر دیجئے۔

(بحکم حضرت والا ۲۶ سوال شدہ) (کاپی نقل خطوط غیر مجلد)

یہ بھی حضرت مصلح الامۃ کی شان اصلاح کہ لا تاخذکم رافۃ فی دین اللہ کا گویا مکمل نمونہ تھے
 اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کے زندہ فرمانے والے تھے کہ جس میں آپ نے مسجد
 کی دیوار پر نجامہ (تھوک کو) ملاحظہ فرما کر تمام صحابہؓ سے سختی کے ساتھ مواخذہ فرمایا تھا اور مارے
 غصہ کے چہرہ مبارک سرخ ہو گیا تھا حتیٰ کہ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ گویا آپ کے رخسار مبارک پر انار
 پھوڑ دیا گیا ہو۔ — تو یہ ناراضگی اور اتنا شدید مواخذہ اسی لئے تھا کہ توقع کے خلاف معاملہ وقوع

میں آیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ کے گھر (مسجد) کی صفائی اور ستمرائی کا خیال تو ایک معمولی مسلمان کو ہونا چاہیئے چہ جائیکہ صحابی رسولؐ سے اس امر میں کیسے یہ چوک ہو گئی اور تاکہ سارے مجمع کو عبرت ہو جائے کہ اس جیسے امر سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ بس یہی منشاء حضرات مشائخ کے مواظبات کا بھی ہوا کرتا ہے جہاں نہ بد اخلاقی کا کچھ گزرا اور نہ غصہ کا کچھ سوال۔

اب آپ خود خیال فرمائیے کہ اس تحریر کا ان صاحب پر کیا اثر ہوا ہو گا پیر تلے کی زمین ہی تو نکل گئی ہوگی اور اس وقت نفس پر کیا کچھ آ رہ چلا ہو گا جب اسکی اطلاع اپنے اس حلقہ کو دی ہوگی۔ جو کل تک سر جھکائے دست بستہ شریک مجلس ہوتے ہوئے آج ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میں آپ کو کے کام کے لائق نہیں ہوں کہیں اور تشریف لے جائیے۔ بلاشبہ یہ ہے جہاد اکبر اور رجعت الجہاد الا صغریٰ الجہاد الا کبر کا صحیح مصداق۔ اصلاح نفس کچھ کھیل نہیں ہے اجازت اور خلافت کے بعد بھی انسان کے لئے اس سے غفلت روا نہیں اور کیسے ہو بھی سکتی ہے جبکہ یوسف بنی علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام یہ فرما دیں کہ وَمَا اَبْرَمٰی نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَا مَارَۃٌ بِالسَّوْءِ تو ایک امتی کس شمار و قطار میں ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے طالبین نے اللہ تعالیٰ کیلئے طریق میں ایسے ایسے ہزار نشتر برداشت کئے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اسکا صلہ تمام عطا فرمائے اور ایسے حضرات کے اخلاص کے طفیل میں ہمارے حال و بال کی اصلاح فرمادے۔

بہر حال حضرتؑ لانے بھی انکو پیش آنے والی تکلیف کا احساس فرما کر دوسرے ہی دن راقم کو حکم فرمایا کہ فلاں صاحب کو جنکو کل ایسا ایسا خط لکھا گیا ہے تم اپنی جانب سے یہ مضمون لکھ دو حضرت والا کے بتانے پر میں نے انھیں جو خط لکھا وہ یہ تھا:-

احقر (جامی) عرض کرتا ہے (اگرچہ اسکا آپ سے کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق ہے) کہ اقسام اخوت میں سے دینی اخوت سب سے زیادہ مستحکم اور قوی ہوا کرتی ہے۔ انسان کو اپنے حقیقی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنے کی توقع کم ہوتی ہے لیکن اپنے دینی بھائی اور پیر بھائی سے زیادہ (توقع اسکی رکھتا ہے) اب اس کے خلاف معاملہ دیکھ کر انسان کو جتنی بھی تکلیف نہ ہو کم ہے کیونکہ ایک ایسے محل سے اسکا وقوع ہو گا جہاں سے توقع نہیں ہوتی خاص کر اس شخص کو اور بھائی

تکلیف ہوگی جسکو مساویانہ درجہ بھی حاصل ہو۔ اس لئے آپ جیسے مرکم شناس اور
 قدرواں حضرات سے واقعی تعجب ہے کہ ایک شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے
 کے باوجود کہ یہ بھی (ہمارے) شیخ کو اخلاص کے ساتھ ماننے والا ہے اس کے
 ساتھ ایسی بے اعتنائی کیونکر وقوع میں آئی۔ رہا کسی کا ظاہری وضع میں سادہ
 اور دیہاتی ہونا تو حقیقت ہیں حضرات کی نگاہوں میں کوئی چیز نہیں لہذا بہت ممکن
 ہے کہ جسے ہم دیہاتی سمجھتے ہوں وہ بھی ہمارے ہی مرتبہ کا ہو، یہ احتمال آپ کی
 نگاہوں سے پوشیدہ رہ گیا، میرا خیال ہے کہ سب سے بڑی چوک آپ سے یہی ہوئی
 راقم جاتی، ۲۴ سوال شدہ

ملاحظہ فرمایا آپ نے ایک خاص بلکہ کہنا چاہیے کہ اخلاص ان خواص سے ایک اخلاقی لغزش پر
 کتنا سخت مواخذہ فرمایا۔ عبادت کی کمی اور کوتاہی کو حضرت معاف فرمادیتے تھے لیکن اخلاقی گراؤ کو
 بالکل برداشت نہ فرماتے تھے کہ من اخلاق ہی سے متصف ہونا تو تصوف کہلاتا ہے۔ آدمی صوفی ہو کہ
 پھر بخلق ہو حضرت اقدس کی تعلیمات میں اسکی گنجائش نہیں تھی۔

بہر حال باب اصلاح میں نہ کسی عزیز و قریب کے لئے رعایت تھی نہ خلیفہ کے لئے استثناء
 تھا اسکو حضرت والا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے اور خود کو اس سلسلہ میں خدا کے یہاں جوابدہ خیال فرماتے
 تھے اسلئے جو بھی ہوتا اسکو اس بارے میں کھرا دپر چڑھنا ہی پڑتا تھا۔
 ایک عربی مدرسہ کے ایک ناظم صاحب نے ایک جدید جماعت اور اسکے موجد کی کتابوں
 کے مطالعہ کے بارے میں حضرت سے دریافت کر لیا اسکا جواب مرحمت فرمایا گیا ملاحظہ ہو
 تحریر فرمایا کہ:-

”نہایت افسوس کی بات ہے کہ عالم ہو کر اور ایک ادارے کے ناظم و مہتمم
 ہو کر بھی حق و باطل کی اتنی تمیز نہ ہو سکی اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے
 کہ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کی کتابوں اور مواعظ کو دیکھنے سننے والا اتنا فیصلہ
 نہ کر سکے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ حضرت قدس سرہ کے مقابل یہ شخص
 آفتاب کے مقابل ایک ٹمٹماتے ہوئے چہرہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا پھر

آپ لوگوں کے دل میں اسکی اہمیت کیوں ہے؟

والسلام، وصی اللہ عفی عنہ

دیکھئے ایک جملے میں اپنے خیالات اور اس جماعت کے متعلق اپنے نظریے کی کیسی ترجمانی فرمادی جس کے لئے لوگ بڑی بڑی تصانیف لکھ ڈالتے ہیں۔ اب جو لوگ حضرت حکیم الامتؒ یا حضرت مصلح الامتؒ کے ماننے والے ہیں اور جنکو ان سے اعتقاد ہے ان کے لئے اس سلسلہ میں بس اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بزرگ سائل مدرسہ کے مہتمم تھے (حضرت سے مرید رہے ہونگے) اس لئے ایسا سخت انکو دکھا کہ آپ لوگوں کو دوسروں کی رہنمائی کرنی چاہیے اور جب آپ خود ہی ریب و تردید میں پڑ جائیں گے تو عوام کا توپڑا ہی ہو جائے گا، اپنے منصب کو سمجھئے اور اپنے علم کو بروئے کار لائیے یہ کیا کہ عوام کی طرح اس قسم کی باتوں میں آپ بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ اس طرح گویا انکو کام پرا بھارا گیا۔

حضرت اقدس کی شہرت کی وجہ سے کبھی لوگ نہایت اہم سوالات امت کی صلاح و فلاح کے سلسلے میں حضرت سے کر لیا کرتے تھے بعض فوہ سائل نبوی و جاہلت کی رو سے برا شخص ہوتا تھا لیکن حضرت والا سے وہ تو متعارف ہوتا حضرت اس سے بے تکلف نہوتے اس لئے ایسے موقع پر حضرت مصلح الامتؒ کا انداز جواب ملاحظہ ہو لکھنؤ سے ایک صاحب نے جو سکرٹریٹ میں کسی بڑے عہدے پر مقرر تھے حضرت والا کو دکھا کہ :-

”پچھلا خط میں نے خدمت اقدس میں قریب ڈیڑھ ماہ ہوا جب لکھا تھا اور اب اتنی تاخیر کے بعد دوسرا عریضہ لکھ رہا ہوں امید ہے کہ حضرت معاف فرمائیں گے حضرت کے ارشادات عالیہ سے بڑی تقویت ہوئی گو سہل پسند طبیعت ایک آسان سے نسخے کی متمنی تھی مگر حقیقت یہ وسوسہ شیطانی تھا جس سے بھرا اللہ اثر پذیر ہوا اب کوشش یہی ہے کہ عمل صالح میں زندگی کا شعار بنے، حضرت کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

یوں تو میں نے بہت سلجھی ہوئی طبیعت پائی ہے کسی چیز پر ”راسے زنی“ کہتے وقت روشن پہلو ہی سامنے رہتا ہے، غیبت کو عیب جاننا اور عیب جوئی سے

پر ہیز کرنا طبیعت ثانیہ بن چکا ہے مگر ان دنوں عجیب اکھن میں مبتلا ہوں، دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے ڈرتا ہوں، حضرت ہی اس معاملہ میں میری رہبری فرمائیں اور صحیح راستہ دکھلائیں۔

میرے خیال میں فی زمانہ مسلمان کے لئے فلاح و بہبود اس میں ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول پر عمل کرے اور خاموش زندگی گزار دے لیکن چونکہ مسلمان کا مقصد حیات یہیں نہیں پورا ہوتا بلکہ اسکے آگے منزلیں اور بھی ہیں مثلاً استقامت دین کے لئے جدوجہد سو جب وہ اس منزل کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو نہ صرف اسکی دنیوی زندگی بلکہ دینی زندگی بھی متزلزل ہو جاتی ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس راہ میں ثابت قدم رہ پاتے ہوں۔ فی زمانہ یہ فریضہ صرف علماء کے لئے محدود ہو کر رہ گیا ہے مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ انکی بڑی تعداد (الامام اشار اللہ) ایک دوسرے پر کیچڑا چھالنے کی عادی ہے ایک دوسرے کو گمراہ اور دوسرا اسے کافر تک کہنے سے نہیں چوکتا۔ نام و نمود کی خواہش، دنیا کی چاہت، خود نمائندگی اور خود پرستی۔ ریا اور غیبت کون ساعیب ہے جس کے وہ مرتکب نہیں ہوتے اپنے اپنے طور پر عوام کے سامنے نیا نیا اسلام پیش کرتے ہیں کبھی غیر مسلموں سے مناظرے ہوتے تھے اب آپس میں ہوتے ہیں وہ لڑتے ہیں اور بیچارہ مسلمان سیدھا سادہ ہکا بکار رہ جاتا ہے کون ہے جو اسکی رہنمائی کرے؟ وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ یہ باہمی فرقہ بندی، اہل قرآن اور اہل حدیث کے جھگڑے جماعت اسلامی اور دیگر علماء کا ٹکڑاؤ یہ سب کیا ہے؟ اگر دعاء و مقصد ایک ہو تو اشتراک کیوں نہیں کرتے؟ دین تو روز روشن کی طرح عیاں ہے مگر اسکے برتنے کی راہیں نت نئی بنکر سامنے آتی ہیں اور ہر رہبر اپنی برتری کا دعویدار ہوتا ہے، بیچارے عوام اندھوں کی طرح پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس طرح جماعتی کشمکش میں مبتلا ہو کر دین کی اعلیٰ قدروں سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں

اسلام کی شان تو ان سب سے بالاتر ہے۔ خواص و عوام اور عالم و جاہل سب کے سمجھنے سمجھانے کا وافر ذخیرہ ہر زمانے میں موجود رہا ہے مناسب تو یہ تھا کہ انھیں کی تشریح و توضیح کی جاتی۔ آج اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ اسلام جو اپنی سادگی کے سبب مقبول ہوا ان اغراض پرستوں کے ہاتھوں غیر مسلموں کیلئے اور گنجلک بن کر رہ گیا ہے۔

حضرت! یہ خیالات میں جو اکثر و بیشتر پریشانی کا سبب بنتے ہیں۔ سوچنا ہوں اور کڑھنا ہوں۔ صالح علماء اور بزرگان دین کی موجودگی سے انکار نہیں مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں انکا فیض عام نہیں؟ شدمیری رہبری فرمائیے اور دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ دین حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمادیں۔“

ناچیز۔۔۔۔۔

سول سکریٹریٹ - لکھنؤ

دیکھئے کتنا زبردست خلجان ہے جس میں یہ حضرت مبتلا ہیں اور ایک یہی کیا آج ایک دنیا اسی میں مبتلا ہے اسکا حل تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہم سلیم اور طبع مستقیم سے کسی کو نواز دے تو سارے خلجاناات کا خاتمہ ہو جائے ورنہ انسان تو ایک معمولی سے خار میں الجھ کر زندگی ختم کر دے اور اس سے نہ نکل سکے۔ بس حق تعالیٰ کی جانب انابت اور ان ہی سے طلب ہدایت و استقامت صحیح طریق ہے اور بالعموم اس قسم کے خلجاناات جن لوگوں کو پیش آتے ہیں انکی نظر اپنے سے زیادہ دوسروں پر ہوتی ہے، اگر وہ غلط اپنے حالات کا جائزہ لیں اور یہ سمجھیں کہ انھیں کیا ہونا چاہیے اور وہ ویسے کیوں نہیں ہیں؟ کیا کرنا چاہیے اور کیوں نہیں کر رہے ہیں تو جو رکاوٹیں وہ اپنے لئے تجویز کریں گے اسی سے انشاء اللہ تعالیٰ دوسروں کا حال معلوم کر سکیں گے۔ پھر اپنے پر تو اختیار رکھی ہے جب ہم نہیں درست ہو رہے ہیں تو دوسروں کا کیا شکوہ ان پر تو ہمارا اختیار بھی نہیں ہے لیکن حضرت دالانے اس نوع کا کوئی جواب انھیں نہیں مرحمت فرمایا بلکہ تواضع کی خاطر شان کے ساتھ انکی عقیدت کو ٹٹولا کہ مجھ سے جو یہ بات دریافت فرما رہے ہیں تو میرے کہنے کی تصدیق بھی کریں گے؟ مجھ پر اعتماد رکھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ بدون اعتقاد اور اعتماد

کے کسی کی کوئی بات نہ واقع ہوگی نہ لائق عمل پھر سوال و جواب سے فائدہ بہ بہر نفع حضرت اقدس نے ان صاحب کو جو جواب مرحمت فرمایا وہ ملاحظہ فرمائیے، انکو لکھا کہ :-

”آپ کا عنایت نامہ ملا اسکو پڑھ کر آپ کے خلیفان کا علم ہوا آپ نے اس سلسلہ میں مجھ سے جو رہبری کی خواہش کی ہے اور صحیح راستہ دکھانے کی خواہش کی ہے یہ محض آپ کا حسن ظن ہے میں آپ سے بیخ عرض کرتا ہوں کہ اپنے کو اسکا اہل نہیں سمجھتا لیکن آپ کی اس طلب پر یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ اس قسم کے اہم سوالات بذریعہ تحریر حل ہونے نہایت دشوار ہیں لہذا اسکا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق متدین عالم کی خدمت میں جا کر ان سے زبانی حل کر لیا جائے بشرطیکہ اپنا اعتقاد ہو اور انکے کہنے پر اعتماد ہو اور ایسے حضرات کا وجود اب بھی بحمد اللہ معدوم نہیں گو کم ہے یوں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور اپنے نیز جملہ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے آپ سے کبھی دعا کا طالب ہوں والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ“

میں نے ابھی اوپر جو عرض کیا کہ ایک ہی بزرگ نہیں بلکہ آج ایک دنیا اسی الجھن میں گرفتار ہے کہ آخر جب ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی ہدایت، کتاب و سنت موجود ہے اور اسکے پیش کردہ علمائے حق بھی ہیں تو پھر امت کو ہدایت کیوں نہیں ہوتی؟ اسکا جواب ہر دور میں مشکل رہا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی جسکی فہم و بصیرت کھول دے اسی کیلئے تو آسان ہے باقی ہر شخص کو اس سلسلہ میں جلدی اور بآسانی مطمئن کرنا مشکل ہے۔ اسی ضیق کو حضرت مصلح الامۃ نے ایک موقع پر بیان کر کے اسکے ازالہ کی سعی فرمائی ہے۔ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ :-

”یہ زمانہ جہالت و گمراہی کا ہے لوگ اپنے باپ دادا کے رسمی دین کے پابند ہو گئے ہیں اب ایسے وقت میں انکو صحیح اور حقیقی دین پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ انکو پہلے دین سمجھایا جائے اور انکے شک و شبہات کو دور کیا جائے اور اس میں انکے فہم اور استعداد کی رعایت کرنی ہوگی مختصر اور اجمالی کلام ان کے لئے

مفید نہیں ہوگا چنانچہ میں کرتا ہوں کہ ایک بات کو خواہ مکرر کر رکھوں نہ کہنا پڑے کہتا ہوں اور کوشش اس امر کی کرتا ہوں کہ اپنی بات لوگوں کو سمجھا دوں اور اسکے ذہن نشیں کرادوں اخبار صدق میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا ایک مضمون دیکھا چونکہ وہ مجھ سے محبت فرماتے ہیں اور میری باتوں کو پسند فرماتے ہیں اسلئے کبھی میرے متعلق اور کبھی میری کسی بات کے متعلق کچھ تحسینی کلمات نقل اور شائع فرما دیتے ہیں، مولانا تو ایسا اپنی محبت کی بنا پر فرماتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ نقل در نقل ہو جانے کے بعد اور اختصار کے باعث میری پوری بات واضح نہیں ہو پاتی اور اسکا پورا فائدہ بھی مرتب نہیں ہو پاتا مثلاً مسلمانوں کے موجودہ حالات کے سلسلہ میں میں نے کبھی یہ کہا ہوگا کہ اسکا علاج بس ایک ہی ہے اور اسکے سوا دوسرا علاج نہیں اور وہ ہے ایمان و اتباع **إِلَّا تَأْتِيَهُمُ الْغِيَاثُ مِنْ رَبِّكَ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ** وَلَهُمْ يَجْزُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ يَعْنِي جو لوگ اللہ کے ولی ہیں انکو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ لوگ غمگین ہونگے ولی کون لوگ ہیں اسکے متعلق فرماتے ہیں کہ **الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ** دیکھئے اس میں ولایت کا طریق ایمان اور تقویٰ ہی کو فرمایا گیا ہے اور اسکا ثمرہ فلاح دارین کو ارشاد فرمایا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں **إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ** اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے طریق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں منحصر فرما دیا ہے تو یہ ایمان و اتباع خود قرآن میں موجود ہے اور مسلمان اسکا مکلف ہے کہ وہ اس پر عمل کرے اور اسی پر فلاح کا وعدہ ہے۔

لیکن جس طرح ایمان و اتباع لفظوں میں مختلف ہو سکتا ہے یا مراد میں نہیں ہے کیونکہ مراد اس سے ایمان کامل اور اتباع کامل ہے اور ناقص ایمان اور ضعیف ایمان اور ناقص اتباع اور تارک اتباع مراد نہیں — پس یہیں سے لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ اتنے مسلمان موجود ہیں اور نماز روزہ بھی کر رہے ہیں مدارس و مساجد بھی آباد ہیں پھر بھی ہم اپنے کو کامیاب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں بیشک مسلمان موجود ہیں لیکن ہم میں سے آج کتنے ہیں جو کامل ایمان اور کامل اتباع ہیں اور کامل ایمان ہونا

تو بجائے خود ہر آج کتنے میں جو ایمان کے صحیح مفہوم سے واقف ہیں۔ ایمان کے معنی لوگ بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو زبان سے پڑھ لینا لیکن آپ کے علماء یہ فرماتے ہیں کہ ایمان نام تصدیق قلبی کا ہے۔ شامی میں ہے کہ الایمان وهو التصدیق بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم فی جمیع ما جاء به عن اللہ تعالیٰ مما علم جبرئیلہ ضرورتاً یعنی ایمان اس کا نام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیزیں خدا تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں جن کا ہمیں یقینی طور پر علم بھی ہے ان سب میں آپ کی دل سے تصدیق کیجاوے اور تمام امور میں تصدیق کیجاوے آج ایمان کے معنی کتنے لوگوں کو معلوم ہیں اور جنہیں معلوم ہیں ان میں سے کتنوں کا عمل پیر ہے دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں لوگ انہیں مسلمان سمجھتے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو اس سے باہر نہیں سمجھتے ہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ ان کے اقوال و افعال و حالات ایسے ہیں کہ جن کا اسلام کے ساتھ جوڑ لگانا مشکل ہے خدا کا انکار، رسالت کا انکار، آخرت کا انکار۔ دین و اہل دین کے ساتھ استہزاء و تمسخر، مذہب کی چیزوں سے مذاق، ان سب چیزوں کی اسلام میں کہاں گنجائش ہے ایسے لوگ اس زمانے میں بہت ہیں اب انکی اصلاح محض اتنی بات سے نہ ہوگی کہ آپ ایک مضمون اخبار میں نکال دیں بلکہ کام کا طریقہ وہی متعین ہے جو ہمارے اسلاف نے کیا کہ جس بات کی ضرورت سمجھی اپنے پاس آنے جانے والوں کو مختلف عنوان سے اور مختلف اوقات میں سمجھا دیا۔ اخبار وغیرہ کو اس زمانہ میں پوچھتا کون ہے اس مبتذل شاید کوئی چیز ہو آج آپ کے مکان میں ہے کل بننے کی دوکان میں۔ غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس ایمان کو سبب فلاح کہا گیا ہے اس سے مراد ایمان کامل ہے اور اسکے لئے ضروری ہوگا کہ جن چیزوں سے اصل ایمان میں خلل پڑے ان سے اجتناب کیا جائے یعنی جو چیزیں مفسرت تصدیق ہیں ان سے بچا جائے اسی طرح جو چیزیں کمال ایمان میں مخل ہوں ان سے بھی اپنے کو بچایا جائے اور وہ ہے اتباع شہوات قرآن شریف میں اسکی بھی مذمت وارد ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ عَذَابًا (پس ان لوگوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ہوئے جنہوں نے کہ نمازوں کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی اتباع کی عنقریب لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے)

اور یہ اتباع کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ ایمان ہی کی فرع ہے جسقدر ایمان کامل ہوگا اسی قدر اتباع کامل ہوگا اور جتنا ایمان میں ضعف ہوگا اسی قدر اتباع میں نقص ہوگا اب اتباع کا مصداق تو بہت ہی مشکل ہے اسکا مفہوم بھی لوگ نہیں سمجھتے اتباع کہتے ہیں پیروی کرنے کو اور پیروی احکام کی ہوا کرتی ہے اور اسکے لئے شرط ہے ترک منازعت، ترک رائے و عقل۔ جسکی اتباع کرنا چاہتا ہے اسکے آگے اپنی رائے و عقل کو دخل دینا یہ منافی ہے اتباع کے اتباع اس سے فوت ہوتا ہے لہذا جب کہا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح اتباع دین میں ہے تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ حکم شریعت کے آگے اپنی رائے اور اپنی عقل کو قطعی دخل نہ دے کیونکہ عقل کی تقدیم شرع پر جائز نہیں۔

شیخ اکبر فتوحات میں فرماتے ہیں:-

من اراد الدخول الى فهم غوامض الشريعة وحل مشكلات التوحيد فليترك ما يحكم به عقله ورأيه ويقدم بين يديه شرع ربه

جو شخص شریعت کے غوامض کو سمجھنے کا ارادہ کرے اور توحید کی مشکلات کو کشف کرنا چاہے تو اسکو چاہئے کہ اپنی عقل اور رائے کے حکم کو ترک کر کے اپنے رب کی شریعت کے آگے زانو ٹیک دے۔

بید یہ شرع ربه

اسی طرح پر کشف وغیرہ کی تقدیم بھی شرع پر جائز نہیں ہے۔

واعلم ان تقديم الكشف على النص ليس بشئ عندنا لكثرة اللبس على اهله و الا الكشف الصحيح لا يأتي قط الاموافقا لظاهر الشريعة فمن قدم كشفه على النص فقد خرج من الانتظام في مسلك اهل الله اولئك

جانو کہ کشف کی تقدیم نص پر ہمارے یہاں تو اس کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ اہل کشف کو التباس بکثرت ہوتا ہے ورنہ تو کشف صحیح ظاہر شرع کے موافق ہی ہوا کرتا ہے۔ پس جس نے کشف کو نص پر مقدم کیا وہ اہل اللہ کے مسلک سے خارج ہوا اور یہی لوگ ہیں جو عمل کی رو سے خسارہ

اخسرین اعمالاً (دفعۃً بطری) میں پڑے ہوئے ہیں۔

تو میں نے اپنے کلام میں جس ایمان و اتباع کا ذکر کیا ہے اس سے مراد ایمان و اتباع کامل ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آج اگر مسلمان دین کے تمام شعبوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر لیں اور آپ کی اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لیں تو انکی حالت آج بھی بدل سکتی ہے طبیب کا کام تشخیص مرض اور تجویز نسخہ ہی ہے باقی صحت کے لئے دوا کا استعمال تو مریض ہی کو کرنا ہوگا اگر کوئی مریض نسخہ حاصل کر کے دوا کا استعمال نہ کرے تو اس میں طبیب کا قصور نہیں۔ ہاں وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ دوائیں کہاں ملیں گی اور اسے کس طرح تیار کیا جائے کوئی نا صبح اور شفیق طبیب ہوگا تو اسے بتا دیگا جب علاج جسمانی کا یہ حال ہے تو اسی طرح علاج روحانی کو بھی سمجھا جائے۔ اب اس پر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تشخیص کی صحت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے سوال یہ ہے کہ پھر اس پر عملدرآمد کیوں نہیں ہوتا؟ اسکا یہ کہنا صحیح نہیں اور نہ علماء اسکے ذمہ دار ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جس طرح اس تشخیص کی صحت میں مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا اسی طرح ایمان و اتباع کی تحصیل اور اپر عمل درآمد میں بھی کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا اس چیز کو اس کیوں علیحدہ کر دیا گیا۔ باقی عمل جو نہیں ہوتا تو اسلئے کہ ایمان میں ضعف اور نقص پیدا ہو گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ عوام سے ان کے اس مرض کو بیان بھی نہیں کیا جاتا ظاہر ہے کہ جب انکو اپنے مرض ہی کا علم نہ ہوگا تو اس سے نکلنے کی کیا فکر کریں گے البتہ قاضی ثنار اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں آیت "وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا" اور اللہ تعالیٰ نے کافرین کیلئے مومنین پر غلبہ کی کوئی سبیل ہی نہیں رکھی، کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ مراد اس سے آخرت میں غلبہ ہے یا باعتبار حجت اور دلیل کے غلبہ ہے اور ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ مومنین سے مراد اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ ان پر کفار کو ظاہری غلبہ بھی نہ ہو سکا بلکہ وہی غالب رہے اور اسکے بعد لکھتے ہیں و اما ظهور الکافرین علی المؤمنین فی ہذ الزمات فلضعف ایمانہم و کثرة عصبیانہم (ص ۲۵۷) (باقی آج جو کفار بظاہر مسلمانوں پر غالب نظر آتے ہیں تو یہ مغلوبیت ان کے ضعف ایمان کی وجہ سے اور حق تعالیٰ کی نافرمانی کی کثرت کی وجہ سے ہے)

عہ۔ "کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ دراصل یہ حملہ مولانا عبدالمجید صاحب کا ہے جو انہوں نے مولانا عبدالباقی صاحب کے ایک مضمون میں آئے ہوئے فقرے کے اس قول پر کہ علاج بس یہی ہے ایمان و اتباع بطور بیمار کے تحریر فرمایا تھا کہ "تشخیص کی صحت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے مگر الخ" جو صدق میں طبع بھی ہو چکا ہے اور معروف حق میں بھی نقل ہے۔ جامی

اسی طرح سے لاعلی قاری بھی مراقبہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان
 ہمہ اخوان الزمان قد قصرت وجہادہم فی تحصیل العالوم لاسیما
 فی هذا الفن الشریف ضعت وهو مقتضى الوقت الذى تجاوزت
 الالف وبقي ضعف العلم والعمل بل ضعت الايمان على ضعف والله
 ولی دینہ وناصر نبیہ (بلاشبہ اس زمانے میں لوگوں کی ہمتیں قاصر ہو گئی ہیں اور
 علوم دینیہ کی تحصیل میں انہی کوششیں ضعیف ہو چکی ہیں خصوصاً اس شریف فن (یعنی
 علم حدیث کی تحصیل میں) اور ایسا ہو جانا وقت کا تقاضا بھی ہے کہ آج (نبی کا زمانہ
 ہزار سال سے متجاوز ہو چکا ہے اور علم و عمل کا ضعف موجود ہے بلکہ مزید براں ایمان کا
 ضعف بھی ہو گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ہی اپنے دین کا متولی اور وہی
 اسکا محافظ ہے۔)

عمل ایمان کے تابع ہے آدمی ایمان ہی کی وجہ سے عمل اختیار کرتا ہے اسی کو
 کسب کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو اسکی طاقت سے زیادہ کامکلف نہیں بنایا ہے
 جو جیسا کرے گا ویسا اسکو بھگتنا پڑے گا لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ
 وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اسکی طاقت سے زیادہ کامکلف نہیں بنایا ہر نفس کے حق میں اسکے اعمال خیر
 نفع بخش اور اعمال سُورِ مضر ہو گئے) لہذا طریقہ تو فلاح کا ایمان و اتباع ہی ہے ہاں یہ البتہ آپ درپست
 کر سکتے ہیں کہ یہ چیز حاصل کیسے ہو؟ تو اسکے متعلق سنئے :-

اسکا طریقہ صحبت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات مشائخ
 اس باب میں آپ کے نائب ہیں ان حضرات کی خدمات میں جانے سے غرض ہی
 یہ ہوتی ہے کہ آدمی نفس اور شیطان کی منازعت سے چھوٹ جائے اور نصوص کی
 اتباع کرنے لگے کیونکہ اتباع کا جذبہ اور شوق اس حالت کا ثمرہ ہے جو بزرگوں
 کی صحبت سے انسان میں پیدا ہوتی ہے حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب دہلوی
 شاگرد رشید حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور خلیفہ حضرت مرزا مظہر جاں جانا
 کا یہ ارشاد جو انھوں نے ارشاد الطالبین میں نقل فرمایا ہے ہمارے اس دعویٰ پر شاہد ہے

فرماتے ہیں :-

”بے شمار لوگوں کی ایک جماعت نے جبکا جھوٹ پر متفق ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اسکا ہر فرد بشر تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں ۱۱ ایسی جماعت (زبان قلم سے اور قلم زبان سے خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت کی وجہ سے جنکی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے عقائد وفقہ کے سوا جن سے وہ انکی صحبت سے پیشتر بہرہ یاب تھے، باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمالِ صالحہ کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہو گئے ہیں۔ یہی حالت ہے جسکو کمال کہنا چاہیے اور یہی حالت بہت سے کمالات کی موجب ہے“

دیکھا آپ نے علماء نے مشائخ کی صحبت کے کس قدر فوائد بیان فرمائے ہیں اس میں شک نہیں کہ جس کو جو کچھ ملا ہے صحبت ہی سے ملا ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو امت پرتر حاصل ہے تو اسی صحبت کی وجہ سے۔ لیکن یہاں یہ سمجھنا ضروری ہو گا کہ جس طرح صحبت نیک مفید و نافع ہوتی ہے اسی طرح سے صحبت بد مضر بھی ہوتی ہے علماء نے لکھا ہے کہ صحبت نیک بہتر از کار نیک اور صحبت بد بدتر از کار بد، چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث نقل کی ہے

عن جابر بن عبد اللہ مرفوعاً وموقوفاً حضرت جابر بن عبد اللہ سے مرفوعاً وموقوفاً

الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ اندہ قال دونوں طرح سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر عالم کے پاس نہ بیٹھا کرو لا تجلسوا عند کل عالم الا عالم یدعوکم من خمس الی خمس، من الشاک الی الیقین بجز اسکے جو تم کو پانچ چیزوں سے نکال کر پانچ چیزوں سے ومن الریاء الی الاخلاص ومن الرغبة الی الزہد ومن الکبر الی التواضع ومن الی الزہد ومن الکبر الی التواضع ومن المعدادۃ الی النصیحة (فاتحۃ العلوم للغزالی) تواضع کی طرف اور عداوت سے نصیحت کی طرف

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عالم کی صحبت بھلی نہ اختیار کر لینا چاہیے۔ اسی مضمون کو حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ نے اپنے رسالہ بیعت میں بھلی بیان فرمایا ہے ”اُنکھتے ہیں کہ :-

”وہم جنیں بقول عالمی عمل کردن موجب تیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر و صحیح الحواس نمی باشد“

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کس قدر تیز فرمایا ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر عالم صحیح الفکر و صحیح الحواس بھی نہیں ہوتا اب ظاہر ہے کہ جب مقتدی و متبوع کا یہ حال ہوگا تو جو شخص اسکا اتباع کرے گا اسکو بھی بدحواسی ہی ملے گی اسلئے صحبت اختیار کرنے کیلئے اور کسی کا انتخاب کرنے میں تیقظ سے کام لینا چاہیے۔“

حدیث شریف میں اہل اللہ کے یہ اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں :-
 خيارکم من ذکرکم باللہ ویتہ تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں کہ جنکی زیارت
 وزاد علمکم منطقہ و رغبتکم تمہیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے اور جنکا تکلم فرمانا
 فی الآخرة عملہ (جامع صغیر ج ۲) تمہارے علم کو بڑھائے اور جنکا عمل (طور طریقہ) تمہارے
 اندر آخرت کا شوق پیدا کرے۔

علامہ عبدالرؤف منادی نے فیض القدیر میں اسکی نہایت عمدہ شرح فرمائی ہے
 اسکو بعینہ نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ
 ہذہ کلمۃ النبویۃ وافق فیہا یہ کلمات نبویہ ہیں جنہیں ہمارے نبی اکرم صلی اللہ
 نبینا عیسیٰ علیہما السلام قال علیہ وسلم نے حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی مولا
 ابن عیینہ قیل لعیسیٰ یا روح اللہ فرمائی ہے۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
 من نجالس قال من یرید فی علمک سے سوال کیا گیا کہ یا روح اللہ ہم کس کے پاس
 منطقہ و یریدکم فی الآخرة عملہ بیٹھا کریں فرمایا کہ جسکا کلام تمہارے علم کو اور جسکی
 زیارت اللہ تعالیٰ کی یاد کو اور جس کا علم تم میں
 قال الحکیم امل الذی یرید آخرت کے شوق کو زیادہ کرے (ایسا شخص

لاق صحت ہے)

حکیم ترمذی کہتے ہیں کہ بہر حال وہ لوگ جنکی
رویت اللہ تعالیٰ کی یاد دلائے سودہ میں کہ جنکے اوپر
حق تعالیٰ کی جانب سے کچھ ظاہری علامات ہوں
مثلاً یہ کہ ان کے ظاہر پر بھی جلال کا نور، کبریائی کی
ہیبت اور انس و قار کا رعب چھایا ہوا ہوگا چنانچہ
جب کوئی دیکھنے والا انکو دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ
کا یاد آجانا ناگزیر ہوگا اسلئے کہ وہ اسکے اوپر ملکوت
کے آثار مشاہد کرے گا۔ پس اولیاء اللہ کی یہی
صفات ہوتی ہیں کہ ان حضرات کے قلوب ان
ایشیاء کا خزانہ ہوتے ہیں اور مستقر اور مرکز۔ اور
چہرہ بھی قلب کے پانی سے سیرابی حاصل کئے
ہوتا ہے۔ لہذا جبکہ ان کے قلوب پر حق تعالیٰ
کے وعد و وعید کا نور مستولی ہوتا ہے تو کبھی اس
میں سے کچھ چہرہ پر بھی پھلک پڑتا ہے تو جب
تمھاری نظر اس پر پڑتی ہے تو وہ تمھیں بھی بہرہ
تقویٰ کی یاد تازہ کرا دیتی ہے اور تمھارے قلب
میں بھی صلاح اور علم کا ایک رعب اور ہیبت پڑ جاتی
ہے نیز تمکو اسکی وجہ سے حق اور صدق کی
بھی یاد آ جاتی ہے جس کے سبب تم پر ان حضرات
کی استقامت کا ایک دبدبہ چھا جاتا ہے اور
جب حق تعالیٰ کے سلطان کا نور مذکورہ بالا طریق
سے ان پر جلوہ فگن ہوتا ہے تو وہ تمھیں اللہ تعالیٰ

باللہ رویتہ فہم الذین علیہم من
اللہ سمات ظاهرة قد علاہم بہما
نور الجلال و ہیبتہ الکبریاء و انس
الوقار فاذا نظر الناظر الیہ ذکر اللہ
لہا یری من آثار الملکوت علیہ فہذا
صفة الاولیاء فالقلب معدن
ہذہ الاشیاء و مستقر نور
و شرب الوجہ من ماء القلب
فاذا کان علی القلب نور سلطان
الوعد و الوعید تاویح
الی الوجہ ذالک النور
فاذا وقع بصرک الیہ ذکرک
البر و التقوی و وقع علیک
مہاتبہ الصلاح و العلم و
ذکرک الصدق و الحق فوق
علیک مہابتہ الاستقامة
واذا کان نور سلطان اللہ علی
وجہ تادی ذکرک عظمتہ جلالہ
وجمالہ و اذا کان علی القلب
نورہ و ہو نور الانوار تمھنک
رویتہ علی النقائص فشان
القلب ان یسقی عروق الوجہ
و یشرقہ من ماء الحیاء الذی

یرطب بہ و تبادعی الی الوجہ کے جلال و جمال عظمت کی یاد تازہ کر دیتا ہے پھر
 منہ ما فیہ لا غیر ذالک پھر جب قلب میں یہ نور آجاتا ہے جسکو نور الانوار
 فکل نور من ہذہ الانوار کہنا چاہیے تو اسکا مشاہدہ تم سے نقائص کا خاتمہ ہی
 کان فی قلب فشربہ و جبہ کر دیتا ہے پس قلب کا حال یہ ہوتا ہے کہ
 منہ فاداسی القلب یرضی ان حضرات کے چہرے و بشرے کی رگیں بھی
 اللہ عن العبد و بما یشرف اسی آب حیات سے سیراب ہوتی ہیں اسکے غیر
 بہ صدرہ عن وجہہ سے نہیں جن سے قلب نے شادابی حاصل کی
 نضرۃ و سرورا و امارۃ اور خود سیرابی حاصل کرنے کے بعد چہرے کی
 العالم فتزید فی منطقہ جانب جسکو بڑھا دیا ہے، تو جب قلب کو اس
 لانہ عن اللہ ینطق بندے سے اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی
 فالناطق صنفان اور جس چیز سے اسکا سینہ منور ہوا ہے اسکی مسرت
 صنف ینطق بالعلم حاصل ہوتی ہے تو اسکے چہرے سے کھلی تروتازگی
 عن الصحیف حفظاً اور خوشی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں رہا یہ کہ عالم کی
 وعن افواہ الرجال رویت کھلی تو انسان کی گویائی کو بڑھا دیتا ہے
 تلقفا فالذی ینطق تو یہ اسلئے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ناطق
 عن الصحف والافواہ ہوتا ہے۔ پس ناطق کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ناطق
 انما یلج آذانہم جو علم کی باتیں اپنی یاد کی بنار پر کتابوں کے حوالے سے
 عریان بلا کسوة یا لوگوں کے منہ سے سنی ہوئی بیان کرتا ہو تو جو شخص
 لانہ لم یخرج اس طرح سے کتب سے اور لوگوں سے شکر بیان کرتا
 من قلب نورانی ہے تو اسکی باتیں لوگوں کے کانوں میں عریاں یعنی
 بل من قلب دنیئ بلا لباس کے داخل ہوتی ہیں اسلئے کہ یہ باتیں کسی نورانی
 و صدر مظلم مغشوش قلب سے نہیں نکلی ہوتیں بلکہ ایک گندہ قلب اور
 ایمانہ یحب الریاستہ تاریک سینہ اور ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہوئی

والعز والشح علی
المحطام و نفسه قد
استولت علی قلب
نیاز ع الله فی ردائه
والذی ینطق عن الله
انما یلج اذ ات
السامعین بالکسوة
التي تخرق کل حجاب
وهو نور الله خرج
من قلب مشحون
بالنور و صوره
مشرق به فیخرق
قلوب المخلطین
من رین الذنوب
وظلمة الشهوات
و حب الدنيا الخلفه
الی نور التوحید
فاشاره کجمره و صلتها
النفحة و التهبته ناراً
فاضاء البیت -
وما قوله ینیدکم
فی العلم منطق فاسته اذ
نطق نطق بالاء الله و صنعه

ہوتی ہیں جسکے ایمان میں عجب ریاست، جاہ و
شہرت اور حکام دنیا سے غایت تعلق و الفت
کے کھوٹ کی آمیزش بھی موجود ہوتی ہے اور
جسکا نفس اسکے قلب پر غالب آکر اسکی رواد
(یعنی کبریا) میں منازعت کرتا ہے۔ باتنی وہ
ناطق جو ناطق عن اللہ ہوتا ہے تو اسکا کلام سامعین
کے کانوں میں لباس سے نرین ہو کر اس طرح سے
داخل ہوتا ہے کہ ہر حجاب کا پردہ چاک کر دیتا ہے
اور کیوں نہ ہو وہ ہوتا کھلی تو ہے اللہ تعالیٰ کا نور
جو نور بھرے قلب سے نکلا ہوتا ہے اور اس
تسکلم کا سینہ اسکے کلام کے لئے بمنزلہ مشرق
کے ہوتا ہے (جس طرح سے اس سے سورج نکلتا
ہے اسی طرح سے یہاں کلام) تو اسکا اثر یہ ہوتا ہے
کہ جن لوگوں کے قلوب میں ایمان و عمل صالح کے
ساتھ ساتھ معصیت کا رنگ اور شہوات کی ظلمت
اور عجب دنیا کی تاریکی موجود ہوتی ہے اسکا پردہ
چاک کر کے اسے نور توحید سے منور کر دیتا ہے
اسکی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے کوئی چنگاری ہو اور
اسپر پھونک پڑے تو اسکی وجہ سے اس سے آگ
کی بیٹیں نکلنے لگیں اور سارا گھر روشن ہو جائے۔
بہر حال یہ جو فرمایا کہ اسکے کلام سے تمہارے
علم میں زیادتی ہوگی تو یہ اسلئے کہ وہ جب گویا ہوگا
تو اللہ تعالیٰ کے انعامات و مناعات ہی کے متعلق

فہذا اصل العلم والعلم کلام کرے گا اور یہی اصل علم ہے اور جو علم کہ
الذی فی ابدی العامة عام لوگوں کے پاس ہے وہ اسی کی فرع ہے
فرع هذا والآء اللہ ما اور اللہ تعالیٰ کی الآء سے مراد وہ چیزیں ہیں جنکو
ابدی من وحدانیتہ وہ عالم اسکی وحدانیت اور فردانیت میں سے
وفردانیتہ کالجلال و ظاہر کرے مثلاً حق تعالیٰ کے جلال و جمال عظمت
الجمال والعظمة و وہیت - بہار و کبریاء - سطوت و سلطنت اور عزت و
الهیة والكبرياء والبهاء وقار جو کہ اسکے اولیاء کے قلوب پر ہوتی ہیں -
والسلطان والعز والوقار باقی یہ ارشاد کہ اسکے عمل تکملاً آخرت کی ترغیب
علی قلوب الاولیاء دے تو یہ اس لئے کہ اسکے علم پر نور ہوتا ہے اور
واما قوله یرغبکم فی اسکے اعمال پر خشوع ہوتا ہے اور اسکے ان چیزوں
الآخرة عملہ فلان علی میں تصرف کرنے میں عبودیت ہوتی ہے - اور
عملہ نوراً و علی ارکانہ رونق و وقار تر و تازگی اور حلاوت جو ہوتی ہے
خشوعاً و علی تصرفہ مزید براں - تو جب کوئی دیکھنے والا ایسے شخص کو
فیما صدق العبویۃ مع دیکھتا ہے تو اپنا عمل اور اپنا نفس اسکی نگاہوں میں
بہار و وقار و طلاوت حقیر معلوم ہونے لگتا ہے (اسلئے وہ اس میں اور
وحلاوت فاذا رآہ الرائی کوشش کرتا ہے تاکہ اسکو آخرت کا توشہ بنا سکے
تقاصر الیہ عملہ ونفسہ - رہے علماء دنیا تو ان کے اعمال میں یہ نور نہیں ہوتا
واما علماء الدنیا فلیس اور نہ ایسی رونق ہوتی ہے اسلئے کہ وہ جو کرتا ہے
لاعمالہم ذلک النور والبهاء لانہ کسی لایح یا ڈر سے کرتا ہے جنت کی لایح ہوتی ہے
علی الرغبة والرہبۃ لانہ رغب فی اور وعدہ خداوندی کی اور وعیدیں اسکی آنکھوں کے
الجنہ والوعد والوعید نصب عینہ سامنے ہوتی ہیں پس انھیں کی مدد سے اعمال کو ادا
فیستعین بذلک علی نفسہ حتی یقیمہا کرتا ہے -
واما اهل الیقین فاذا اور اہل یقین کے سامنے جب کوئی حکم طاعت

عرض لهم نارت قتلو بهم آتا ہے تو ان کے گلوب میں اتناں کا شوق اور
 من الشوق اليه والحب فعاملو خدا کی محبت کا ایک جوش ابھرتا ہے جسکی وجہ سے
 علی بشر و طيب نفس فاذا وہ نشاط طبع اور خوش مزاجی کے ساتھ کام کرتے
 عرض لهم ذنبة عرقت میں اور اس درمیان میں اگر کسی پرانی کا دوسوہ
 جباهم حياء منه فشتان آتا ہے تو انکی پشانی پر خدا سے شرم کی وجہ سے
 ما بين عبدین احدهما يعمل پس ان دونوں انسانوں میں
 لمولاه ولولا خوفه من کتنا تفاوت ہے کہ ایک تو عمل کرتا ہے اپنے
 وعيده و حرمان وعده مولیٰ کے لئے لیکن اگر اسکا خوف نہ ہو کہ سزا دیگا
 ماعمل - و آخر يعمل مولاه یا انعام نہ لے گا تو پھر یہ عمل نہ کرتا - اور دوسرا شخص
 تذللًا وتخشعًا ومحبة له ایسا ہے کہ وہ بھی اپنے مولیٰ کے لئے کام کرتا ہے
 القار نفسه بين يديه مگر بطور عاجزی کے اور خشوع کے اور اسکی محبت
 وشغفًا به لا يستويات کے تقاضے سے اور اسکے سامنے پیشی کا خیال
 (ص ۴۶ فیض القدير للنادی) کر کے اور ایک شغف اور انہماک کے ساتھ ظاہر ہے

کہ یہ اور وہ کب برابر ہو سکتے ہیں۔

بیان یہ کر رہا تھا کہ دطن میں حضرت مولانا کا دینی کام اس نوع سے جاری تھا
 کہ عوام کی جانب الگ مستقل توجہ تھی، خواص یعنی طلبہ اور مدرسین حضرات میں سے جو لوگ
 حضرت سے وابستہ تھے ان پر کڑی نگرانی تھی، پھر سادکین میں سے جو لوگ اخص خواص
 کا درجہ رکھتے تھے یعنی خلفاء مجازین حضرات انکے اخلاص و خلق اور معاملات کا مسلسل امتحان
 لیا جا رہا تھا (جیسا کہ سابق صفحات میں ناظرین کے ملاحظہ سے ابھی گزرا) نیز ملک کے خدام
 قوم قسم کے وہ صاخر افراد جو مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت اور انکی پستی کو دیکھ دیکھ کر خون
 کے آنسو روتے تھے اور انکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ قوم کو اسکی اس موجودہ بیماری سے شفا کی کیل
 اختیار کی جائے ایسے حضرات بھی کبھی کبھی بزرگوں سے بھی رجوع فرما لیتے تھے اور اپنی
 دل کی لگن بلکہ گھٹن بیان کر کے اسکا مدد و اطلب فرماتے تھے اسکا بھی نمونہ پیش کیا جا چکا ہے

(ہو سکتا ہے کہ بعض باتیں ان امور میں سے متجہر سے تشریف لے جانے کے بعد کی ہوں کیونکہ تاریخ کا اہتمام نہیں رکھا گیا) بہر حال مقصود صحت نمونہ دکھلانا تھا کہ اس طور پر حضرت اقدس کی زندگی مشاغل کثیرہ میں گھری رہتی تھی کسی وقت سکون نہ رہتا تھا اور جب قوم کا اتنا درد کسی کے قلب میں ہوتا ہے کہ وہ انکے لئے اپنا شب و روز ایک کر دے نہ دن کو راحت نہ رات کو چین و سکون کی نیند نصیب ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اسے محبوب خلایق بنا دیتے ہیں۔ حضرت اقدس کی گوشہ نشینی کی زندگی اعلان و اشتہار سے پاک، تصانیف بھی جو ہوئیں تو وہ دوسروں کی درخواست بلکہ اصرار پر شایع ہوئیں اور پھر اسکے بعد عرب و عجم میں آپ کا شہرہ اور چرچا سن لیجئے یہی ہے وہ مقبولیت عامہ جو خدا تعالیٰ کی جانب سے محض ایک موہبت ہوتی ہے کسی کوشش اور طلب اور جد جہد سے ہاتھ نہیں لگا کرتی ہے

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدا سے بخشنده

اسی مضمون کے بیان کے سلسلہ میں لکھنؤ سکریٹریٹ کے ایک صاحب کا خط بھی نقل کیا تھا جس میں آخر سے کچھ قبل انھوں نے لکھا تھا کہ — "اگر مدعا مقصد ایک ہے تو اثر اک عمل کیوں نہیں؟" — یعنی اپنی اس غلط کو بیان کرنا چاہا بلکہ اسکا تسلی بخش جواب معلوم کرنا چاہا تھا کہ جب تمام دینی جماعتوں کا مقصد ایک ہے تو پھر ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ کیوں بنائے ہوتا ہے اور جب اتنے کہنے والے موجود ہیں تو قوم کی حالت سدھرتی کیوں نہیں نظر آتی؟

راقم کو یہاں اسی نوع کا ایک اور بزرگ کا سوال یاد آگیا جو انھوں نے حضرت اقدس سے براہ راست نہیں کیا لیکن حضرت والا کے ایک مضمون کو اپنے اخبار میں نقل کر کے اس جملے میں جو حاشیہ لکھا تھا وہ اسی کے قریب قریب تھا "ان لکھنؤ می صاحب کے خط کا جو مضمون ہے وہی حضرت کا مضمون تھا اور صدق میں مولانا عبدالباقی صاحب نے اسی کا کچھ حصہ نقل فرمایا تھا جس پر مولانا دریابادی کا حاشیہ تھا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا عبدالباقی صاحب ندویؒ نے ہمارے حضرت سے ایک ملاقات کے بعد اپنے کچھ تاثرات "وقت کے ایک بزرگ" کے عنوان سے لکھ کر اخبار صدق میں

جرم جولائی ۱۳۳۵ء کی اشاعت میں طبع بھی ہوا، مولانا عبدالباری صاحب نے حضرت اقدس کا ارشاد نقل فرمایا کہ :-

”ایک دن تقریری مجلس میں عرب و عجم ہر جگہ مسلمانوں کی تباہ کاریوں اور بربادیوں پر غلبہ قلق و تاسف کے ساتھ بار بار فرمایا کہ — بس علاج ایک ہی ہے دوسرا ہرگز نہیں (یعنی) ”ایمان و اتباع“ جبکہ خود یہ سراپا بد حال ”ایمان و عمل صالح“ کی ٹھیٹھ قرآنی اصطلاح میں مسلمانوں کی دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی ہر مرض کا علاج کہا کرتا ہے۔“ انتہی۔

ظاہر ہے کہ اصل عبارت اور علاج تو حضرت اقدس کا ہوا اور مولانا عبدالباری صاحب کی بات اسی کی تائید اور تشریح ہوئی، اسپر مولانا دریا آبادی نے یہ حاشیہ تحریر فرمایا کہ :-

”تشخیص کی صحت میں کس مسلمان کو کلام ہو سکتا ہے لیکن عملی دنیا میں بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے اور سوال یہی اٹھتا ہے کہ پھر اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟“

دیکھئے دونوں حضرات کا شبہ یکساں ہے ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کا قول دوسرے ہی سے ماخوذ ہو، بہر حال آج چاہے لوگ زبان سے نہ کہیں لیکن قلب میں یہ خلجان بہت لوگوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

جب صدق کا یہ پرچہ حضرت مصلح الامۃ کی نظروں سے گزرا اور حضرت نے اس میں مولانا دریا آبادی کا یہ نوٹ ملاحظہ فرمایا تو اپنے مزاج کی رو سے مناظرہ تو نہیں فرمایا لیکن اپنے لوگوں کو بات سمجھانے کے لئے بیاض میں جہاں یہ مضمون نقل فرمایا تو اس نوٹ پر اپنا ایک جوابی نوٹ بھی تحریر فرمادیا، فرمایا کہ :-

(قول) ”تشخیص کی صحت میں کس مسلمان کو کلام ہو سکتا ہے“ انج (اقول) جس طرح اسکی صحت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اسی طرح سے اس پر عمل کرنے میں بھی تو کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا اس جزو کو اس سے علاحدہ کیوں فرمادیا گیا“

(مطلب یہ کہ یہ شخص صرف ذہنی اور اعتقادی ہی نہیں بلکہ ایک عملی پروگرام سے توجہ فرماتا ہے جس طرح سے قبلہ لوگ اسکے مصدق ہیں عملاً بھی اس سے کسی مسلمان کو انکار نہ ہونا چاہیے) (قولہ) پھر آخر اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟ — (اقول) عمل اس لئے نہیں ہوتا کہ ایمان میں نقص اور ضعف پیدا ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

لَا يَكِلُفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اسکی طاقت سے زیادہ احکام کا مکلف نہیں بنایا ہے جو کچھ وہ خیر کرے گا اسکا نفع اسکو ملیگا اور جو شر کماے گا اسکا خیمازہ اسکو بھگتنا پڑے گا) (راقم عرض کرتا ہے کہ عمل نہ ہونا دو وجہ سے ہو سکتا ہے یا تو عمل دشوار ہوتا جو خارج از طاقت بشریہ ہوتا یا تو ہے نہیں یہ نص اسکا صریح رد کرتی ہے۔ دوسری وجہ عمل نہ ہونے کی لوگوں کی اپنی سستی۔ ضعف ایمان، کاہلی، نفاق، اور انہی آرام طلبی۔ نفسانی خواہشوں پر چلنا ہو تو اسکی ذمہ داری نہ شرع پر ہے نہ صاحب شرع پر معاذ اللہ۔ یہ تو اپنے پیر میں خود دکھاڑی مارنا ہے اور بقول قائل ہے

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کا مصداق بننا ہے ظاہر ہے کہ اسکا علاج کسی کے پاس نہیں ہے اور مرض کا یہی وہ درجہ ہے جسکے متعلق حکیم بقراط فرما چکے ہیں اسکی دوا خدا نے بھی نہیں پیدا کی ہے یہ مکڑہ مرض جسکو آسان سمجھیں کہے جو طبیب اسکو نہ بیان سمجھیں

لہذا بات وہیں کی وہیں پہنچتی ہے کہ اگر اسکا علاج ہے تو وہی ایمان و اتباع یا بقول مولانا ندویؒ ایمان و عمل صالح۔ حاصل یہ ہے کہ یہ سوال تو امت سے کرنے کا ہوتا کہ مصلحین امت سے؟

اسکے آگے مولانا دریا آبادیؒ نے ایک بات اور تحریر فرمائی تھی اسکو بھی سن لیجئے

فرماتے ہیں:۔

”مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور سے متعلق ایک حکایت مشہور ہے کہ جب اٹالن کے پاس روس پہنچے تو اسکے سامنے اسلام

کے دستور اساسی پر موثر اور مفصل تقریر کی اسٹالن خاموش منتارہا جب مولانا اپنا وعظ (یعنی وہی تقریر) ختم کر چکے تو بولا کہ مولانا اس نظام کا عملی نمونہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی موجود ہو تو مجھے اسکا پتہ بتائیے" راقم عرض کرتا ہے کہ انداز سے کچھ ایسا لگتا ہے کہ مولانا دریا آبادی نے اس واقعہ کو اپنی کہی ہوئی بات کی تائید میں پیش کیا کہ بہت سی اسکیمیں ایسی ہوتی ہیں کہ صرف اسکیم کے درجہ میں نہایت خوشنما اور خوش منظر معلوم ہوتی ہیں لیکن عملی طور پر انکا وجود مشکل بلکہ متعذر ہوا کرتا ہے دیکھو مولانا عبید اللہ سندھی کی تقریر محاسن اسلام پر سنکر اسٹالن نے بھی یہی کہا کہ اس مفید حسین اور خوبصورت نظام کا کہیں دنیا میں عمل اور خارجی طور پر نمونہ دکھلائیے۔

مولانا دریا آبادی تو بس اتنا فرما کر خاموش ہو گئے کیونکہ علامہ سندھی کی صرف اتنی ہی گفتگو انکے مفید مطلب تھی باقی میرے علم میں بھی نہیں کہ حضرت علامہ عبید اللہ صاحب سندھی نے آخر اسکا کچھ جواب دیا یا نہ امت کے ساتھ لا جواب سر نیچا کر لیا۔ مولانا سندھی کی تبحر علمی اور بزرگوں کی صحبت اور ان سے اخذ فیض کا تقاضا تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسکا جواب ضرور دیا ہوگا اور اسلام کے جن محاسن اور اسکے اصول اور نظام کی جس نچنگی کو مولانا نے بیان کیا ہوگا اس کا عملی نمونہ خیر القرون میں تو یقیناً دنیا میں موجود رہ چکا ہے اور اسٹالن اور لینن بھی اسے خوب واقف ہیں ہاں آج کی دنیا میں طابق النعل بالنعل کسی حکومت کو کامل اسلامی نظام پر پیش کرنا بلاشبہ مشکل ہے تاہم اکھبر اللہ بہت سی جگہیں ایسی موجود ہیں کہ وہاں اسلام کی برکات اور اسکے انوار آج بھی بقدر عمل اور خلوص کے موجود ہیں، پھر یہ دعویٰ تو کسی نے کبھی نہیں کیا کہ قیامت تک خیر القرون جیسی خیر باقی رہیگی جبکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو لوگ ان سے ملے ہوئے ہوں گے پھر جو ان سے ملے ہوں گے، اور یہ فرمایا کہ دین کے دس

حصوں میں سے آج کے دن اگر تم لوگ نوپر عمل کرو گے اور ایک ترک کر دو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے اور ایک زمانہ آخر میں ایسا آئے گا کہ دس حصے میں سے لوگ اگر نو حصہ ترک کر دیں گے اور ایک پر عمل کر لیں گے تو کامیاب ہو جائیں گے آخر یہ تفاوت کیوں ہوا؟ ظاہر ہے کہ وہ ایمان وہ اخلاص اور وہ جذبہ لوگوں کا نہ رہ جائیگا اس قدر دین میں ضعف آ جائیگا ایمان کمزور ہو جائے گا دوائی عملی کمزور ہو جائیں گے اور موانع عمل بیشتر ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں تھوڑا سا عمل بھی بڑا درجہ رکھا کرتا ہے اور معمولی سعی بھی مشکور ہو جایا کرتی ہے آج کبھی دنیا میں مشکلات میں گھرے معمولی کام کرنے والے کو غیر معمولی صلہ دیا جاتا رائج اور جاری ہے۔

پھر اسٹالن نے جو یہ کہا تو کیا وہ یا انکی جماعت آج یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ جن اصولوں کو ان لوگوں نے بہتر جان کر دنیا میں رواج دیا تھا اور اس وقت لوگوں نے کبھی دل و جان سے اسکو قبول کیا تھا وہی جذبہ اور وہی پابندی نظام اور وہی روح آج بھی انکی جماعت میں باقی ہے؟ اس بات کا اثبات میں جواب دینا مشکل ہے۔ باقی جماعتی ترقی جو دیکھی جا رہی ہے وہ دوسرے لوگوں کی کمزوری کے سبب سے ہے نہ کہ ان کے اصولوں کی خوبی اور نچنگی کے باعث جماعت کو جس مساوات کا دعویٰ تھا خود ان کے عوام کو اپنے بڑوں سے اسکی شکایت شروع ہو گئی ہے، مساوات کا صرف ڈھونگ ہے امیر و غریب کی تفریق وہاں آج بھی موجود ہے افراد میں تبدیلی ضرور ہو گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم جیسے کم علموں کم فہموں کے ذہن میں یہ جواب آسکتا ہے تو مولانا سندھی بآں علم و دانش یہ شکر خاموش کیسے ہو گئے ہوں گے غالب گمان ہے کہ انھوں نے ضرور جواب دیا ہو گا اور دندان شکن جواب دیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ ناقیلین کے تصرف سے وہ ہم تک

نہ پہنچ سکا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم

الغرض یہاں زیادہ تر جواباتیں مذکور ہوئیں وہ ضمنی تھیں مقصود حضرت اقدس

کے دینی اور اصلاحی حالات کا بیان تھا کہ اس طرح سے ہر چار طرف سے
 مشاغل نے گھیر رکھا تھا اور احمد شہد کا مہربان ہونا تھا۔ فتنہ پر کے اکثر لوگ تو
 اصلاح کی جانب متوجہ ہو چکے تھے بیشتر ان میں سے صاحب، نیک، خوش اعلان
 اور خوش کردار بن چکے تھے اور اپنے اندر دین کا فہم پیدا کر چکے تھے، انکی دیکھا دیکھی
 اطراف کے لوگوں میں بھی حرکت ہو چلی تھی، ہر جانب سے وفود کے وفود اور
 لوگوں کی جماعتیں آنے لگی تھیں فتنہ پر کی وسیع و عریض خانقاہ انکے قیام کیلئے
 ناکافی سی معلوم ہوتی تھی اور اتنی بڑی مسجد بھی ماشاء اللہ کبھی کبھی نمازیوں سے
 پُر ہو جایا کرتی تھی۔ غالباً تو وسیع مسجد کا پہلا ہی سال تھا۔ رمضان شریف کا
 مہینہ تھا باہر سے بھی سالکین آئے ہوئے تھے دین کا کام شباب پر تھا اور
 فتنہ پر اپنے مجمع کی رُود سے ایک دیہات اور گاؤں نہیں بلکہ قصبہ سا معلوم ہوتا تھا۔
 لیکن انسان صرف کوشش ہی کر سکتا ہے حالات میں کیا انقلاب آجائیکا
 اسکا علم تو عالم الغیوب ہی کو ہے، حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ جہاں دین کا کام
 جس قدر بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے وہیں ایک بڑا شیطان بھی ضرور موجود رہتا ہے۔
 چونکہ ابلیس اور اسکی جماعت کو دین کا کام بالکل پسند نہیں وہ بھی برابر اس فکر میں رہتا ہے
 کہ کس طرح سے اس کام کو تباہ و برباد کرے۔ سو جب اللہ تعالیٰ ہی کو منظور ہوتا ہے
 تو اسکو غلبہ دیدیا جاتا ہے اور ان حالات میں اہل دین کو کوئی شکست بھی نہیں ہوتی
 بلکہ انکا اجر تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ثابت ہو جاتا ہے نیز ایسے مواقع پر یہ اہل حق کی
 بظاہر شکست بھی انکے لئے آئندہ کسی فتح کا ہی پیش خیمہ بنتی ہے۔“

چنانچہ یہاں بھی موسم بہار میں دفعۃً خزاں کا جھونکا آیا اور دیکھتے دیکھتے نقشہ
 بدل گیا یعنی اب جو دیکھنے والوں نے فتنہ پر کو دیکھا تو بدلا ہوا پایا یعنی صر
 نہ پھول تھا نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا

اس اجمال کی تفصیل تو بڑی طویل ہے پھر ہر موقع پر راقم موجود بھی نہ تھا
 واقعات و حالات سے سنائے ہی بیان کئے جائیں گے اور روایت میں فی زمانہ

جو بے احتیاطیاں ہو جایا کرتی ہیں وہ ظاہر ہے اسلئے ہم چند باتوں ہی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں حالات کی نوعیت کے سمجھنے کے لئے وہ بھی کافی ہیں۔

ہندوستان کے تقریباً ہر گوشہ میں ہی جس طرح سے آج دیوبندیت اور بریلویت کا مسئلہ ایک فتنہ بن کر پھیلا ہوا ہے اس سے حضرت اقدس کا دیار یعنی فتحپور (تال زجا) بھی نہ بچ سکا تھا، یہاں مولوی علیم اللہ صاحب نامی ایک مفتامی میلاد خواں مولوی تھے ہمارے حضرت سے شاید عمر میں کچھ بڑے ہی تھے گاؤں میں انکا حلقہ بلکہ سکھایا ہوا تھا کہ اس درمیان میں حضرت اقدسؒ کا قیام مستقلاً وطن ہی میں ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے تدریجاً ترقی بھی عطا فرمائی، حضرت کے علم و عمل اور اور حال و کمال کا شہرہ شکر نیز یہ معلوم کر کے کہ یہ حضرت حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ اور مجاز ہیں آپ کی جانب مرجوعہ بڑھا کہ حضرت والاؒ کے سامنے دوسرے مقامی لوگ بالکل ماند پڑ گئے چنانچہ مولوی مستحسن صاحب مدظلہ (مولوی محمد یونس صاحب سلمہ کڑی والے کے والد بزرگوار) اپنا واقعہ خود بیان کرتے تھے کہ حضرت اقدسؒ سے متعلق ہو جانے کے بعد میں اکثر فتحپور آتا جاتا رہتا تھا ایک دفعہ گاؤں کے متصل جو نالہ ہے اسکو کشتی سے پار کر کے جب آگے بڑھا تو ایک بزرگ صوفی معمر شخص نظر پڑے میں نے سلام کیا انھوں نے جواب دیا اور دریافت فرمایا کہ کہاں سے تشریف لارہے ہیں؟ میں نے کہا محمدی ضلع شاہجہاں پور سے، پوچھا کہاں جا رہے ہیں نے کہا یہیں فتحپور ہی تک آنا ہوا ہے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اپرا انھوں نے فرمایا کہ۔ بھائی اگر وہ وصی اللہ ہیں تو میں بھی تو علیم اللہ ہوں۔ اب اس سے انکا مقصد کیا تھا یہ محلِ کلام ہو سکتا ہے اسکی واقعی مراد تو اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے باقی ظاہر اس سے کیا سمجھا جاسکتا ہے اسکو بھی میں ناظرین کی فہم پر محول کرتا ہوں۔ غرض فریق ثانی کے عوام و خواص سبکی نگاہوں میں حضرت کا وجود کھٹک رہا تھا لیکن لوگ کہ ہی کیا سکتے تھے مجبور تھے بالآخر انکا ظاہری غیظ و غضب کینہ بن کر قلب کے اندر اتر گیا اور کینہ اور حسد کا سرمایہ لیکر

کسی موقع کے منتظر رہنے لگے۔

اس جماعت کے لئے مزید پریشانی کا یہ امر بھی بنا کہ آہستہ آہستہ مولوی علیم اللہ صاحب کے خیالات حضرت اقدسؒ کی جانب سے نرم ہوتے گئے اور ان کے حالات بدلنے لگے جس کا حقیقی سبب تو اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل ہوا باقی ظاہری سبب یہ ہوا کہ حضرت اقدسؒ کے کریمانہ اخلاق نے ان کے قلب کو جیت لیا یعنی اُدھر سے گالی دی جاتی تھی تو اُدھر سے پھلوں کی ڈالی پیش کی جاتی تھی۔ اپنے بزرگوں کے اسی نوع کے اخلاق دیکھ کر یہ پڑھنے یہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ

اولئک ابائی فحیثی بمثلهم اذا جمعنا یا جبریرا لمجاہد
یہ تھے ہمارے اسلاف ان جیسے اسلاف تم بھی پیش کرو اگر تمہارے یہاں ہوں تو۔
اور لوگ جب حقیقت کے سلام کے یہ اشعار پڑھتے ہیں کہ
سلام اسپر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں سلام اسپر کہ جس نے دشمنوں کو یقینا دیں
تو اسباب میں بھی اپنے بزرگوں کے متبع سنت ہونے کے واقعات کو دیکھ کر ان پر
وجد سا ہو جاتا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

سارا گاؤں ایک ہی برادری تو تھا اس لئے بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو
مولوی علیم اللہ صاحب سے قرب یا قرابت کا تعلق رکھتے تھے اور تھے وہ حضرت والا
کے خدام میں سے، راقم الحروف نے بچپن میں خود دیکھا ہے کہ گرمی کا رمضان ہے، ظاہر ہے
کہ ہر شخص ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی یا شربت پینا چاہتا ہے، اور یہاں دیہات میں کوسوں
برف نایاب لا محالہ لوگ کنوئیں ہی کے پانی پر اکتفا کرتے تھے، اُدھر گوپال گنج سے جو
یہاں سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا حضرت اقدسؒ کے ایک خادم خاص سیٹھ
عبدالرب صاحب نے بطور خود یہ انتظام کر دیا تھا کہ ایک غیر مسلم ملازم کے ذریعہ
دس پانچ سیر برف حضرت اقدس کے لئے روزانہ سائیکل سے بھیج دیتے تھے جو
افطار سے دس پندرہ منٹ قبل حضرت کو مل جاتا تھا، حضرت اقدس یہ کرتے تھے
کہ ایک کٹورہ میں تھوڑی سی برف رکھ کر انھیں صاحب کو دیتے (جنکا تعلق اور جنکی

بے تکلفی مولوی علیم اللہ صاحب سے ہوتی تھی کہ جاؤ یہ برف مولوی علیم اللہ صاحب کو دے آؤ، ہدیہ محبت کو بڑھاتا ہی ہے (حدیث شریف میں آتا ہے کہ تمہارا محتاج ہوا) چنانچہ حسب قاعدہ ہے

جو پتھر پر پانی پڑے متصل تو گھس جائے بے شبہ پتھر کی ریل
اس معاملہ نے بھی مولوی صاحب کے قلب کو پگھلا دیا اور اسکی سوزش کو ٹھنڈک سے بدل دیا جسکا ایک اثر یہ ہوا کہ مولوی صاحب اپنے وعظ وغیرہ میں اب حضرت والا کے متعلق کچھ کہنے سننے سے بالکل رک گئے اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا غائبانہ دعار بھی دینے لگے اور حضرت کے کام کو سراہنے لگے۔ غرض دل سے خوش ہو گئے یہاں تک کہ ایک مرتبہ ٹہلتے ٹہلتے خانقاہ اور مسجد کی جانب بھی آئے اور دونوں کو اندر سے دیکھا بات عرصے کی ہوئی یاد آتا ہے کہ کسی نے بیان کیا تھا کہ خانقاہ اور مسجد کو دیکھ کر خوش ہوئے اور یہ شعر پڑھا ہے

خوشامکتب و مسجد و خانقاہ ہے کہ آنجا بود قیل و قال محمد
اسی طرح سے دلی قرب بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک دن حضرت اقدسؒ کی مجلس میں بھی تشریف لائے اور آج یہ پہلا دن تھا کہ انکو حضرت والا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا حضرت کا ایمانی ور و حانی بیان سن کر بہت زیادہ محفوظ اور مسرور ہوئے اور فرمایا کہ پھر آؤنگا نیز حضرتؒ نے بھی چلتے وقت ہدیہ میں انھیں ایک مال اور ایک عمدہ تسبیح عنایت فرمائی۔ وہ صاحب جوان کے لانے میں وسیلہ بنے تھے کہتے تھے کہ ایک دن میں مولوی علیم اللہ صاحب کی مسجد سے گذرا تو اندر صحن مسجد میں ٹہل ٹہل تسبیح پڑھ رہے تھے دور سے مجھے تسبیح دکھائی مطلب یہ تھا کہ یہ دیکھو مولانا ہی کی دی ہوئی تسبیح استعمال کر رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا بڑا انقلاب تھا کہ جسکا مشاہد اہل دنیا نے کم ہی دیکھا اور سنا ہوگا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مخالفین کے سردار کو حضرت اقدس کا محب اور معتقد بنادیا۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ فوج کا کمانڈر ہی جب مقابل سے مل جائے تو پھر

فوج میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔ مخالفین کی جماعت میں جو حیرانی اور فلش اس واقعے سے ہوئی ہوگی اسکو وہی جانتے ہوں گے، چنانچہ ان لوگوں کو نکر ہوئی کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ مولوی علیم اللہ صاحب سے تو کسی کی کہنے کی ہمت پڑتی نہ تھی اور اگر کوئی کچھ کہتا بھی تو وہ ڈانٹ دیتے تھے آخر قبیلہ کے سردار اور بڑے تو تھے ہی۔ لہذا جماعتی تجویز یہ ہوئی کہ اسکی اطلاع بریلی شریف کے پیر صاحب سے کرنی چاہیے اور مولوی احمد رضا خان صاحب کے صاحبزادے جو اندنوں صاحب سجادہ تھے اور کبھی کبھی فتنہ پور تال نرجا بھی مولوی علیم اللہ صاحب کے پاس انکا آنا جانا ہوتا تھا ان کے گوش گزار یہ معاملہ کر دیں تو وہ اگر منع کر دیں گے تو مولوی علیم اللہ وہاں آنا جانا ضرور ترک کر دینگے چنانچہ صاحب سجادہ کی تشریف آوری پر لوگوں نے ان سے تنہائی میں تمام ماجرا بیان کیا انھوں نے بھی موقع پا کر مولوی علیم اللہ صاحب سے دریافت کیا کہ سنا ہے کہ آپ مولوی وصی اللہ صاحب کے یہاں انکی مجلس میں جاتے ہیں؟ مولوی علیم اللہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں جاتا تو ہوں۔ سجادہ نشین صاحب نے فرمایا ایسا نہ کیجئے اس میں پوری جماعت کی بدنامی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ وہاں اللہ و رسول اور بزرگان دین کے ذکر کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی پھر میں ایسی جگہ جہاں باتیں سنکر ایمان تازہ ہوتا ہو آخر کیوں نہ جاؤں؟ اچھا اگر وہاں نہ جاؤں تو اسکی مقابلہ کوئی دوسری مجلس یا نشستگاہ آپ تجویز فرما دیجئے! اسپر وہ لا جواب ہو گئے اور یہ سمجھکر خاموش ہو گئے کہ اب یہ نہ مانیں گے۔

غرض فتنہ پور میں ہمارے حضرات اقدس کی فتح پوری تو اسی واقعہ سے ہو چکی تھی کہ مولوی علیم اللہ صاحب جیسا انسان جو عرصہ دراز تک مخالف رہ چکے تھے بلکہ نفی ان ہی کی وجہ سے اور انکے ہی سہارے انتہار کو پہنچ چکی تھی وہ اب خود حضرت والا سے محبت فرمانے لگے اور بے تکلف ملنے لگے اور حضرت کے یہاں آنے جانے لگے بس اب اور فتح کسے کہتے ہیں؟

باقی سلاطین یا کمانڈر چونکہ فہیم اور دانشمند لوگ ہوا کرتے ہیں اس لئے حق اور صداقت واضح ہو جانے کے بعد پھر انکی طبعی ثنافت ابا کرتی ہے کہ حق کے خلاف کوئی اقدام کریں اور عام رعایا یا سپاہی قسم کے افراد اپنی کم علمی اور گج فہمی، نفسانیت اور طبعی ثنارت کے پیش نظر ایک گونہ کینہ اور ابھار و قائم ہی رکھتے ہیں اور کسی موقع کے منتظر رہتے ہیں اور جہاں اپنی گرفت ڈھیلی پائی نہیں کہ اپنے نفسانی تقاضے کو بروئے کار لانے کی سعی کرنے لگ جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ مولوی علیم اللہ صاحب کے ادھر آجانے کو قوم نے اپنی شکست فاش جانا اور سہیل پنی ذلت محسوس کی اور سمجھانے بجھانے کے بعد بھی جب وہ نہ مانے تو بہت سے ان کے لوگ ان سے بھی دل ہی دل میں ناخوش رہنے لگے۔

اب وہ جس جماعت کے پیشوا ہیں وہ جماعت ہی ان سے ناراض ہے لوگوں کو اگر نیک مشورہ دیتے ہیں اور بھلائی کی راہ دکھاتے ہیں تو لوگ ان کی بات سننے کے لئے تیار نہیں اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ جماعت بلا امیر کے ہو کر شتر بے ہمار ہو گئی اور اسکے افراد کسی ایسے رہبر کی تلاش میں رہنے لگے جس سے انکی مقصد برآری ہو سکے۔ جس طرح کہ اب تک تو اہل حق کی جماعت کے مد مقابل مولوی علیم اللہ صاحب سے منکواب ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اسی طرح سے انکی مخالفت ختم ہو جانے کے بعد خلف من بعد ہم خلف کے طور پر ایک دوسرے صاحب مد مقابل ہوئے جو کہ پولیس کی ملازمت سے الگ ہونے کے بعد فتحو ر آئے تھے یہیں کے باشندے تھے اسلئے یہیں رہنے پولیس میں رہا ہوا آدمی خاموش زندگی کب گوارا کر سکتا ہے اسکو تو کوئی نہ کوئی محاذ رکھنا پڑے تاکہ اسکی انفرسی قائم رہے یعنی خود افسر ہو جائے اور سب لوگ اسکے ماتحت ہو کر رہیں، مذہبی خیالات سے اسی جماعت کے فرد تھے یہاں لیڈر سی کی جگہ بھی حسن اتفاق سے خالی تھی اس لئے اُس جماعت کے اسکو اپنا لیڈر بنالیا، دوسروں کے کندھے سے بندوق چلانا تو زمانہ حال کا

مانا ہوا کمال ہے اب جو شخص اپنے مقابل جماعت سے لڑنے والا ملجائے تو لوگ اسکی کیوں نہ قدر کریں گے ؟ اب کیا تھا کہیں میلاد کیا جا رہا ہے کہیں کوئی اسکیم بن رہی ہے کہیں کسی کو تنہا پا کر اس پر آوازہ کسا جا رہا ہے اور چھیڑا جا رہا ہے کہیں انکشن کے میدان میں ذاتی انتقام کی کوشش کی جا رہی ہے غرضیکہ مختلف محاذ چھیڑ دیئے ، اور یہ سب ہو رہا تھا اور مخالفت اپنی انتہا پر تھی ، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت والا نور اللہ مرقدہ کا کام بھی اپنے شباب پر تھا یہ صاحب جو پولیس سے آئے تھے حضرت مصلح الامۃ؎ کے ایک خادم خاص کے حقیقی بھائی تھے ، اللہ کی شان ایک بھائی حضرت کا محب اور ایک بھائی حضرت کا دشمن اور مخالفت ۔ اور ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ بھی تھا ایک ہی جگہ رہتے رہتے تھے ۔ اب اندر اندر کمانڈر کو پا کر مخالفین جو اسکیم بناتے رہے ہوں اسکا صحیح علم تو خدا ہی کو ہے باقی حضرت اقدسؑ کے وہ خادم جو ان لیڈر صاحب کے بھائی تھے وہ کبھی کبھی اپنے لوگوں سے اتنا بیان کرتے تھے کہ آجکل اُنکے بھائی کا دماغ بہت خراب ہو رہا ہے اور ہر وقت اول فول بختار رہتا ہے ۔ حضرت اقدس کے علم میں بھی کبھی کبھی کچھ باتیں پہنچ جاتیں ورنہ عام طور سے تو لوگ ان سب باتوں کو چھپاتے ہی تھے کہ کہیں حضرت خفا نہ ہو جائیں اور بجائے ان لوگوں کے کچھ کہنے کے ہم ہی لوگوں کو اپنے یہاں سے نہ نکال دیں اور آنا جانا بند کر دیں (اور اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بنیادی غلطی تھی جو اپنے لوگوں سے ہوئی کہ کسی فتنہ کا دفعیہ اسکے وقوع سے پہلے کرنے کی نہ تو خود صلاحیت تھی اور نہ حضرت اقدسؑ ہی کے علم میں اسکو لائے ورنہ شاید اس ہنگامہ کی نوبت ہی نہ آتی اور حضرت والا نہایت خوش سلوبی کے ساتھ معاملہ کو ختم فرما دیتے ، لیکن ما قدر اللہ کان خدا کو جو منظور تھا ویسے ہی اسکے اسباب ہوتے چلے گئے)

بات بالکل صحیح تھی اُدھر اسکے دماغ میں سرداری کا سودا سمایا ہوا تھا

اور اسکے ملنے کے کچھ آثار بھی اسکو دکھائی دے رہے تھے، ادھر حضرت اقدس کو اندرونی گفتگو اور باہم پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ناواقف رکھا گیا اور مخالفین کے جو دوسرے فتنہ پرور لوگ تھے وہ بذریعہ غیبت و چغلیں اورمی اسکے دماغ کو اور خراب کئے جا رہے تھے یعنی چھوٹی چھوٹی باتیں اسکے بھائی کی جانب منسوب کر کے بھائی کی جانب سے اسکے خیالاً خراب سے خراب تر کرتے چلے جا رہے تھے، ان تمام حالات نے بالآخر اسکے دماغی توازن کو خراب کر کے رکھ دیا یہاں تک کہ وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ گاؤں میں ایک بڑے پیمانہ پر فساد کرادے ایسے طور پر کہ اسکے لوگ تو محفوظ رہیں اور حضرت والاؒ کے ماننے والے لوگ (اہل حق) پیٹے جائیں اور مجرد و زخمی ہوں، چنانچہ اسکے لئے ایک مستقل پلان تیار کیا گیا اور اپنی چالاکی اور اہل حق کی لاعلمی اور حالات سے ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا اور وہ اسکی بنا پر بزمِ علم خود کامیاب بھی رہا۔

رمضان شریف کے ایام تھے چھٹی یا ساتویں تراویح ہو رہی تھی جدید مسجد کی توسیع ہو چکی تھی باہر سے آنے ہوئے سائیکین اور طالبین کا خاصا مجمع رمضان گزارنے کے لئے حسب معمول خانقاہ آیا ہوا تھا گاؤں کے لوگوں میں سے جو حضرت اقدس ہی کے ساتھ تراویح ادا کرنا چاہتے تھے وہ موجود تھے اور کمانڈر صاحب کے بھائی صاحب بھی موجود تھے،

اس نے کیا یہ کہ گاؤں کے اندر ہر ہر موڑ پر اپنے آدمی لاٹھی وغیرہ کے ساتھ ہتھیار بند مقرر کر دیئے اور اپنے بھائی کے گھر جا کر اسکی عورتوں اور بچوں کو مارنا اور زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا وہ سب بچے روتے ہوئے اور فریاد کرتے ہوئے مسجد کی جانب آئے کہ اپنے والد کو صورت حال سے مطلع کریں (یہاں ان لوگوں کو حالات کی رو سے اندیشہ تو تھا ہی) یہ سنتے ہی کہ فلاں شخص نے لاٹھی سے سب کو مارا ہے حضرت کے ان خادم کی حمایت میں انکے گھر کی طرف نہتے

بے تحاشا بھاگے اور جو جس طرف سے آگے بڑھا اُسکے آدمیوں نے اس پر حملہ کر دیا جکی وجہ سے یہ لوگ جو مسجد سے گئے تھے زیادہ تعداد میں زخمی ہو گئے اور اصل ملازم فرار ہو گیا بعد میں گاؤں سے اور لوگ بھی جب پہنچے تو چند لوگوں کے سوا سب بھاگ چکے تھے۔ مسجد کے لوگوں نے حتیٰ کہ خود حضرت والا نے بھی فوراً سمجھا کہ آخر یہ کیا قصہ ہے تاہم اجمالی خبر پاکر مولوی عبدالقیوم صاحب مرحوم کو بھیجا کہ آپ جا کے اور دوسرے اعلان کیجئے کہ اپنے سب لوگ واپس آجائیں۔ لوگ یہ سن کر واپس تو آگئے مگر اتنی دیر میں جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ فساد تھا جو واقع ہوا حضرت والا اسی تصادم کو بچانا چاہتے تھے کیونکہ یہ حضرت اقدسؒ کے اہلک کے کام پر ایک قسم سے پانی پھیر دینے والا تھا مگر قد وقع مایخاف ان یکون اناللہ وانا الیہ راجعون (جس بات سے ڈرتے تھے وہ واقع ہو کر رہی انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ میری عام معلومات تھیں اب مقامی حضرات کا بیان

سنئے :-

منجور کے بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ شمس الدین عرف صدیانا می ایک شخص جو پولیس میں ملازم تھے ملازمت سے آکر جب وہ گھر پر رہنے لگے تو دوسرے لوگوں نے اسکو اپنی جماعت کا لیڈر (نیتا) بنالیا اہل حق سے خود اسکو بھی مسلک کا اختلاف تو تھا ہی نیز انکے حقیقی بھائی شمس الحق عرف حق حضرت والا کے خادم خاص تھے خانقاہ کے مہمانوں کے کھانے وغیرہ کا انتظام بھی ان سے رہتا تھا اسلئے اکثر باہم ان میں تو تو میں میں رہا کرتی تھی، انھیں حالات میں الکشن کے اختلافات رونما ہو گئے، خود ہمارے حضرت توالکشن وغیرہ میں پڑتے ہی نہ تھے عام لوگوں کو ہدایت فرماتے کہ میں اختلاف اور فتنہ و فساد کو بالکل پسند نہیں کرتا بس اسکے بعد کسی کو کسی بات پر مجبور نہیں کرتا ہر شخص اپنی اپنی دنیوی مصلحت میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کرے یعنی ووٹ دے یا نہ دے یا جسکو چاہے دے۔ چنانچہ

حضرت والا کے یہاں آنے جانے والے لوگ جس کی جانب تھے شمس الدین اسکے خلاف تھا اور اب معاملہ کر لیا اور نیم چڑھا کا مصداق ہو گیا تھا ہر وقت دینی بحث کے علاوہ دنیوی مجمع مجمع بھی لوگوں میں باہم ہونے لگی مزید برآں یہ ہوا کہ وہ شخص جسکی حمایت میں شمس الدین بھی تھا الکشن میں مار گیا اور اسکی وجہ سے اسکا سابق غم و غصہ پوری جماعت ہی کی جانب سے کینہہ نکرا اس کے دل میں اتر گیا۔ چنانچہ رمضان شریف کا مہینہ آگیا اور ایک دن وہ قریب ہی کے کسی گاؤں میں گیا ہوا تھا اور حضرت والا گاؤں کے لوگوں میں اختلاف کی خلیج کو بڑھتے دیکھ کر بستی کے معزز اور چودھری قسم کے لوگوں کے پاس کہلا کر سے تھے کہ آپس کا اختلاف بہت بری چیز ہے آپ لوگ اپنے اپنے لوگوں کو سمجھائیں میں تو برابر سب ہی کو کہتا سننا رہتا ہوں کہ سب لوگ مل جل کر رہیں جسکا جو مذہب ہو وہ اس پر رہے مگر باہم اتفاق و اتحاد کے ساتھ سب کو رہنا چاہیئے۔

حضرت والا کے اس پیغام پر سمجھدار لوگوں نے لبیک کہا اور قریب تھا کہ الکشن سے مکدر شدہ فضا درست ہو جائے کہ درمیان میں پھر شیطان نے فتنہ طرازی کی ایک نئی صورت پیدا کر دی یعنی کسی نے شمس الدین سے وہاں جا کر جہاں وہ گیا ہوا تھا کہا کہ تمھارے خلاف گاؤں میں محاذ بنایا جا رہا ہے اور تم کو مارنے کی سازش کی جا رہی ہے (یہ ہے فتنہ کہ صلح کی بیٹنگ کو محاذ جنگ سے ظالم نے تعبیر کیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔) یہ سن کر وہ چراغ پا ہو گیا اور وہیں سے گاؤں میں اپنے آدمیوں کے پاس کہلا بھیجا کہ سب مسلح ہو جاؤ میں بھی آ رہا ہوں اور پھر شب میں عین تراویح کے وقت آکر وہ فتنہ برپا کیا جسکا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بعض تحریرات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فتنہ ۱۹۵۶ء کو پیش آیا۔ واللہ اعلم۔

میں نے گاؤں کی فضا سمجھنے کے لئے ذرا تفصیل سے وہاں کی تاریخ بیان کر دی ہے، باقی یہ جھگڑا جو ہوا تو اسوقت نہ تو کوئی دیوبندی بریلوی کا مسئلہ

حق اور نہ مدرسہ سے متعلق کوئی بات تھی بلکہ نزاع کی ابتداء دونوں بھائیوں کا
 نجی معاملہ بنا تھا جن میں ایک حضرت والا کے خادم تھے دوسرے صاحب
 دوسری جماعت سے متعلق تھے درمیان میں ریشہ دوانی کرنے والوں کو لڑانے
 کا موقع مل گیا اور اسکو دیوبندی اور بریلی کا جھگڑا بنا کر شہرت دیدی اور
 ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے حضرت اقدسؒ کا بھی نام اس موقع پر لیا جا گیا
 حالانکہ حضرت اقدسؒ کا نزاع سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ حضرت اقدسؒ کا
 مزاج اور مذاق تو یہ تھا کہ

تو برائے وصل کردن آدمی نے برائے فصل کردن آدمی
 بہر حال اپنے لوگوں کی اس نادانی اور نا سمجھی کیوجہ سے لوگوں کے بدنی اور
 مالی موجودہ پریشانی میں مبتلا ہو جانے کا رنج اور قلق حضرت اقدسؒ کو بھی سجد ہوا
 چنانچہ اہل بستی سے سخت ناراض ہوئے اس پر کہ ان لوگوں نے انتہائی حالات
 کو حضرت سے کیوں چھپایا؟ اور فرمایا کہ اس جرم میں نہ صرف اہل فتحپور بلکہ پوری
 برادری کو شریک سمجھتا ہوں لہذا سب سے میرا مواخذہ ہے اور میں سب سے
 ناراض ہوں۔

چنانچہ اس زمانہ میں حضرت والا نے مختلف لوگوں کے پاس جو تحریریں
 بھیجیں یا پیغام کہلایا حضرت اقدسؒ کا جلال اور غصہ اس کے مضمون سے عیاں
 ہے، مثلاً برادری کے کسی چودھری کے پاس کچھ لکھوایا اس میں فرمایا کہ :-
 ”میں نے شروع میں بھی بیان کیا ہے کہ یہ معاملہ ووٹ سے شروع ہوا
 تھا اسلئے آخر میں پھر یہی کہتا ہوں کہ میں ایک دینی کام کر رہا ہوں (اصلاح و تربیت
 کا) مجھے اور میرے متعلقین کو دنیوی امور سے کوئی سروکار نہیں وہ آپ لوگ
 جانیں اور جو چاہے کریں، باقی کوئی صاحب مجھے اس میں شریک کریں نہ مجھ سے
 کوئی توقع رکھیں، بات کو میں اخبار میں بھی دوں گا تاکہ سب لوگوں کو حقیقت حال
 سے واقفیت ہو جائے“ انتہی

ایک اور صاحب سے کچھ فرمانے کے بعد یوں جواب طلب فرمایا:۔
 فرمایا کہ — ”رام لیلا کے موقع پر (بھی آپ لوگوں کی بے عقلی سے
 تنگ آکر) جب میں گاؤں سے چلا آیا تھا تو آپ لوگوں نے بہت روگا کر کے
 مجھ سے وعدہ (اخلاص اور اخلاق وغیرہ اختیار کرنے کا) کر کے گھر چلنے کے لئے
 کہا تھا اور مجھ کو لے گئے تھے۔ اس جماعت میں آپ بھی تھے اس لئے اب
 آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیوں مجھے لے گئے تھے؟ جب میں چلا ہی آیا تھا تو آپ کا
 مقصد حاصل تھا، پھر مجھے کیا اسی لئے لے آئے تھے کہ اس طرح سے میری
 مخالفت کرو اور مجھے بدنام کرنے کی کوشش کرو؟ اس کا جواب دو“
 ایک اور صاحب کو تحریر فرمایا کہ:۔

”اس وقت دو باتیں اور کہتا ہوں ایک تو یہ کہ (اُس نے تمہانہ میں
 جو بیان دیا ہے اس میں) میرے متعلق یہ لکھا دیا گیا تھا کہ — ”یہ بااثر شخص ہیں
 اور بہت سے اہل ثروت ان کے مرید ہیں“۔ اس چیز کو میرا عیب گردانا گیا۔
 میں نے آج تک ایسا مقدمہ ہی نہیں دیکھا سنا کہ جہیں کسی کی خوش حالی کو بھی اس کا
 نقص اور عیب شمار کیا گیا ہو۔ نیز یہ کہ میں تو فقیر نہیں ہوں مگر جو لوگ کہ حقیقی (بزرگ
 ہوئے ہیں) فقرار گزرے ہیں بہت سے ان میں ایسے بھی ہوئے ہیں کہ ظاہر میں
 مال و دولت میں بڑے بڑوں سے زیادہ شان و شوکت والے ہوئے ہیں (اس
 بھی معلوم ہوا کہ مریدوں کا یا خود پیر کا شان و شوکت والا ہونا اس کی دنیا طلبی کی بھی
 دلیل ہوایا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مالدار ہو اور بزرگ ہو دنیا طلب
 نہیں سنا ہے کہ یہ

نہمراست آں کہ دنیا دوست دارد اگر دارد برائے دوست دارد
 (وہ انسان اشر والا نہیں جو دنیا کو دوست رکھے، ہاں اگر دنیا کو دوست، دوست کی خاطر رکھے تو خیر۔)
 امسال باہر سے آنے والے طالبین میں گورکھپور کے مولوی نثار اللہ
 صاحب مرحوم اور ان کے برادر خرد مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم بھی موجود تھے

انہوں نے اور بعض حضرات سے مشورہ فرمایا اور باہم یہ طے ہوا کہ حضرت اقدسؒ
 کچھ دنوں کیلئے گورکھپور تشریف رکھیں، واقعہ کے دوسرے دن یا تیسرے دن
 کارمنگوائی گئی اور حضرت والا ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر بجائے دولت خانہ پر
 تشریف لے جانے کے کارہی میں بیٹھ گئے اور دونوں مولوی صاحبان گورکھپور
 والے بھی بیٹھے اور غالباً سیٹھ عبدالرب صاحب بھی ہمراہ ہوئے اور کارروانہ
 ہو گئی اب تک کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ حضرت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔
 ہم لوگوں نے خیال کیا کہ شاید واقعہ سے ذہن متاثر رہے کہیں آس پاس تفریح طبع
 کے لئے گئے ہوں گے لیکن جب عصر میں بھی تشریف نہ لائے مغرب میں بھی نہ آئے
 حتیٰ کہ عشاء تک نہ واپس آئے تو اندازہ ہوا کہ خفا ہو کر کہیں دور چلے گئے ہیں۔
 یہاں تک کہ گھر کے اندر صاحبزادیوں کو اسکا صحیح علم شاید دوسرے دن ہو سکا۔

پھر اسکے بعد مولوی امجد اللہ صاحب تشریف لائے اور حضرتؒ کے
 سب بچوں کو بھی گورکھپور لے گئے۔ اسکے بعد باہر سے آنے والے مہمان بھی
 ایک ایک کر کے واپس چلے گئے، صرف چند طلبہ اور چند طالبین خانقاہ میں رہ گئے
 چنانچہ تھوڑے عرصے کے بعد بقیہ طلبہ اور طالبین کو بھی حضرت والا نے گورکھپور
 ہی میں طلب فرمایا راقم الحروف بھی اسی آخری قسط میں تھا۔

رحلت از وطن

وطن کا یہ سانحہ بھی حق تعالیٰ کے ان ہی امور میں سے تھا جسکے متعلق
 فرمایا گیا ہے کہ عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی ہو سکتا ہے کہ تم ایک
 چیز کو اپنے لئے مضر سمجھو اور دراصل اس میں تمہارے لئے کوئی خیر نہیہاں ہو
 اور بھلائی کا کوئی پہلو مضمحل ہو چنانچہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا۔

فتح پور مال نرجا میں حضرت اقدس کے قیام کی بنیاد ایسی مستحکم تھی کہ بظاہر اس میں
 تزلزل پیدا ہو جانا ممکن نہ تھا۔ مکان پختہ بن چکا تھا، خانقاہ کی توسیع اور استحکام
 ہو گیا تھا اور آخر میں مسجد کبلی نہایت ہی عالیشان اور وسیع ترکیبا چکی تھی گاؤں کا
 ہم عقیدہ طبقہ دل و جان سے فدا تھا، باہر سے آنیوالے سترشدین کی تعداد روز افزوں
 تھی اطراف و اکناف کے قصبات اور گاؤں سے دفود آکر سلسلہ میں داخل ہو رہے
 تھے بظاہر نقشہ یدِ خلُقوت فی دین اللہ افواجاً کا سامنے تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی
 مصلحت چونکہ ہمارے سب امور پر غالب ہے اسلئے اوہرے کچھ اور ہی سامان کیا جا رہا
 رہا تھا یوں اللہ کا معاملہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے تاہم بعد میں پیش آنے والے حالات
 اندازہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ایسا زبردست شیخ اور ایسا مصلح امت ایسی کوردہ
 جگہ میں گھر کر رہ جائے یہ مناسب نہیں انھیں کسی بڑی جگہ جانا چاہیئے اور ایسی جگہ جانا
 چاہیئے جہاں کے لوگوں میں دین کی طلب ہو اور محبت خداوندی کی تڑپ ہو۔ چنانچہ
 مدرسہ نجف علم الہی میں اسکے لئے پہلے گورکھپور تجویز ہوا، پھر الہ آباد اور پھر یہاں سے علی گڑھ
 جو پور، فتح پور اور لکھنؤ وغیرہ میں فیض پہنچا اور بالآخر بمبئی تک یہ سلسلہ پہنچ کر ختم ہو گیا
 گویا الف سے لیکر یا تک کام کو پورا فرما دیا گیا دیار سے تو بمبئی کی یا متعین ہے باقی الف
 سے مراد چاہئے تو اعظم گڑھ کا الف لے لیجئے یا الہ آباد کو سمجھ لیجئے اور اس الف و یا کی
 جانب ذہن یوں منتقل ہوا کہ اسی سلسلہ کے چند اشعار ایک بار حضرت نے سنائے تھے اور
 یہ فرمایا تھا کہ حضرت تھانویؒ نے ان اشعار کو اپنے کسی وعظ میں پڑھ کر یہ منہ مایا تھا
 کہ بھلا کوئی شاعری کرے تو ایسی تو کرے وہ اشعار یہ تھے ۵

ابو بکر یکسو علیؓ ایک جانب	خلافت کو گھیرے میں با صد صفائی
الف اور یار کی طرح انکو جانو	کہ محصور ہے جس میں ساری خدائی
یہ تشبیہ ہے واقعی تو جگہ بھی	الف اور یار نے بہ ترتیب پائی
یہ اول خلیفہ کے اول میں آیا	وہ آخر خلیفہ کے آخر میں آئی

یہاں گو خلیفہ نہیں بدلاتا ہم مقامات میں تبدیلی ہوتی رہی۔ چنانچہ کبھی وہ مرکز اعظم گڑھ

بنا کبھی گورکھپور کبھی آباد تو کبھی بمبئی ہو گیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس تبدیل مکانی سے حضرت اقدس کا فیض دو بالا ہو گیا اور لائق فائق اہل علم اور اہل دول مخاطبین کی وجہ سے حضرت کے کمالات باطنی خوب ظاہر ہوئے۔ گورکھپور رئیسوں کا شہر کہلاتا ہے ان لوگوں نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ پیر کو ہمارے کوٹھیوں پر آنا چاہئے، وہاں ہم اس کے اعزاز و اکرام کے لئے دست بستہ حاضر رہیں گے لیکن حضرت کے قیام گورکھپور نے انہی اس سلسلہ میں اصلاح فرمائی اور کم از کم لوگوں نے اتنا تو سمجھ ہی لیا کہ دین بمقابلہ دنیا کے ایک قیمتی شے ہے لہذا اسکو حاصل کرنے کے لئے ہمیں خود اپنے کو خاک میں ملانا چاہئے۔ مال تو پھر بھی ہاتھ کا میل کہلاتا ہے لوگوں نے تو اپنے مرنے کو علم کو بھی خاک میں ملا دیا ہے تب جا کر باطنی دولت ان کے ہنکار ہوئی ہے۔ بعدی فرماتے ہیں :-

در خاک بلیقاں پر سیدم بعبادے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن
گفتا برو چوں خاک تحمل کن اے فقیہ یا سرچہ خواندہ ہمہ در زیر خاک کن

فرماتے ہیں کہ میں نے مقام بلیقان میں ایک عابد کی زیارت کی اور ان سے عرض کیا کہ حضرت باطنی تعلیم و تربیت فرما کر (خدا را) مجھ ناچیز کو جہالت کے مرض سے نکال دیجئے اور پاک فرما دیجئے انھوں نے فرمایا کہ جاؤ اور مٹی کی طرح تحمل کرنا سیکھ کر آؤ (کہ غریب کتنی لتیائی جاتی ہے اور اسکے صلہ میں کس قدر انواع و اقسام کے پھل اور میوے اور سب ہی طرح کے اجناس ہم کو تحفہً پیش کرتی ہے) اور یا نہیں تو یہ کرو کہ اپنے پندار علم کو خاک میں دفن کر کے آؤ۔

اٹھو والے کہاں نہیں ہوتے لیکن خدا تعالیٰ تک پہنچانے والے بزرگ کم ہی ہوتے ہیں۔ حضرت اقدس کو دیکھ کر گورکھپور والوں کی بھی آنکھ کھلی کہ ہاں بزرگ ایسے ہوا کرتے ہیں۔ بزرگوں سے کوئی کوئی بزرگ جلالی بھی ہوتے ہیں وہ جب کسی سے کوئی امر خلافت ملاحظہ فرماتے ہیں تو پھر بد عار بھی کر دیتے ہیں ایسے بزرگ سے بھی یہاں کے لوگوں کو پالا پڑ چکا تھا۔ خود حضرت ہی سے سنا فرماتے تھے کہ

ایک دن میں مولوی امجد احمد صاحب کے ساتھ رکشے پر جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک شخص آتا ہوا نظر پڑا مولوی صاحب نے کہا کہ اسکو دیکھ لیجے اسکا عجیب واقعہ ہے۔ یہ نہیں لے تھے انکی بڑی حویلی تھلی کسی بزرگ سے تعلق تھا وہ برابر ان کے یہاں آتے جاتے تھے ایک دن یہی صاحب اپنی بیٹھک میں بیٹھے احباب سے گفتگو کر رہے تھے کہ سامنے سے یہ بزرگ آتے نظر پڑے بس فوراً بجائے بڑھکر استقبال کرنے کے وہ صاحب گھر کے اندر چلے گئے یعنی اپنے اس رویہ سے ان بزرگ کے اس وقت آنے پر گویا ایک طرح کی ناگواری ظاہر کی چنانچہ اسکو ان بزرگ نے محسوس کر لیا ایک شعر پڑھا اور وہیں سے اٹھے پاؤں واپس ہو گئے۔ فرمایا کہ ۵

خانقاہ ہے بلند و ہمت پست اسے خدا ہر دور برابر کن
حویلی تو اتنی بڑی ہے اور ہمت ایسی پست ہے (لا حول ولا قوۃ الا باللہ) اے خدا
تو دونوں کو برابر کر دے۔ انھوں نے تو جملہ ایسا فرمایا تھا کہ وہ اس کے لئے دعا بھی
بن سکتا تھا کہ آئندہ اسکی ہمت اسکی حویلی کی طرح بلند ہو جاتی لیکن چونکہ دکھے ہوئے
دل سے فرمایا تھا اسلئے انکا یہ کلمہ بھی بدعا بن گیا اور اسکے بعد روز بروز انکی حالت
گرتی ہی چلی گئی چنانچہ اب یہ حال ہے کہ نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے ہیں اور
اسی طرح سے بارے مارے پھرتے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا ان سے اس واقعہ کو
شکر بڑی عبرت ہوئی۔

راقم عرض کرتا ہے کہ یہ منصب پالینا بھی آسان ہے کہ انسان خدا تعالیٰ
کے آگے گڑ گڑا کر کے کسی کے متعلق کچھ کہدے اور وہ اسکی وجہ سے کسی آزمائش میں
میں پڑ جائے لیکن انکی بزرگی سے انکو فیض کیا ہو چکا ہے حضرت اقدس کے اندر
شانِ جلالی دیکھی اور شانِ جمالی بھی دیکھی۔ کیسے کیسے متکبروں کی اصلاح ہو گئی
اور کتنے خدا کے بندے جو خدا سے بھٹکے ہوئے تھے راہِ راست پر آ گئے اور بے بھی
معاملہ یہی کہ ۵

نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزہ تو جب ہے کہ گزروں کو تھام ساتی

ہمارے حضرت اقدس نے اہل گورکھپور میں سے بہتوں کو تھاما، کتنوں ہی کی شخصی اور ذاتی اصلاح فرمائی، کتنے گھرانوں کے اختلافات و نزاعات کا خاتمہ فرمایا۔ چنانچہ اہل گورکھپور نے بھی پھر حضرت کو کتنا مانا اسکا کچھ اندازہ ناظرین کو وہاں سے ہجرت فرمانے کے بعد وہاں کے لوگوں کے حالات سے ہوگا کہ نہ معلوم کتنے طالبین تو بس ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔

حضرت اقدس کو وطن سے گورکھپور لے جانے والے چونکہ مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم تھے اسلئے قیام بھی حضرت والا کا مولوی صاحب موصوف کی کوٹھی میں ہوا۔ پھر چند دنوں کے بعد جب عورتیں اور بچے بھی گورکھپور پہنچ گئے تو بچوں کا قیام مولوی امجد اللہ صاحب کے مکان میں تجویز ہوا جو اسی کے متصل تھا اور مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے مکان کی حیثیت خانقاہ کی سی ہو گئی یعنی کوٹھی کے اندرونی حصہ میں حضرت والا کا قیام تھا اور باہر کے بڑے ہال میں آنے والے مہمان مقیم ہوتے تھے پھر کچھ دنوں کے بعد جب خانقاہ فقیہ پور سے حضرت والا نے سب طلبہ اور طالبین کو بلایا تو طلبہ کا قیام تو مدرسہ سعیدیہ کے بعض کمروں میں کر دیا گیا اور طالبین نے بڑے ہال میں اپنا اپنا بستر بچھایا۔ بس مجلس کے اوقات میں لوگ بستر کو سمیٹ کر کنارے کر دیتے تھے اسی ہال میں ایک جانب تخت بچھتا اس پر گائیکہ اور تپائی رکھی جاتی اس پر تشریف فرما کہ حضرت مجلسی افاضہ فرماتے پھر مجلس کے بعد سارا ہال طالبین خانقاہ اور آمد و شد رکھنے والوں کے لئے بمنزلہ مہمان خانہ کے ہو جاتا تھا۔ اس ہال کے ایک گوشہ میں مکان کے اندر جانے کا دروازہ تھا جو گھر کے ایک نہایت طویل و عریض دالان میں کھلتا تھا۔ دالان عبور کر کے دوسری جانب حضرت والا کا کمرہ یعنی آرام گاہ اور خلوت خانہ تھا چنانچہ حضرت اقدس کبھی کبھی اپنے کمرہ سے نکل کر اسی دالان میں ٹھہرتے تھے جس کے دونوں جانب گملوں کی روش نے اسے بھی مختصر سا چمن بنا دیا تھا، اور کبھی کبھی ٹھہرتے ٹھہرتے ہال میں کھلنے والے دروازے تک تشریف لے آتے اور وہیں سے جہانک کہ مقیمین کا عمومی جائزہ لیتے کہ کون کیا کر رہا ہے اس خیال

سے لوگ یہاں نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ قیام کرتے تھے چنانچہ ہنسی اور قہقہہ تو الگ رہا آپس میں باتیں بھی نہایت آہستہ آہستہ کرتے تھے کیونکہ ہر آن یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں حضرت والا نہ آجائیں۔ نہ شور و شغب تھا نہ گپ کی مجلس جمتی تھی نہ سگریٹ بازی ہوتی بلکہ لوگ ہر وقت نہایت متانت اور سکون سے رہتے تھے۔ باتیں اگر ہوتی بھی تھیں تو مجلس کی اور کھٹنا پڑھنا بھی جو جاری تھا تو حضرت کے ملفوظات اور تعلیم کا۔

حضرت والا کے مکان کے دالان میں چہل قدمی فرمانے کے سلسلے میں واقعے یاد آگئے۔ ایک تو یہ کہ حضرت والا کے خدام میں سے ایک خادم تھے حاجی مطیع اللہ صاحب گورکھپوری مرحوم انکو اللہ تعالیٰ نے جسمانی ساخت میں بہت کچھ حضرت والا سے مشابہت عطا کر رکھی تھی پھر لباس اور ٹوپی میں انھوں نے شیخ کی متابعت اختیار کر لی تھی اسلئے بعض مرتبہ حاجی صاحب کو اچانک دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ حضرت تشریف لارہے ہیں اور سہم جاتے قریب آنے پر معلوم ہوتا کہ یہ تو حاجی صاحب ہیں۔ ایک دن مولوی نثار اللہ صاحب نے حاجی صاحب کی موجودگی میں حضرت والا سے فرمایا کہ حضرت! یہ حاجی صاحب بہت اچھے آدمی ہیں لیکن ان میں بس ایک خرابی ہے وہ یہ کہ یہ ذرا دھوکے باز ہیں۔ یہ سن کر حضرت کو تعجب سا ہوا اتنے میں مولوی صاحب موصوف نے اس دھوکے کی تشریح یوں فرمائی کہ حضرت بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ سامنے سے حاجی صاحب تسبیح لئے ہوئے آتے ہوئے ہیں تو ہم لوگ ڈر جاتے اور سہم جاتے ہیں یہ خیال کر کے کہ حضرت تشریف لارہے ہیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نہیں بلکہ یہ حضرت ہیں یہی انکا دھوکا ہے جو ہم سب کو پریشان کر دیتا ہے۔ یہ سن کر حضرت والا تو ہنس دیے اور حاضرین بھی اس لطیفہ سے محظوظ ہوئے۔ پھر معاملہ جب حضرت سے مشابہت ہی کا تھا تو جس طرح سے حاجی صاحب کو لوگ حضرت والا سمجھ لیتے تھے اسی طرح بالعکس بھی ایک معاملہ ہوا وہ یہ کہ ہمارے دوست حکیم وصی احمد صاحب (مالک علی گڑھ دواخانہ گورکھپور) ایک خوش مزاج اور مزاح پسندانہ ہیں کبھی بچپن میں گھوسی کے مدرسہ میں بھی پڑھ چکے تھے اس لئے حضرت اقدس سے قدیمی تعارف تھا

اور ولی بحت مٹی گور کھپور تشریف آوری پر حضرت اقدس کی خدمت میں صبح شام، دوپہر جب بھی موقع ملتا حاضر ہوتے رہتے تھے، ایک دن دوپہر کو آئے حضرت والا کھانا کھا کر اسی دالان میں چہل قدمی فرما رہے تھے حکیم صاحب نے دور سے سمجھا کہ یہ حضرت نہیں ہیں بلکہ حاجی مطیع اللہ صاحب ہیں اور سمجھا کہ حضرت والا اپنے کمرہ میں آرام فرما رہے ہوں گے یہ خیال کر کے اپنے مخصوص مزاج اور ظریفانہ طبیعت کے مطابق زمین کے قریب جھک کر وہاں سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے زبان سے بڑی زور سے کہا "اقاہ جناب حاجی صاحب السلام علیکم" یہ کہتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ کھلی بڑھایا جب قریب ہوئے تو دیکھا کہ حضرت اقدس ہیں۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب کی تو گویا جان ہی نکل گئی بالکل دم بخود رہی تو ہو گئے اور بڑی لجاجت سے عرض کیا حضرت بڑی گستاخی ہوئی معاف فرمادیجئے! بڑی بے ادبی ہوئی معاف فرمادیجئے! حضرت والا نے حکیم صاحب کے سر کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے فرمایا کہ جان کے تو ایسا نہیں کہا کھانا؟ کہا حضرت نہیں بالکل نہیں مجھے حاجی مطیع اللہ صاحب کا دھوکا ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا جاؤ اب نہ ایسا کرنا۔ خیر یہ دونوں واقعے تو دالان پر ضمنایا د آگئے تھے۔ عرض یہ کرنا تھا کہ حضرت اقدس کے گور کھپور تشریف آوری کی اطلاع آنا فانا شہر میں اور اطراف میں ہو گئی اور اب گویا یہاں دینی بہار کا موسم ہی آگیا مجلسیں ہونے لگیں اور ہر طبقہ (دروسا، تجار، اہل دفا تر نیز عوام وقتاً فوقتاً آنے لگے اور آکر فیضیاب ہونے لگے۔ مجلس کا وقت مقرر ہوا اور وقت مقررہ پر باقاعدہ مجلس ہونے لگی جس میں اہل طلب جوق در جوق شرکت فرمانے لگے۔

اہل وطن سے حضرت کا کچھ مواخذہ تھا اس کے باوجود حضرت اقدس کی جدائی کا ان پر جو اثر تھا ظاہر تھا، فچیور کا مکان خالی ہو گیا خانقاہ خالی ہو گئی مسجد خالی ہو گئی، مجین اور نخلصین اب جو ادھر سے گزرتے تو بغیر روئے نہیں گذر سکتے تھے اللہ تعالیٰ کی مصلحت سب پر غالب ہے اس میں دم مارنے کی مجال کسی کو نہیں بہر حال سینہ پر پتھر باندھ کر لوگ کبھی کبھی خانقاہ میں بھی جاتے اور نماز پڑھنے پانچوں وقت

مسجد میں آتے ہی تھے۔ چنانچہ تھوڑا عرصہ گزرنے پر اعزہ و اقربا یا مخصوص خدام نے گورکھپور حاضری کی ہمت کی ڈرتے ڈرتے مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کی کوٹھی میں قدم رکھا کسی سے کہلا بھیجا کہ فچپور سے فلاں فلاں حاضر ہوئے ہیں بس پھر کیا تھا حضرت پر ایک اثر ہو جاتا جس کو دیکھنے والے ہی جانتے تھے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ حضرت والا لوگوں کے اصلاحی مقصد کے پیش نظر کڑی سے کڑی گرفت فرماتے حتیٰ کہ جو شخص واسطہ بنتا وہ پریشان ہو جاتا کبھی کبھی سنا ہے کہ ایسا بھی ہوا کہ گورکھپور کے مخصوص لوگ واسطہ ہوئے ہیں اور حضرت اقدس کے غصہ اور ناراضگی کو دیکھ کر اسی لہجہ میں ان وطن سے آنے والوں سے اسی لہجہ میں انھوں نے بھی گفتگو کر لی (مثلاً یوں کہہ دیا کہ آپ لوگ یہاں کیوں آتے ہیں جبکہ حضرت والا کو ایذا ہوتی ہے؟ کچھ دنوں نہ آئیے تو کیا حرج ہے بلا وجہ آپ لوگوں کے آنے کی وجہ سے حضرت والا سخت تکلیف میں پڑ جاتے ہیں اور انکا اچھا خاصا سکون مکدر ہو جاتا ہے) میں نے سنا کہ جب حضرت اقدس کو اسکی اطلاع ہوئی کہ واسطہ صاحب نے میرے گاؤں کے لوگوں کو بطور خود اس اس طرح ڈانٹا ہے تو خود ان سے اس پر مواخذہ ہو گیا۔ یعنی یہ کہ حضرت والا کا کہنا سنا تو اصلاح کے لئے ہوتا تھا باقی حضرت ان لوگوں کی محبت کو جانتے تھے اور وطن میں جو قربانیاں حضرت کے لئے ان حضرات نے دی تھیں اسکا عشر عشر بھی کوئی دوسرا نہیں دے سکا تھا اسلئے حضرت انکی محبت کی قدر فرماتے تھے اور دوسرے لوگ اعتدال پر نہ رہتے، گو نثار انکا بھی حضرت کی راحت رسانی ہی ہوتی تھی مگر ذرا لہجہ ترش اور الفاظ سخت فرما جاتے جسکا اثر ان آنے والوں پر تکلیف دہ ہوتا اسلئے یہ طرز بھی حضرت کو پسند نہ ہوتا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ واقعی حضرت کے کسی سے مواخذہ کرنے کی حالت میں کسی کا واسطہ بنا کچھ کھیل نہیں تھا اسکا بھی پورا امتحان ہو جاتا تھا خود حضرت فرماتے تھے کہ واسطہ بنانے میں میری مصلحت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ شخص سامنے ہوگا تو شاید مجھے ہی غصہ آجائے تب کام بن سکے گا اور سامنے ہونے کی صورت میں

وہ مرعوب بھی ہو کر سوالات کا جواب بھی نہ دے سکے گا اس لئے واسطہ کے ذریعہ سے سوال و جواب کرتا ہوں اس میں دونوں کی مصلحت ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ مواخذہ والے کا تو دماغ پریشان ہوتا ہے واسطہ والے صاحب کو چاہئے کہ بات کے سمجھنے سمجھانے میں اسکی اعانت کریں۔ چنانچہ ہم لوگوں کی کج فہمی کم عقلی سے کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ واسطہ خود شیخ بن جاتا تھا یہی حضرت کو ناگوار ہوتا اس پر کبھی کبھی تو مجرم کی معافی ہو جاتی اور واسطہ صاحب شکستہ میں آ جاتے تھے۔

بہر حال وطن سے آنے جانے والوں سے مواخذہ بھی ہوتا رہا مگر اہل محبت یہ سمجھ کر برابر آتے بھی رہے کہ

داغ جاتے تو میں مقتل میں پہاڑ سب دیکھنے دار کرے وہ ستم آرا کس پر
جانتے تھے کہ حضرت سخت ناراض ہیں جائیں گے تو ڈانٹ پڑے گی اور ہو سکتا ہے کہ
جھپڑ یا بھی دیئے جائیں اور دوچار تھپڑ بھی لگ جائے مگر انکا حال تو یہ تھا کہ
توہم کے ترش رو مجھے گالی ہزار دے یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

جس طرح سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہوتا ہے کہ مومنین میں سے اہل فسق اور
اہل غفلت پر خود تو نکیر فرمائی ہے انکو زجر بھی فرمایا ہے لیکن عام مخلوق کو اسکی اجازت
نہیں دی کہ وہ کسی بے عمل مسلمان کی غیبت یا شکایت کریں یا اسکے عیوب کا تجسس
کریں یا اسکو حقیر جانیں اسی طرح سے یہ حضرات مشائخ بھی جو متخلق باخلاق اللہ ہوتے ہیں
اپنے موافق اور مخالف کو پہچانتے ہیں اور انکو سمجھ کر ان کے ساتھ کوئی معاملہ فرماتے
ہیں۔ کسی پر نکیر بھی فرماتے ہیں تو اسکی اصلاح کے لئے، غصہ بھی ہوتے ہیں تو اس کے
نفع کے لئے اور خود تو یہ معاملہ فرماتے ہیں مگر اسکو بالکل پسند نہیں فرماتے کہ دوسرے لوگ
انھیں اپنی نظروں سے گرا دیں اور حقیر گردانیں چنانچہ یہاں بھی موافقین اہل وطن سے
حضرت ناراض تھے اور ظاہر ہے کہ انہی ادنیٰ تا سمجھی سے حضرت والا کو کس قدر زبردست
نقصان پہونچا کیسی اذیت ہوئی کہ وطن ہی کو خیر باد کہنا پڑا اور یہ سب جانتے ہیں کہ وطن کا
ترک کس قدر تکلیف دہ اور نفس پر شاق ہوا کرتا ہے۔

مگر جو ایذائے قلبی و روحانی حضرت والا کو پہنچی تھی وہ اس قدر زیادہ تھی کہ اس کے مقابلہ میں ترک وطن جیسا مرحلہ بھی معمولی اور آسان تھا۔ پس گو حضرت والا بطور خود ان سے خفا تھے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہر شخص انکو ملامت اور ہر شخص کو کرے کیونکہ بہت سے حضرات ان میں صاحب نسبت اور پابند اوقات بھی تھے اسی طرح سے صاحب معمول اور بے قصور بھی تھے لیکن عموم مواخذہ میں وہ بھی ماخوذ تھے اب انہیں کون کس درجہ کا تھا ظاہر ہے کہ اسکو تو حضرت اقدسؒ ہی سمجھ سکتے تھے، اس لئے کسی دوسرے کو اجازت نہ تھی کہ اپنی جانب سے کسی کو کچھ کہے ہاں جبکہ حضرت والا خود ہی کسی کے معاملہ میں واسطہ بنادیں تو اس کے لئے بطور نصیح نصیح کے یا صلاح و مشورہ کے کچھ کہنے سننے میں مضائقہ نہ تھا۔

اس طور پر حضرت والا کے گورکھپور آجانے پر بھی وطن کے مجین اور مخلصین برابر آتے رہے اور حضرت اقدسؒ سے برابر ملتے رہے اور معافی طلب کرتے رہے اور حضرت اقدسؒ سے اپنے اس ناقابل تلافی نقصان کا ذکر کر کے روتے بھی رہے اور ایسی جلیل القدر نعمت سے محروم ہو جانے پر کھٹ افسوس بھی ملتے رہے۔ حضرت والا بھی بالآخر انکی آہ و فغاں سنا اور ان کے قلبی رنج و غم کو محسوس فرما کر متاثر ہوتے اور نرم ہو جاتے اور پھر انھیں تسلی دیتے اور ہجرت کے فوائد ان سے بیان فرماتے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنے کی تلقین فرماتے معتقدین مجاہدین طالبین کے ساتھ تو حضرت اقدسؒ کا یہ معاملہ رہا — اور مخالفین و معاندین نے اس اتنے ظلم و ستم پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ فساد کرنے کے بعد مقدمہ کا بھی سلسلہ شروع کر دیا یہاں تک کہ حضرت اقدسؒ کے نام کو بھی شامل مسل مقدمہ کر لیا گیا اسلئے کہ ان کو وکلاء نے یہ مشورہ دیا کہ تمھارا مقدمہ بہت کمزور ہے تم لوگ منزایاب ہو جاؤ گے، لہذا اس سے بچت کی شکل صرف یہ ہے کہ کسی بڑے آدمی کا نام مثلاً مولانا ہی کا نام داخل مقدمہ کرو تا کہ صلح پر بات آجائے ظاہر ہے کہ حضرت مولانا پکڑی جانا پسند نہ فرمائیں گے باہم صلح ہو جائیگی اور تم لوگ منرا سے بچ جاؤ گے۔

یہاں مجھے روادِ مقدمہ بیان کرنا نہیں ہے اور اب اسکے بیان سے کوئی فائدہ بھی نہیں لیکن فساد کی تفصیل اور بانی فساد کا ذکر ہم نے نام لیکر اس لئے کیا ہے تاکہ آپ کے پیش نظر خدا کی شان اور حضرت اقدس کی کھلی ہوئی کرامت آجائے کیونکہ مولوی علیم اللہ صاحب کی طرح یہ سپاہی صاحب بھی مقدمہ ہو جانے کے بعد تائب ہو گئے تھے اور اس وقت حضرت والا گورکھپور سے الہ آباد تشریف لا چکے تھے وہ صاحب یہیں آئے روئے گائے اور معافی چاہی، حضرت والا نے اپنے کرم سے اتنے بڑے مجرم کو دل سے معاف فرما کر سنتِ یوسفیؑ کی یاد تازہ فرمادی انھوں نے بھی عزیزِ مصر ہونے کے بعد اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا لَا تَذْرُبْ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (جادو تم پر آج کے دن کوئی ملامت نہیں ہے تمہیں اللہ بخشنے اور تمہارا قصور معاف فرمائے وہ سب رحم فرمانے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے)

اسکے توبہ کی اور حضرت اقدس کے معاف فرمانے کی داستان ذرا طویل بھی ہے اور کسی قدر سبق آموز بھی اسلئے ہم اسکا مفصل بیان انشاء اللہ تعالیٰ قیام الہ آباد میں کریں گے یوں کہنے کو تو کسی شاعر نے محض شاعری کے طور پر کسی موقع پر یہ کہا تھا لیکن ہم نے تو اپنے حضرت مصلح الامۃؑ کے حالات میں شمس الدین مرحوم کی توبہ کو اسی کا پورا مصداق پایا کہ ۵

سُی مَرَّ قَتْلُكَ بَعْدَ اس نَعَفَا سَ تَوْبَهُ

ہائے اس زودِ پشیاں کا پشیاں ہونا

اور یہ اندازہ ہوا کہ حالات و بیان کے سلسلہ میں کسی ایسے شخص کا کوئی سابقہ واقعہ بیان کرنا جو پہلے دورِ جہالت و مخالفت سے گزر کر بعد میں مخلص ہو گیا ہو بڑا مشکل ہوتا ہے کیونکہ گزشتہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ اسکے بیان میں مطلقاً ادب و تعظیم کا کچھ بھی لحاظ نہ کیا جائے لیکن چونکہ علم میں یہ بھی ہوتا ہے کہ آئندہ تو یہ شخص راہِ راست پر آگیا تھا اسکے ساتھ بے ادبی کو بھی جی نہیں چاہتا چنانچہ ان مہربان

موصوف کا (جنگی وجہ سے حضرتؒ نے اپنا وطن چھوڑا تھا) اصلی نام تو شمس الدین خاں تھا لیکن جیسا کہ اہل دیہات کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ سیدھا نام کسی کا نہیں لیتے بلکہ اسے کچھ توڑ مروڑ ہی دیتے ہیں چنانچہ اسی قاعدہ کے مطابق گاؤں کے لوگ انھیں عام طور پر سُدی یا بطور محبت کے سُدیا کہہ پکارتے تھے، محل ہونے میں تو دونوں یکساں تھے کہ سُدی بھی شمس الدین کا ناتمام جزو تھا اور سُدیا اسی کا بگاڑا ہوا ایک لفظ تھا اس لئے میں نے کہیں کہیں انھیں شمس الدین مرحوم کو ان کے معروف فی القریہ نام سے بھی تعبیر کر دیا ہے، آئندہ حالات میں جہاں شمس الدین آئے گا تو اس سے یہی حضرت مراد ہوں گے۔

غرض جب حضرت والا گورکھپور تشریف لے آئے تو خود حضرتؒ ہی نے اپنی تشریف آوری کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ میں نے دیکھا کہ اب یہاں (وطن میں) رہ کر سکون کے ساتھ اپنا کام نہ کر سکوں گا یہ لوگ مجھے بھی اپنی ہی جماعت میں لے لینگے اور مجھے دین کا کام کرنا ہے اس لئے ان دنیا داروں سے دوری اختیار کر دو جب ہی کچھ کام کر سکوں گے چنانچہ وطن سے چلا آیا۔

اور کرمناؤں نے اعظم گڑھ میں مقدمہ دائر کر کے ایڑی چوٹی کا زور اس پر صرف کیا کہ کسی طرح سے حضرت والا کو بھی عدالت میں طلب کرالیں لیکن اللہ تعالیٰ نے نصرت فرمائی اور مخالفین اپنی اس کوشش میں ناکام رہے اور حضرت والا کو نہ صرف یہ کہ عدالت میں نہ جانا پڑا بلکہ سرے سے حضرتؒ کا نام ہی مقدمہ سے خارج کر دیا گیا۔ چنانچہ مولوی علیم اللہ صاحب کی خانقاہ میں حضرت والا کی مجلس میں تشریف آوری ان کے لئے پہلی شکست تھی تو یہ عدالت کی عدم حاضری دوسری شکست تھی جس کے ذریعہ خدا نے حضرت والا کا بول بالا اور ہجرت کو ابتداء فتح کا پیش خیمہ اور تکمیل فتح (یعنی فتح پوری) کا مقدمہ بنایا۔ فاکھد اللہ علی ذلک۔

یوں مظلوم ہو کر کسی کا عدالت حاضرہ میں چلا جانا کچھ عیب بھی نہیں لیکن مخالفین نے کچھ ایسی ہوا باندھ رکھی تھی کہ گویا حضرت کو طلب عدالت ہی کرالینا انکی عین کامیابی

تھی اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنے مخلص بندوں کی لاج رکھنی ہوتی ہے، ارشاد ہے
 وَهُوَ يَتَوَتَّى الصَّالِحِينَ وہی صالحین اور نیکو کاروں کا معین اور مددگار ہوتا ہے
 اسلئے اس موقع پر بھی مخالفین کو شکست فاش ہوئی اور بری طرح زک اٹھانی پڑی
 کہ حاضری تو بجائے خود رہی اصل مقدمہ سے نام ہی خارج ہو گیا، باقی چلنے کو
 تو مقدمہ چلتا رہا جس سے حضرت اقدس کا اب نام کا بھی تعلق نہیں رہ گیا تھا
 صرف اہل بستی اپنے مقدمہ کی پیروی کرتے رہے اور حضرت والا سکون و اطمینان
 کے ساتھ گورکھپور میں اپنا کار منصبی ادا فرمانے لگے اور مقامی حضرات کے علاوہ
 منہد کے اطراف و اکناف سے لوگوں کو آنے میں اور حضرت سے زیارت و ملاقات
 میں بہت آسانی پیدا ہو گئی، یہ خدائی حکمت تھی جس نے اس طور پر حضرت والا کو
 یہاں لا پہنچایا

(گورکھپور کا تقریباً ۱۲ سالہ قیام)

(رمضان ۱۲۷۶ تا ربیع الثانی ۱۲۷۷ مطابق اپریل ۱۸۵۶ تا نومبر ۱۸۵۷ء)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں وطن سے سفر کے وقت مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم
 مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم ہمراہ تھے ہی اس لئے حضرت والا نے گورکھپور میں
 انھیں حضرات کے مکان پر قیام فرمایا۔ تھوڑا عرصہ مزید گزرنے پر حضرت نے راقم سے
 فرمایا کہ تم بھی اپنے بچوں کو یہیں بلاؤ چنانچہ مولوی امجد اللہ صاحب ہی کے مکان
 کے ایک حصہ میں میرے متعلقین کا بھی قیام ہوا، اندونوں مجلس حضرت والا اپنے
 شباب پر تھی جس میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگوں کا آہستہ آہستہ آنا ہونے لگا یعنی
 علمائے دین اور رؤسا شہر بھی ہوتے تھے، تاجرین کا خاصا طبقہ ہوتا، انگریزی اسکول
 کے مدرسین اور طلباء بھی ہوتے، پروفیسر اور پچرار صاحبان بھی تشریف لاتے،
 شہر کے معزز اطباء، علماء اور ذمی احترام حضرات بھی آتے اور آئے دن
 لکھنؤ، تھانہ بھون، بریلی، الہ آباد، بنارس، غازی پور، بلیا، مو، اعظم گڑھ سے

بعض اہل علم حضرات بھی تشریف لاتے رہتے۔ ان کے علاوہ شہر کے عوام کا
مرجوعہ بھی خاصا ہونے لگا تھا جسکی وجہ سے بڑا مال روزانہ ہی قریب قریب
بھر جاتا تھا۔ جیسے ہر روز صبح آٹھ بجے سے نو بجے تک مجلس عام ہونے لگی۔
مجلس کا انداز وہی تھا جو وطن میں تھا کہ کتابوں کے حوالے سے
بلکہ ان کے صفحات کھول کھول کر مضامین نکالتے اور حاضرین کو سناتے اور
اسکے لئے کچھ روح المعانی، احیاء العلوم، فتح الباری اور حجتہ اللہ البالغہ
ہی لازم نہ ہوتی بلکہ اصلاحی کام گلستان، بوستان، اخلاق محسنی اور تصوف کی
ضرورت مالا بد سے بھی بیان فرماتے تھے۔

اس درمیان میں جب جب یہ واقعہ ہوتا کہ وطن سے کوئی صاحب تشریف
لے آتے تو پھر مواخذہ اور عتاب از سر نو شروع ہو جاتا اور اچھا خاصا جمالی ماحول
شانِ جلالی میں تبدیل ہو جاتا۔ چنانچہ یہ معاہدہ اور مواخذہ اوقات مجلس کے علاوہ
دوپہر یا شام کو بھی جاری رہتا اور حضرت کا انداز مواخذہ بھی وہی ہوتا جو وطن
میں تھا بڑی زور سے رٹتے گرجتے اور مارے غصہ کے چہرہ سرخ ہو جاتا اور
بولتے بولتے منہ سے کبھی کبھی جھاگ بھی نکل پڑتی تھی۔ جب کبھی یہ کیفیت
زیادہ ہو جاتی تو اکثر مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم ہی سامنے آتے اور کسیکی تو
ہمت ہی نہ پڑتی تھی مولوی صاحب ہی حضرت سے نہایت عاجز ہی عرض کرتے
کہ حضرت بس نیچے آپ کو تکلیف ہو جائے گی اور اس صاحب واقعہ کو سامنے ہے
مٹا دیتے۔ اس نوع کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے تھے یہ نقشہ بھی
اہل گورکھپور کے لئے کیا مرد کیا عورتیں سب کے لئے جدید ہی تھا اور عجیب بھی۔
چنانچہ ایک دن مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم نے (حضرت والا کو نشاط کی حالت
میں پا کر) عرض کیا کہ حضرت کل آپ فلاں صاحب پر خفا ہو رہے تھے اور زور
زور سے انکو ڈانٹ رہے تھے اسکی آواز میرے گھر میں بھی جا رہی تھی (جس مکان
میں حضرت کا قیام تھا اسی سے متصل دوسرے مکان میں مولوی نثار اللہ صاحب

رہتے تھے اس طرح پر کہ اگر درمیان کے دروازے کھول دیے جائیں تو دونوں مکان گویا ایک ہی معلوم ہوتا، اہلیہ نے سنا اور اسکو سنکر وہ بہت ڈر اور سہم گئیں اور گھبرا گئیں اور کہتی تھیں کہ مجھے تو اختلاف ہونے لگ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے تو بطور تفریح کے ایک واقعہ بیان کیا چنانچہ حضرت والا سپر بڑی زور سے ہنسے بھی لیکن حضرت والا کی طبع حساس نے اسکا دوسرا اثر بھی لیا اسوقت تو سنکر خاموش ہو گئے مگر دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ اب کسی پر اس طرح مواخذہ نہیں کروں گا اور چند دنوں کے بعد غالباً مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم ہی کے ذریعہ اہل مجلس سے اصلاح پر دل سے متوجہ نہ ہونے کے سلسلہ میں کچھ عام جواب طلب ہوا اسی سلسلہ میں مولوی صاحب نے یہ بھی آکر حاضرین سے کہا کہ حضرت والا نے فرمایا ہے کہ ”میں نے تو اپنے کو بدل لیا ہے اب آپ لوگ اپنے کو کب بدلیں گے؟“ اس اپنے کو بدلنے سے مراد حضرت کی وہی مواخذہ میں نرمی فرمانا تھی اور اسکے ذریعہ سے ہم لوگوں سے عمل کا مطالبہ تھا کہ مجھے مواخذہ میں نرم کر تے ہو تو تم بھی عمل میں سخت ہو جاؤ لیکن خیال یہ ہے کہ حضرت والا نے یہ کیوں فرمایا اسکو بہت دنوں تک کسی نے نہیں سمجھا تھا خود حضرت ہی نے ایک دن اسکی وضاحت فرمائی تو وہ سمجھ میں آئی بیج ہے صر۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔

گورکھپور کے قیام میں چند حضرات نے خصوصی طور پر حضرت والا کی خدمت میں اپنے کو پیش کر رکھا تھا۔

۱۔ ایک تو یہی مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم تھے ماشار اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے بھی خوب ہی خوب نوازا تھا اتنا بڑا شخص ایم۔ ایل۔ اے بھی رہ چکا ہوا اور اپنے وقت میں کسی کو خاطر میں نہ لاتا ہو حضرت کے آگے جس تو وضع سے پیش آئے وہ ہسم جیسوں کے لئے باعث عبرت ہے ۵
تواضع زگردن فرازاں نکوست گداگر تواضع کند خوائے دوست

(تواضع بڑے لوگوں کی جانب سے ہو تو زیب دیتی ہے باقی فقیر اور غریب اگر تواضع بخو گیا تو کیا کرے گا) قرآن شریف کے حافظ تھے اور حافظہ بھی بے مثل تھا، فارغ اوقات میں بس تلاوت قرآن ہی فرماتے تھے، قرآن شریف سے گویا عشق تھا، بڑے ہی خوش مزاج، خوش مذاق اور خوش پوشاک اور خوش خلق انسان تھے مدینہ شریف میں مکان بنوایا تھا خیال تھا کہ ہجرت کر کے وہیں آخری ایام گزارینگے۔ جن دنوں حضرت والا کا قیام الہ آباد میں تھا ہجرت کے خیال سے گورکھپور سے سفر کر کے حضرت سے آخری ملاقات کرنے کے لئے الہ آباد تشریف لائے، حضرت اقدس بھی بنفس نفیس انکو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تشریف لے گئے، ہم سب خدام بھی گئے اسوقت عظمت و محبت شیخ کا جو مظاہرہ مولوی صاحب مرحوم نے فرمایا ہے آج بھی وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے حضرت اقدس سے آخری مصافحہ اور معانقہ چشم گریاں اور دل بریاں کے ساتھ کرتے کرتے حضرت کے قدموں میں گر گئے اور حضرت کا جو تہ حضرت کے پیروں سے نکال کر اپنے سینے سے لگایا اور بھرے پلیٹ فارم میں اپنے سر پر رکھ لیا چنانچہ جاننے والوں نے دیکھا کہ نعم الامیر علی باب الفقیر کا یہ مصداق تھے۔ اور حضرت والا نے انتہائی مسرت کے ساتھ انھیں دعائیں دیں اور خوشی خوشی رخصت کیا یہ محبت اور عشق کے جذبات اور حالات میں ہر ایک کو نہ میسر نہ ہر ایک کو اسکی قدرہ

سرد غم عشق بوالہوس راند مند سوز دل پروانہ گس راند مند

(سرد غم عشق حقیقی کا غم اہل ہوس کو نہیں عطا ہوتا نہ پروانہ کے دل کا سوز مکھی کو بخشتے ہیں) اللہ کی مرضی کہ مدینہ شریف میں جا کر بیمار ہوئے قلب کے مریض تھے دورہ شدید پڑا لوگوں نے علاج کے لئے ہندوستان آنے کا مشورہ دیا چونکہ یہاں کے علاج سے پہلے نفع ہوتا رہا تھا کوئی یہ کہنے والا نہ ملا کہ جب مدینہ شریف مرنے ہی کیلئے آئے ہیں تو پھر یہ رجعت قہر می کیسی؟ لیکن ماشاء اللہ کائنات خدا ہی جو چاہتا ہے ہوتا ہے بمبئی اترے تو حالت نازک سے نازک تر ہو گئی جہانسی پہونچتے پہونچتے اس عالم فانی

سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ بالآخر لکھنؤ میں
نقش اتار دی گئی اور وہیں انہی آخری آرام گاہ بنانا تجویز ہوا اللہ تعالیٰ کو منظور
یہی تھا۔ واقعی خدا تعالیٰ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کیا کیا خیال
قائم کرتا ہے لیکن اسکی بے کسی و بے بسی مولوی صاحب کے اس واقعہ سے
نمایاں ہے۔ خود مدینہ میں رہنے بلکہ مرنے کا ارادہ کیا لیکن خمیر لکھنؤ کی تھی چاروناچا
وہاں سے آنا پڑا اور اپنے وطن بھلی نہ پہنچ سکے۔ مولانا محمد علی جوہر کا شعر
قدرے تغیر کے ساتھ انکے حسب حال ہوا کہ

مارا دیار منہ میں مجھ کو وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بکسی کی لاج
بہر حال خدا بخشتے بہت سی خوبیاں بقیں مرنے والے میں۔

۲۔ گورکھپور کے خدام خاص میں سے دوسرے بزرگ ہمارے محترم اور عزیز
مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم تھے۔ آپ یوں تو مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم
کے برادرِ خور و تھے لیکن حضرت اقدس سے تعلق کے باب میں آپ کو تقدم کا
شرف حاصل تھا چنانچہ اپنے برادرِ محترم مولوی نثار اللہ صاحب کو حضرت سے رشتہ
بلکہ متعلق ہونے میں واسطہ آپ ہی بنے تھے گورکھپور کے بڑے رؤساء میں سے شمار
تھا لیکن بڑے ہی خلیق۔ منکسر المزاج۔ مہمان نواز غریب پرور تھے اور ہر ایک
سے نہایت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے تھے۔ جب حضرت کے متعلقین کا آپ کے
مکان پر قیام تجویز ہوا تو نہ صرف آپ ہی بلکہ آپ کا سارا گھرانہ ہی حضرت والا کی محبت
کی وجہ سے سب گھر والوں کی راحت رسانی میں پیش پیش نظر آتا تھا۔ چنانچہ مولوی
صاحب مرحوم کی حسن تربیت نے آپ کی سب صاحبزادیوں کو بھی حسن خلق کے زیور
سے آراستہ کر رکھا تھا جسکی وجہ سے حضرت کے متعلقین کو ہر پوچھنے تو گورکھپور
میں وطن ہی جیسی راحت ملی اور ترک وطن کا جو زخم قلب میں ہو گیا تھا ان سب کے
اخلاق اور خدمات نے اس پر مرہم رکھ دیا تھا۔ پورے طور پر انصاف کی سنت
ادا کی اور ہاجرین کو پردیس، پردیس ہی نہ معلوم ہونے دیا۔

اور حضرت والا نیز حضرت کے مہمانوں کا قیام چونکہ مولوی نثار اللہ صاحب کے عزیز و وسیع مکان میں ہوا تھا اسلئے ان سب کی راحت رسانی میں مولوی نثار اللہ صاحب کے بڑے داماد بھائی مسعود احمد صاحب نے نمایاں طور سے حصہ لیا اللہ تعالیٰ ان کو جزائے غیر عطا فرمائے۔ بہت ہی خوش مزاج اور نیک خصلت آدمی تھے حضرت والا کے گورکھپور سے الہ آباد تشریف لے آنے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انکا انتقال ہو گیا اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

یہ ہمارے مولوی امجد اللہ صاحب بڑے ہی پر لطف انسان واقع ہوئے تھے، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ فچپور میں مجلس میں کسی سلسلہ سے مال اور امرار کا تذکرہ آ گیا مولوی صاحب بھی موجود تھے حضرت والا یہ فرما رہے کہ مالدار می کا ایک خاص اثر اور نہ ہر ہوتا ہے اور کم و بیش وہ ہر امیر میں ہوتا ہے الا ماشاء اللہ اور اسکے بعد مولوی امجد اللہ صاحب کی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں آپس سے نکل گئے ہیں۔ سبحان اللہ شیخ کے ساتھ کس طرح سے پیش آئے ہونگے کہ حضرت سے یہ کہلوا یا ہی یا ورنہ کسی کی تعریف وغیرہ کر نیکا وہ بھی اس طرح سے اس کے منہ پر حضرت کا مذاق اور معمول نہ تھا۔ مولوی صاحب آخر آخر میں (یعنی بھائی صاحب مولوی نثار اللہ صاحب کے وصال کے بعد) مدینہ کی جائداد کے نظم و انتظام کے لئے سال کا اکثر حصہ وہیں گزارتے تھے صرف آموں کی فصل میں چند مہینے کیلئے اپنے وطن گورکھپور آ جاتے اور فارم پر نیمانہ گزارتے، چنانچہ اس بار بار ہر سال آنے جانے کی وجہ سے اہل عرب سے تعلقات ہو گئے تھے اسکے پیش نظر اپنے ملک کا تحفہ یعنی آم امرود وغیرہ اور اسکے پودے بکثرت عرب لیجاتے تھے حتیٰ کہ لطف مجلس کے لئے اور اہل عرب کو نئی سوغات سے روشناس کرانے کے لئے کبھی کبھی ہوائی جہاز کے سفر سے بھی اپنے فارم سے کٹھلے جاتے جو وہاں کے لئے نئی چیز ہوتی شیوخ عرب کی دعوت کرتے اور خوب کھاتے کھلاتے ان کے اس خلق سے عرب کے علماء اور

وہاں کے بڑے بڑے لوگ بھی متاثر تھے۔ بہت سے لوگوں کے باغات میں آپ نے آم کا درخت لگا بھی دیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ جب حضرت اقدسؒ نے سفر حج کا ارادہ فرمایا تو مولوی صاحب موصوف مدینہ شریف ہی میں تھے برے خوش تھے اور اپنا پورا مکان حضرتؒ اور حضرت کے رفقاء کے لئے خالی کر رکھا تھا۔ جدہ پر استقبال کے لئے موجود تھے لیکن ملاقات مقدر نہ تھی کیونکہ حضرت اقدس جدہ یعنی باب مکہ سے ذرا پہلے ہی اپنی آخری آرامگاہ میں تشریف لے جا چکے تھے جسکی تفصیل ناظرین حضرت والا کے آخری سفر حج میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور پھر حضرت اقدس کی جدائی سے چند ہی سال بعد یہ محب و شہید ابھی اپنے شیخ سے جا ملا جسکا واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز (عید کا دن گزار کر) شب میں تقریباً ۱۱-۱۲ بجے تک مدینہ شریف کے علماء اور شیوخ عرب کو اپنے مکان پر مدعو کیا تھا خاطر مدارات کے بعد بھی باہم تفریحی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا بالآخر سب لوگ اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے اور مولوی صاحب بھی اپنے بستر پر لیٹے اور سو گئے مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد حوالی قلب میں شدید درد کیوجہ سے آنکھ کھل گئی اور بستر پر تڑپنے لگے گھر کے سب لوگ بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹر بلا یا گیا اس نے بھی پوری کوشش کی لیکن وقت موعود آچکا تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی شب ہی میں انتقال ہو گیا صبح چاشت کے وقت مسجد نبوی میں جنازہ کی نماز ہوئی اور جنت بقیع میں دفن کر دیئے گئے۔ عید کا دوسرا دن تھا اسلئے بہت سے اجاب آج بھی امجد اللہ صاحب سے ملنے کے لئے آئے تو معلوم ہوا کہ صبح جو جنازہ پڑھا گیا تھا وہ مولوی صاحب ہی کا تھا ان حضرات کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ابھی رات تو ہم سب کے ساتھ گفتگو کی تھی، بہر حال آپ کی اس اچانک جدائی نے ان کے رنج اور قلق میں مزید اضافہ کر دیا اور گھر والوں کے حال کا کیا پوچھنا وہاں بھی اور یہاں بھی جس جس نے سنا انتہائی افسوس کے ساتھ اس خبر کو سنا مگر اس غم میں سکون اور زخم پر مرہم کا کام اس خیال نے کیا کہ ”مدینہ النبی“ کو تا صبح قیامت آپ کے سونے کا

مقام ہونا خدا کی جانب سے مقدر ہوا ہے۔ ع۔

خدا یہ موت دے سب کو ہم اس مرنے پہ مرتے ہیں
اس میں شبہ نہیں کہ مولوی صاحب موصوف کو حضرت والا سے قلبی تعلق
تھا اور آپ نہایت ہی مخلص شخص تھے۔ حضرت والا سنایا کرتے تھے کہ امام غزالیؒ
نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ ”مقادیر الاموال موازین المحبۃ“ یعنی مال کی مقدار
محبت کے ناپنے کا آلہ ہوا کرتا ہے اس اصول کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ مولوی
صاحب موصوف حضرت والا کے محب صادق تھے کیونکہ جان و مال ہر شے کو
حضرت پر قربان کر رکھا تھا ورنہ تو بالعموم آج ابنائے زمانہ کا انداز یہ ہے کہ
گر جان طلبی مضائقہ نیست و زر طلبی سخن دریں است

لیکن مولوی صاحب مرحوم اور آپ کے بھائی مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم
دونوں کو دیکھا گیا کہ ان حضرات کا ایشیاء بے مثال تھا یعنی حضرت والا کے متعلقین
خاص کا نیز طلبہ اور طالبین سب کے قیام و طعام کا نظم آپ ہی حضرات سے متعلق
تھا اور وہ بھی دو چار دن کے لئے نہیں بلکہ تقریباً سال ڈیڑھ سال رہا۔ اللہ تعالیٰ
ان حضرات کو انہی خدمات کا پورا پورا صلہ عطا فرمائے۔

مولوی امجد اللہ صاحب چونکہ راقم کے پیر بھائی ہونے کے علاوہ عزیز خاں
بھی تھے کہ میرے چھوٹے بھائی میاں حافظ عبدالعزیز سعدی سلمہ کے خسر تھے
اس لئے ناظرین سے راقم کی مکرر درخواست ہے کہ مولوی امجد اللہ صاحب
کے لئے دعائے مغفرت فرمادیں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ راقم نہ تو مضمون نگار ہے اور
نہ سوانح نویس اس لئے تحریر کا نہ طریقہ معلوم نہ سلیقہ ہی آتا ہے لیکن ایک کام
جب سر ہی آپڑا تو کسی نہ کسی طرح اسے بنا ہوا ضرور ہے اس لئے میں نے
یہ خیال کیا کہ حالات قیام گورکھپور کو اس ہج سے لکھوں کہ پہلے وہاں کے چند
مخصوص مخلص حضرات کا تعارف کراتے ہوئے ناظرین کی خدمت میں ان کے کچھ

احوال پیش کردوں جو حضرت اقدسؒ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے گویا حضرت
 ہی کے حالات شمار ہونگے اور پھر درمیان میں جہاں کہیں انکا نام آئے گا
 تو آپ کے سامنے وہ اپنے ان حالات کے آئینہ میں متصور نظر آئیں گے۔ نیز
 کسی بھی جگہ کے جزئی جزئی حالات تمام کے تمام ممکنہ مستحضر بھی نہیں ہیں تاہم
 اس طرح سے ذکر و حال اور ان کے احوال کے ذریعہ کچھ نہ کچھ روشنی حضرت اقدسؒ
 کے احوال پر بھی پڑ ہی جائیگی۔ چنانچہ دو مخصوص حضرات کا ذکر کر چکا ہوں اب
 اور چند مخصوص حضرات کا ذکر سنئے:۔

۳۔ مولوی سید وصی الدین صاحب مرحوم مدرس مدرسہ سعیدیہ۔ چھوٹا قاضی
 گورکھپور۔ آپ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے مفتی نظام الدین صاحب مفتی دیوبند
 اور ڈاکٹر محمد ظفر صاحب اردلی بازار بنارس کے اور خود اس راقم کے بھی خاص عزیز
 تھے یعنی راقم کے سب سے چھوٹے بھائی میاں عبدالعلیم عیسیٰ خطیب جامع مسجد
 فیروز آباد کے سسرالی رشتہ دار تھے دیوبند کے فارغ تھے حضرت قاری محمد طیب
 صاحب کے ساتھ بے تکلف تھے اور ہمارے حضرت کے قدیمی خدام میں سے تھے
 سید تھے چنانچہ انکی زیادت ان کے معاملات و خلق سے نمایاں تھی۔ فہیم اور سمجھدار
 شخص تھے اور حضرت والا کے مزاج شناس بھی ہو گئے تھے۔ روزانہ بعد عشاء
 حضرت اقدس کے سر پر تیل لگانا ان کے اور ان کے ایک رفیق خاص مولوی غیا الدین
 صاحب کے ذمہ تھا حضرت کو سلا کر کچھ دیر ہم لوگوں کے پاس آ بیٹھتے اور ہمارے
 دن بھر کے تعب کو کچھ نس ہسا کر اور کبھی کچھ کھا کھلا کر دور کر کے اپنی اپنی مسجد چلے
 جاتے اور ہم سب خدام حضرت والا بھی سو رہتے۔ گورکھپور میں عرصہ سے قیام
 ہونے کی وجہ سے تقریباً ہر شخص کے مزاج سے اور اس کے حالات سے یہ واقف
 تھے اسلئے حضرت کو ان کے مشورہ پر اطمینان تھا آپ مدرسہ سعیدیہ کے صدر مدرس
 ہونے کے علاوہ مولوی امجد اللہ صاحب کے چھوٹے بچوں اور بچیوں کے اتالیق بھی
 تھے مولوی صاحب مرحوم یاد آ جاتے ہیں تو گورکھپور کا قیام یاد آ جاتا ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین بطور یادگار کے جناب سید
وصی الدین صاحب مرحوم کا ایک عریضہ اور حضرت مصلح الامۃ کی جانب سے اس کا
مصلحانہ جواب ملاحظہ فرمائیں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضرت والا کے یہاں
تقرب اور مقرب ہونے کا کوئی منصب نہیں تھا اور بڑا ہی صالح اور مخلص خادم بھی
جب اصلاح کی کسوٹی پر آجاتا تھا تو حضرت کے یہاں اپنی مصلحت سے زیادہ اسکی
مصلحت پیش نظر ہوتی اور پھر کسی قسم کی رعایت روا نہ ہوتی تھی اور اپنی راحت کے
خیال سے طالب سے ترک مواخذہ کو تو حضرت والا دیانت کے بھلی خلاف سمجھتے تھے
بلکہ اسکے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں خیانت تصور فرماتے تھے چنانچہ یہی اور اس قسم
کی بیشمار ادائیں تھیں جنکی بناء پر لوگ حضرت پر فدا تھے اور خدا حضرت کا ناصر و
مددگار تھا بیچ ہے من کان باللہ کان اللہ لہ جو اللہ تعالیٰ کا ہو گیا خدا اس کا
یقیناً ساتھ دیتا ہے۔

ایک دفعہ انھیں مولوی صاحب نے حضرت اقدس کو خط لکھا جس کے مضمون
کا حاصل تو یہ تھا کہ ایک جید عالم صاحب تھے جن سے انکی بے تکلفی تھی (حالانکہ خود وہ
بڑے شخص تھے حضرت تھانویؒ کے مجازین میں سے تھے) انکو حضرت اقدس کی جانب
انھوں نے متوجہ فرمانا چاہا اور مقصد صرف یہ تھا کہ حضرت والا کے پاس آمد و شد کا
تعلق ہو جائے تو نکھر کر بڑے کام کے لوگوں میں ہو جائیں گے۔ کچھ یہ اپنی مشکلات کو
حضرت سے حل کر لیا کریں گے کچھ حضرت اقدس کے تجربات و تعلیمات سے نفع اٹھالیں گے
اسکو انھوں نے ان الفاظ میں حضرت کو لکھا کہ :-

” فلاں مولانا صاحب تشریف لائے تھے عاصی کے یہاں قیام
کیا انکی خاطر مدارات میں کمی نہ ہوئی۔ حضرت والا کے مسلک (طوڑ طریق)
پر برابر احقر روشنی ڈالتا رہا (اسی سلسلہ میں) میں نے یہ بھی سنایا کہ
مجلس حضرت وصی اللہ سے نمود بہار تھا نہ بھون
چونکہ مولانا ۔ ۔ ۔ صاحب کی معیت میں حضرت تھانویؒ کی مجلس میں

بھی کافی شرکت کر چکا تھا اس لئے (بے تکلف تھے اور ان سے گفتگو میں) بہت آسانی ہوئی وہ حضرت سے اپنی ملاقات ہونے کی مدت چالیس سال بتلاتے تھے۔ حالات والا (دربارۃ اصلاح و ارشاد) سنا کہ فرمایا کہ — اللہ تعالیٰ جس بندہ سے اپنا کام لے لیں۔ اب وہ حضرت والا (کی زیارت و ملاقات) کے خود مشتاق ہیں اور استفادہ کے لئے تیار ہیں“

حضرت والا نے اس پر لکھا کہ (تحقیق: توبہ توبہ۔ یہ انکی بزرگی اور تواضع ہے)

(اور اسکے ساتھ ساتھ یہ تحریر بھی گئی)

”آپ نے لکھا ہے کہ فلاں صاحب استفادہ کے لئے تیار ہیں اس کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ فلاں صاحب تو خیر بڑے لوگ ہیں وہ مجھ سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں مجھ ہی کو استفادہ کرنا چاہیئے البتہ اگر آپ خود استفادہ کی فکر کریں گے تو وہ آپ کے لئے بھی نافع ہے اور میرے لئے بھی مفید ہے۔ باقی کسی دوسرے کے استفادہ سے تو آپ کو نفع ہوگا نہیں۔ اس لئے پہلے آپ خود ہی توجہ فرمائیے اپنی تکمیل کی طرف پھر دوسرے کی تکمیل تو اپنی تکمیل کی فرع ہے کیونکہ جبکہ آپ نے ابھی توجہ بھی نہیں فرمائی اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ اتنے اونچے شخص کو کتنے نیچے اتار لائے تو اگر آپ خود بھی توجہ فرماتے تو نہ معلوم کتنے نیچے والوں کو کتنی اونچائی پر پہنچا دیتے اور اس وقت مجھے بھی آسانی ہوتی کہ گورکھپور آپ ہی کو دیدیتا۔

یہ جو عرض کیا گیا ہے اسکو سمجھئے اور پھر مجھے لکھئے کہ آپ نے اس سے کیا سمجھا؟ ملاحظہ فرمایا آپ نے کیسے محبوب خادم تھے اور بات بھی خط میں ایسی ایسی لکھی تھی کہ عام طور پر شاخ کو یہ کچھ خوش ہی کر دینے والی تھی کہ نیک نیتی

کے ساتھ وہ ایک بڑے شخص کو افادہ و استفادہ کے لئے حضرت کی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ کیا بُرا تھا؟ لیکن حضرت اقدسؒ کے جواب سے ظاہر ہوا کہ حضرت والا کی نظر کار خود کن کار بیگانہ مکن۔ ”پر زیادہ تھلی اور گونا گوں مصائب کے پیش نظر حضرتؒ اسکو کچھ زیادہ پسند نہیں فرمایا بلکہ یہیں سے استنباط فرمایا کہ آپ کو جب اتنے بڑے آدمی کی اصلاح کی فکر ہے جو بطور خود شیخ ہیں تو ظاہر ہے کہ اگر آپ اپنی اصلاح کر لیتے تو دوسرے لوگوں کی اصلاح تو ضرور ہی کر لیتے اور اسوقت مجھے اپنے کام میں ایک معین کار مل جاتا اور ہو سکتا تھا کہ میں اسوقت اقلیم گورکھپور کو آپ ہی کے حوالہ کر دیتا۔ اب یہ تو معلوم نہیں کہ مولوی صاحب موصوف نے اسکا کیا جواب دیا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ بہت ہی شرمندہ ہوئے ہوں گے اور پھر اپنی اصلاح کی جانب دل سے متوجہ ہو گئے ہونگے انکے فہم و تواضع سے اسکی امید تو نہیں تھی کہ حضرت اقدس کے اس نوع کے ارشاد سے کہ۔ ”اسوقت مجھے بھی آسانی ہوتی کہ گورکھپور آپ ہی کو دے دیتا“ انھوں نے اجازت و خلافت کو ہی نہیں بلکہ باب اصلاح میں گورکھپور کی اکیبسی کا اپنے لئے اثبات کر لیا ہو کیونکہ مولوی صاحب اس مزاج کے انسان تھے نہیں ورنہ تو بعض حضرات کے متعلق سنا گیا ہے کہ اس سے کم الفاظ میں خلافت و نیابت شیخ سے کم درجہ مراد لینے پر راضی نہیں ہوئے ہیں۔

اس موقع پر ایک واقعہ مولوی صاحب مرحوم کا اپنے ساتھ کا بھی پیش آیا ہوا بیان کر دینے کو جی چاہتا ہے امید ہے کہ ناظرین و بچپی کے ساتھ سنیں گے اور ممکن ہے کہ کسی کو اس سے نفع ہی ہو جائے۔ حضرت کے وصال کے بعد ایک مرتبہ مولوی صاحب سخت بیمار ہوئے سرطان کی قسم کا کوئی دُبل اُن کی پشت پر نکل آیا تھا جس کی سوزش سے سخت پریشان تھے اور کسی کل چلن نہ آتا تھا میرا بھی کسی ضرورت سے گورکھپور جانا ہوا مولوی صاحب کی علالت کا علم ہوا عیادت کے لئے حاضر ہوا بڑی شفقت آمیز محبت سے ملے لیکن تکلیف سخت

تھی اسلئے میری مزاج پر سی پر انھوں نے یہ شعر پڑھ دیا کہ اپنا حال کیا بتاؤں بس
یہ حال ہے کہ ہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے
جواب سے اندازہ ہوا کہ بیچارے اپنی زندگی سے بھی مایوس ہو چکے ہیں اب
ایسے مریض کو تسلی دوں تو کیسے دوں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اللہ نے مدد فرمائی
اور یہ مضمون ذہن میں آیا میں نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ کی بیماری
بلاشبہ سخت ضرور ہے لیکن آپ کو اس پر انشاء اللہ تعالیٰ اجر بھی بڑا ملے گا
رہا وہ شعر جو آپ نے پڑھا ہے تو میرے نزدیک تو وہ آپ کے حسب حال نہیں
ہے اب دوبارہ اس شعر کو نہ دہرائیے گا۔ یہ غالب دہلوی کا شعر ہے جو کوئی با خدا
خدا ترس، ولی اللہ تو نہیں تھا بلکہ اس شعر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین اور نسبت
مع اللہ سے بھی شاید کورا ہی تھا کہ اس نے موت مومن کو ایک آخری اور بڑی مصیبت
سے تعبیر کیا ہے موت کا یہ اسلامی تصور تو نہیں ہے بلکہ اسلام تو کہتا ہے الموت جبراً
یوصل الحبیب الی الحبیب موت ایک پُل ہے جس پر چڑھنے میں ڈر بھی لگتا ہے مگر
وہ ایک محب کو اپنے محبوب سے ملا بھی دیتا ہے اور یہ مومن کا تحفہ ہے اسی لئے اسی دلی ہی
کے ایک صاحب نسبت بزرگ مرزا مظہر جان جاناں کے حالات میں لکھا ہے کہ
موت سے چند گھنٹے پہلے اپنے عزیز و اقارب کو تسلی دینے کیلئے خود یہ فرما گئے کہ ہ
لوگ کہتے ہیں کہ مظہر مر گیا درحقیقت مظہر اپنے گھر گیا
اور واقعی جنت مومن کا وطن اصلی اور دنیا اسکے لئے قید خانہ ہے۔ لہذا جب آپ کو
ابھن ہو تو اس شعر سے تسلی حاصل کیجئے اللہ تعالیٰ سے رجا زیادہ ہوگی اور قلب
میں سکون بھی پیدا ہوگا۔ جب میں نے اپنی تقریر ختم کی تو آپ نے نہیں کہا کہ مولوی
صاحب مرحوم کس قدر خوش ہوئے کہنے لگے ارے جاتی تم نے تو قلب پر برف ہی رکھ دیا
اس شعر کو اپنی کاپی میں نوٹ کر لیا اور مجھے بہت دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔
پھر اس مرض سے مولوی صاحب کو صحت ہو گئی تھی اور بہت دنوں کے بعد انکا انتقال ہوا۔ رحمہ اللہ رحمۃ دائرۃ

۴۔ مولانا افتخار الحق صاحب - امام مسجد مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم - جعفر بازار گورکھپور - آپ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب تلمیذ حضرت مولانا گنگوہی کے صاحبزادے ہیں۔ والد صاحب کا قیام مؤ میں تھا غالباً مولوی حبیب الرحمان صاحب اعظمی نے ان سے پڑھا بھی ہے۔ بڑے ذی استعداد ذی علم اور بزرگ شخص تھے۔ راقم نے خود حضرت اقدس سے سنا فرماتے تھے کہ کسی مسئلہ پر ایک نہایت ہی محققانہ مقالہ آپ کا حضرت مولانا تھانویؒ کی نظر سے گذرا حضرت نے فرمایا کہ میں مضمون کو پڑھتا جاتا تھا اور دل باغ باغ ہوتا جاتا تھا سو چتا رہا کہ مؤ میں کون صاحب ایسے ہیں جنکا یہ مضمون ہو سکتا ہے اور سمجھ میں نہ آیا آخر میں جب نام دیکھا تو میں نے کہا کہ بیشک مولانا عبدالغفار صاحب ہی ایسا مضمون لکھ سکتے تھے انھیں کا حق تھا۔

ہم نے تو گورکھپور میں جب بھی دیکھا مولوی سید وصی الدین صاحب کو اور مولوی افتخار الحق صاحب کو ساتھ ہی دیکھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ بہر حال اہل گورکھپور کے اکثر لوگوں کی اصلاح میں ان دونوں حضرات کی نمایاں کوششیں شامل تھیں شہر کا ایک گوشہ ایک صاحب سنبھالے ہوئے تھے اور دوسرا دوسرے صاحب لئے ہوئے تھے۔ اب مولوی وصی الدین صاحب کا تو انتقال ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ مولوی افتخار الحق صاحب کی عمر میں برکت عطا فرمائے حضرت اقدس کو خوش رکھتے تھے اور بڑے باپ کے بیٹے ہونے کے ناطے حضرت بھی ان سے بہت محبت اور پیار فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف سے حضرت کی تعلیمات کی اشاعت کا خوب خوب کام لے اور حضرت ہی کے طریقہ پر چلا دے۔ آمین۔

۵۔ حکیم مولوی وصی احمد صاحب - مالک علی گڑھ دو خانہ گورکھپور۔ محترم سے راقم کی پہلی ملاقات سیہان پور مدرسہ مظاہر علوم میں ہوئی تھی میرے ہم سبق تو نہ تھے البتہ ہم قرن تھے پھر اسکے بعد انھوں نے علی گڑھ جا کر طب پڑھی اور

اگر طب فرمانے لگے اپنی طبیعت ذہانت کی وجہ سے نوعمری کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں گورکھپور کی ہر مجلس اور ہر میٹنگ میں نمایاں مقام عطا فرمایا۔ انجمن اسلامیہ سے بھی خاص تعلق رہا اور حضرت اقدس کے حالات گورکھپور میں تو آپکا ایک اہم باب ہی ہے جو آگے ناظرین کی نظر سے گزرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

۴۔ حکیم ابوالکلام صاحب مدظلہ آپ دہلی کے طبیہ کالج سے غالباً فارغ تھے۔ نہایت ہی مہذب شائستہ کم سخن اور باوقار شخص تھے حضرت کی خدمت میں ایک بار کی طرح آگے پھر تو حضرت ہی کے ہو گئے۔ حضرت کو بھی انکی تواضع، ادب اور مسکنت پسند آگیا۔ چنانچہ معمول یہ بن گیا کہ صبح و شام کی تفریح میں حکیم ابوالکلام صاحب ہی رکشہ پر حضرت کے ہمراہ آیا جایا کرتے تھے۔

ایک بات یہاں اور واضح کر دوں جو بار بار آئیگی اور ہر نئے مقام پر آئیگی اور علم نہونے کے سبب سے نشاء غلط فہمی بن سکتی ہے وہ یہ کہ حضرت اقدس کی تفریح عام لوگوں کی تفریح کی طرح نہ ہوتی تھی بلکہ صبح و شام کی تفریح جو یہاں بالعموم رکشہ پر ہوتی اس میں حضرت اپنے تلاوت قرآن کا معمول پورا فرماتے۔ لوگوں کے مجمع میں سکون کے ساتھ موقع نہ ملتا اسلئے شہر سے کہیں دور پر چلے جاتے اور آتے جاتے میں مقدار معینہ تلاوت فرمالتے تھے پھر بعد اسکے رفیق سفر سے گفتگو بھی فرماتے یہی حضرت کی تفریح ہوتی تھی۔

جناب حکیم صاحب ایک زیرک اور فہیم شخص تھے نیز اہل شہر کی نظروں میں بھی باعزت اور خود شہر میں شہرت یافتہ شخص تھے اور حضرت مصلحتاً اپنے ساتھ ایسے ہی شخص کو رکھنا پسند فرماتے تھے جو شہر والوں میں شناسا ہو اور قدرے جاہ و عزت بھی رکھتا ہو اسلئے کہ اہل حق کے مخالف کم نہیں ہوتے بالخصوص نئی جگہ اور نئے شہر میں جہاں کسی سے یہ حضرات واقف نہ ہوں ایک ایسے آدمی کا ساتھ رہنا عقلاً بھی ضروری تھا جس کو لوگ احترام اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں خواہ وہ عظمت دنیوی جہت سے ہو یا دینی۔

اور حضرت والا خود بھی اس بات کو بڑے اہتمام کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں خود اپنے لوگوں میں سے بعض اہل علم کو یہ اعتراض تھا کہ حضرت جہاں تشریف لیجاتے ہیں تو امرار اور کسی صاحب جاہ و منصب ہی کے یہاں قیام فرماتے ہیں کسی غریب مسلمان کے یہاں خواہ وہ حضرت کا کتنا ہی محب ہو نہیں ٹھیرتے، حضرت ایسا کیوں کرتے ہیں؟ در اقم عرض کرتا ہے کہ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ حضرت مولانا تھانویؒ اپنے خلوص میں ضرب المثل ہو چکے تھے ورنہ تو شیطان نے ایسے حضرات کے لئے دنیا طلبی اور امرار فوازی کا الزام لگانے میں یہ ایک بڑا کامیاب ہتھیار یعنی وسوسہ ان حضرات کے دل میں ڈالا ہی تھا، ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ خود وہی معترض صاحب جو بڑے آدمی تھے ایک جگہ تقریر کے لئے گئے اور کسی چھوٹے سے عربی مدرسہ میں ٹھہرے تقریر ہوئی لیکن اہل بدعت نے مدرسہ کو گھیر لیا مولوی صاحب پر حملہ کے ارادہ سے، اب مدرسہ واسلے بھی پریشاں اور پبلک میں بھی اکثریت مخالفین ہی کی تھی سب حیران تھے کہ یہ تو کیا کریں؟ اس شہر میں حضرت مولانا تھانویؒ کے ایک خاص خادم جو شہرت بھی رکھتے تھے اور با اثر بھی تھے رہتے تھے انکو کسی طرح اطلاع ہو گئی کہ فلاں مولانا صاحب کو اہل بدعت نے فلاں جگہ گھیر رکھا ہے بس فوراً اپنی ٹم پر تشریف لائے اور مجمع کے درمیان سے گزرتے ہوئے مدرسہ کے پھاٹک پر ٹم روک کر وہیں سے آواز دی کہ مولانا تشریف لائے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ارے یہ تو فلاں حاجی صاحب ہیں۔ مولانا کو اطلاع کیا مولانا تشریف لائے اور ٹم پر بیٹھ کر مخالفین کے اسی جھڑپ سے ہوتے ہوئے نکل گئے اور کسی کو کچھ بھی کہنے سننے کی ہمت ہی نہیں پڑی اس کے بعد وہ مولانا صاحب خود فرماتے تھے کہ اجی آج حضرت تھانویؒ کے کسی اہل منصب اور جاہ و جلالت نیز صاحب جاہ شخص کے یہاں قیام فرمانے کی سمجھ میں آگئی اور واقعی موٹی سی بات ہے کہ بڑا آدمی بس اشاروں ہی اشاروں سے

بڑے سے بڑے فتنہ کو رفع کر سکتا ہے اور چھوٹا آدمی اگر چہ محب ہی تو کیا فتنہ کو رفع نہیں کر سکتا بیش از بیش اپنی جاں جوکھوں میں ڈالے گا تو اس سے کیا ہوا؟
 راقم عرض کرتا ہے کہ حل یہ نکلا کہ بزرگوں کے معمولات پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ بات قدرے طویل ہو جائیگی لیکن بڑے لطف اور تجربہ کی اور بڑے ہی کام کی اسلئے اس قسم کا ایک اور واقعہ حضرت اقدس سے سنا ہوا اور سن لیجئے فرمایا کہ مولانا تھانویؒ پر اپنے بھی لوگوں کو (بلکہ کبھی یہ بھی فرمادیا کہ حضرات اہل دیوبند میں سے بعض کو) یہ اعتراض تھا کہ کسی کی دعوت پر مہلوگ تو تنہا چلے جاتے ہیں اور مولانا تھانویؒ کا اصول یہ ہے کہ یوں فرماتے ہیں کہ آپ کے یہاں سے کسی شخص کو آنا چاہیئے وہ آوے اور آکر مجھے اپنے ہمراہ خود لے چلے تب سفر کر سکتا ہوں۔ لوگ کہتے تھے کہ بلا وجہ لوگوں کا دہرا کر ایہ خرچ کراتے ہیں (مگر یہ پہلے زمانہ کا اعتراض تھا جبکہ علماء تیسرے درجہ میں سفر کیا کرتے تھے اور اب تو ایک فرسٹ کلاس کا اور ایک سرونٹ کے کرایہ کا مطالبہ عام سا ہو گیا ہے) حضرت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان معترضین کو بھی اس فعل کی مصلحت سمجھا دی اس طرح سے کہ ایک مرتبہ دہلی سے کوئی رئیس حاجی رضا دیوبند آئے لوگوں سے تعلقات تو تھے ہی اسلئے ان سے سب روشناس تھے انھوں نے چند حضرات سے درخواست کی کہ فلاں تاریخ کو آپ لوگ دہلی تشریف لائیں اور غریب خانہ پر ماہر تناول فرمائیں تو کرم ہوگا میرا آدمی سٹیشن پر موجود ملے گا موٹر بھی آجائیگی مکان پر آپ لوگ باسانی پہنچ جائیں گے سب لوگوں نے وعدہ کر لیا۔ وہ دن آیا ٹکٹ لیکر لوگ دہلی تشریف لے گئے اور پلیٹ فارم پر اتر کر میزبان کے خادم کو تلاش کرنے لگے ایک سرے سے لیسر دوسرے سرے تک کسی بارگاہی دیکھ ڈالی مگر کہیں کسی کا پتہ نہیں تھا۔ گاڑی جب پلیٹ فارم سے چلی گئی تو اب سب لوگوں نے سر جوڑ کر سوچنا شروع کیا کہ کرنا کیا چاہیئے؟ آپس میں ایک نے دوسرے سے دریافت کیا کہ اجی ان حاجی

صاحب کا نام کیا ہے جہاں چلنا ہے لوگوں کو بس حاجی جی کے علاوہ نام بھی نہیں معلوم تھا پھر کسی نے پوچھا کہ اچھا کس محلہ میں چلنا ہے وہیں چلکر شاید پتہ لگ جائے لطف یہ کہ محلہ کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے۔ اب معلوم نہیں کہ واپسی کا کرایہ بھی پاس تھا یا نہیں لیکن یہ تو یقینی تھا کہ کسی کے پاس ایک چادرہ بھی نہ تھا کہ بچھا کر اسی پر بیٹھ رہتے۔ حضرت اپنے لفظوں میں فرماتے تھے کہ بس لوگ شیروانی پہن پہن کر پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا مصداق ہو رہے تھے۔ حب خوب تھک گئے تو ہوش آیا اور انہیں سے کسی نے کہا کہ بھائی حضرت تھانویؒ کا معمول بالکل صحیح اور تجربہ پر مبنی ہے کہ ایک آدمی کو سفر میں ہمراہ ہونے کے لئے بلاتے ہیں آج اگر ایسا ہم بھی کئے ہوتے تو یہ مصیبت نہ آتی بس جیسے ہی یہ ریزدیشن پاس کیا ویسے ہی سامنے سے ایک شخص ہانتا کانتا ہوا آیا اور کہا کہ آپ لوگ دیوبند سے تشریف لارہے ہیں اور لگو فلاں حاجی صاحب کے یہاں جانا ہے نام شکر سب نے کہا ہاں ہاں! وہیں جانا ہے اس نے کہا معاف فرمائیے گا حاجی صاحب نے مجھ سے ابھی ابھی فرمایا ہے اور یہ فرمایا کہ اے گاڑی آئے ہوئے تو دیر ہو گئی میں بالکل ہی بھول گیا تھا جاؤ جلدی جاؤ تو آپ حضرات تشریف لے چلے موٹر حاضر ہے۔

سبحان اللہ کیا خوب واقعہ ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کس کس طرح تنبیہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن ان واقعات سے عبرت لینے والے کہاں ہیں؟ کس قدر حکمت و دانش پر حضرت تھانویؒ کے یہ دونوں اصول مبنی تھے لیکن اہل دنیا کو ان پر بھی اعتراض تھا۔

بات دور جا پڑی عرض یہ کہ رہا تھا کہ حضرت اپنے ساتھ کسی با اثر آدمی کو کیوں لے چلتے تھے امید کہ موجودہ بالا تفصیل کی روشنی میں یہ مسئلہ بے غبار ہوگا ہوگا۔ بس یہی مصلحت جو گورکھپور میں حکیم ابوالکلام صاحبؒ بعد میں کبھی کبھی مولوی امجد اللہ صاحب یا حکیم وصی احمد صاحب کے برادر بزرگ ولی محمد صاحب کو ہمراہ

لینے کی تھی وہی وجہ الہ آباد میں کبھی ڈاکٹر صلاح الدین احمد صاحب کو اور کبھی عبد المجید صاحب مالک اسرار کریمی پریس کے لینے کی تھی اور یہی بمبئی میں ڈاکٹر محمد اسحق صاحب یا بھائی احمد کو ساتھ رکھنے کی تھی کیونکہ دوست دشمن کس کے نہیں ہوتے اللہ والوں کے مخالف بھی بہت سے بذات اور بد قسمت قسم کے لوگ ہو جاتے ہیں اور کیوں نہ ہوں جبکہ انبیاء کی جماعت اس سے نہ بچ سکی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ اور ہم نے اسی طرح سے ہر نبی کے لئے دشمن بنا دیئے ہیں شیاطین انس میں سے بھی اور شیاطین الجن میں سے بھی۔ لہذا اسباب کے درجہ میں اپنا تحفظ اختیار کر لینا مطلوب شرعی تھا اور اسی پر حضرت اقدس کا عمل تھا۔

زمانہ قیام گورکھپور تک تو حکیم ابوالکلام برابر حضرت اقدس کی خدمت میں آتے رہے پھر وہاں سے جب حضرت الہ آباد تشریف لائے تب بھی وہ ایک دوبار یہاں آکر ملے ہیں اسی دور کا ایک خط ہے اسکو کبھی بطور یادگار ہی کے سن لیجئے

(خط حکیم ابوالکلام صاحب بنام حضرت مصلح الامۃ؎)

حال :- الہ آباد کی واپسی کے بعد حضرت والا کی خیریت برابر ہی ملتی رہی جس سے ایک گونہ اطمینان سا رہا اور کچھ غیر معمولی مصروفیت اور گونا گوں مشاغل بلکہ سیح تو یہ ہے کہ غفلت اور کاہلی ہی کی بنا پر حضرت والا کی خدمت میں کوئی عریضہ ارسال نہ کر سکا جس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

تحقیق: آپ کی تسلی کے لئے معافی کا لفظ لکھے دیتا ہوں ورنہ آپ کی محبت کا مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ کو فراموش نہ کریں گے

حال: گورکھپور کے قیام میں حضرت والا نے جس الطاف و اکرام محبت و شفقت سے اس عاجز اور گنہگار کو نوازا اسکے لئے حضرت والا کا کس طرح شکریہ ادا کروں سوا اسکے کہ حضرت والا کا جو پیام اور اصلاح امت کے لئے

جو طریقہ کار ہے اس پر عمل کروں اور دوسروں تک پہنچاؤں۔ ممکن ہے
کہ اللہ تعالیٰ عمل غیر کی توفیق عطا فرمائے اور سیہ کاریوں اور غطاؤں سے
ورگزر فرمائے

تحقیق: کیا خوب بات آپ نے لکھی ہے۔ بہت پسند آئی بس یہی کیجئے یہی طرح خیر
خیر لازمی اور خیر متعدی۔ آمین۔ آمین۔

حال: حضرت والا خاص طور سے میرے لئے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ میرے
قلب کو خوف خدا اور فکر آخرت سے معمور فرمائے

تحقیق: اللہ تعالیٰ خوف خدا اور فکر آخرت سے قلب کو معمور فرمائے

ماشاء اللہ کیا عمدہ خط ہے اس سے حکیم صاحب الوصوف کی زندہ دلی
استعداد قلبی، خوف خدا پیدا ہونے کی فکر اور فکر آخرت سے معمور قلب کا شوق
معلوم ہوا کسی بزرگ سے کسی کو جو چیزیں حاصل ہوا کرتی ہیں وہ آخر یہی چیزیں تو ہوتی
ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قلب نے پورا نفع حضرت اقدس کی صحبت کا اٹھایا کھا
لیکن ذاتی اور قومی مشاغل دنیویہ اور اختلاط عوام نے اس نگائے ہوئے پودے
کا ناس مار دیا یوں بھی حکیم صاحب کا کچھ قومی اور عوامی مشاغل سے تعلق تھا اور
مضبوط تو بہر حال کا منصبی ہی تھا اس لئے مجلس میں انکی عدم شرکت کی تلافی شیخ
کامل نے تو صبح شام کی تفریحی معیت سے پوری ہی فرمادی تھی اور دل اللہ تعالیٰ
کی تو بھی لگ گئی تھی مگر اچانک فراق کی ہوا چل گئی اور اس نے اسے بار آور نہ ہونے
دیا کیونکہ اسکے بعد پھر ملاقات یا مکاتبت کا پتہ نہ چل سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کے حال
وہال میں ترقی عطا فرماوے آمین اور ان کے جذبات دلی کو بروئے کار لاوے
اور حضرت اقدس کی اس دنیوی معیت کو آخرت کی معیت کا پیش خیمہ بناوے۔ آمین
۷۔ جناب قاضی محمد ثکیل صاحب عباسی ندوی۔ آپ جناب عدیل عباسی صاحب
کے برادر خورد ہیں۔ میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں اردو فارسی
کے مدرس تھے۔ ذی علم اور فہیم شخص تھے اس لئے حضرت اقدس کی صحیح قدر پہچانی

بیعت ہوئے مجلس میں آنے جاتے تھے اور اپنی خداداد استعداد ظاہری اور باطنی کیوجہ سے حضرت سے بہت زیادہ قریب ہوئے یوں ظاہری آنا جانا تو زیادہ ہوتا تھا بس مضابطہ ہی کا تھا لیکن احوال سے خاص رابطہ کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت کے محب تھے اور حضرت کو بھی محبوب تھے۔

آپ ہی کا وہ واقعہ ہے کہ ایک دن مجلس والا سے واپسی میں ان کے کوئی دوست ان سے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں مولوی شکیل صاحب نے فرمایا کہ گلستان بوستاں کا سبق پڑھ کر آرہا ہوں۔ (اس دن حضرت والا نے مجلس میں انھیں کتابوں کے مضامین بیان فرمائے تھے) ان کو تعجب ہوا کہ مولوی صاحب نے تو بخانے کتنوں کو گلستان بوستاں پڑھا دیا ہے آج یہ کیا فرما رہے ہیں کہ پڑھ کر آرہا ہوں۔ ان کے تعجب کو بھانپتے ہوئے مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی مولانا شاہ وحی اللہ صاحب کی مجلس سے یعنی چھوٹے قاضی پور سے اور مولوی شہار اللہ صاحب کی کوٹلی سے آرہا ہوں اور آج حضرت مولانا نے گلستان بوستاں کے بعض مقامات سنا کر اسکی جو تشریح فرمائی ہے تو کیا کہنا سبحان اللہ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آج گلستان پڑھا ہے۔ اسی لئے میں نے آپ سے کہا کہ آج گلستان پڑھ کر آرہا ہوں۔ یہ جملہ اپنی حقیقت پر تھا اس میں مبالغہ اور مجاز نہ تھا۔ دوسرے دن انھوں نے اس واقعہ کو خود حضرت سے بیان کیا سب لوگ بہت محفوظ ہوئے آپ کو بھی اگر حضرت والا کی نسبت سے مولوی صاحب موصوف سے ملاقات کا اشتیاق ہو گیا ہو تو الحمد للہ مولوی صاحب ابھی بقید حیات ہیں اور اپنے وطن بستی میں رہتے ہیں تاہم اگر ان تک رسائی نہ ہو سکے تو انکی جانب سے کہتا ہوں کہ عہد ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بند مرا۔ ان کے بعض مکاتیب پیش خدمت ہیں جن سے حضرت والا سے انکا تعلق، محبت و عقیدت آشکارا ہے۔

(۱۱) (خطوط شکیل عباسی ندوی بنام حضرت مصلح الامۃ؎)

حال :- بحال ادب عرض گزار ہوں کہ حضرت والا جس وقت الہ آباد تشریف لے گئے اسی کے ایک گھنٹہ کے بعد ایک نہایت والہانہ شوق زیارت کے ساتھ یہ خدام حاضر بارگاہ عالی ہوا دو ہفتے تک بعض مادی و روحانی معذوریوں سے حاضر نہ ہو سکے کے باعث اس عقیدتمند کی حیثیت اس پیاسے کی سسی تھی جو چشمے کی طرف دوڑتا ہوا گیا ہو لیکن وہاں پہنچنے پر وہ اپنے احساس کی دنیا میں ایک ایسے مجرم کے مانند تھا جسے اسکی کوتاہی کی سزا دی جا چکی ہو۔ لوگ قیاس آرائی کر رہے تھے کہ آب و ہوا کے اس نہ آنے کی وجہ سے اب وہیں رہیں گے لیکن دل اس رائے کو قبول نہیں کرتا تھا آدمی اپنے نقصان کے یقین پر آسانی سے راضی نہیں ہوتا اور یہ نقصان تو ایسا تھا جسکی تلافی ممکن نہیں ہے۔ میرا حال تو یہ تھا کہ جب بھی طبیعت بے سکون ہوتی تھی دوڑ کر حضرت والا کے آستانے پر پہنچتا تھا اور سکون لیکر چلا آتا تھا ایک عجیب شفقت نگاہ عالی میں دیکھتا تھا ہر طرح کے اضطراب کے لئے نوشدارو بن جاتی تھی اکرام تو میں نے بہت پایا ہے لیکن وہ اکرام جس میں کسی طرح کا تکلف کا شبہ نہ کیا جاسکے حضرت والا ہی کے نگاہ کریمانہ میں دیکھا، ایک ایسا گرامی مخاطب جس میں شش جہتی اخلاص کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ میں اسی کریمانہ نظر کو حضرت والا کی سب سے بری کرامت سمجھتا تھا جس نے مجھ جیسے باغی کو بھی منقاد بنالیا۔

یا حضرت! اس موقع پر میں اپنے ایک جرم کا اعتراف بلکہ اقبال کر کے حضرت والا کی عالی ظرفی سے عفو و درگزر کی فریاد کرتا ہوں۔ میں حضرت والا کی مجلس گرامی اور صفات عالی سے نابلد ہونے کے باعث بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ محض اپنی بدبختی اور نفس کی شرارت سے حضرت والا کے مسلک پر سخت گستاخانہ تنقیدیں کر چکا ہوں۔ حضرت والا کی مجلس میں باریاب ہو کر اس گنہگار پر جو سب سے پہلا اثر پڑا وہ ایک مجرمانہ ندامت تھی جس کے بوجھ سے سراٹھایا نہیں جاتا تھا اور شفقت عالی اس

محروم سعادت پر جوں جوں بڑھتی جاتی تھی اس شرمسار کی ندامت اور ترقی کرتی جاتی تھی۔ کئی مرتبہ سوچا کہ زبان سے نہیں تو قلم ہی سے اپنی کیفیت درونی کا اظہار کر دوں لیکن پھر خیال ہوا کہ حضرت والا کو اس غلام کے اخلاص و عقیدت پر کچھ اور اعتماد ہو لے تب عرض مدعا کروں۔ اتنے میں بدسرشتوں نے کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ سوچا کہ اس سلسلے میں کچھ خدمت انجام دے لوں تب کہوں۔ پھر میری حالت میں مدوجزر اور حاضری میں کوتاہیاں ہونے لگیں اور آخر کار اچانک وہ واقعہ سامنے آگیا جسے میں کبھی سوچ نہیں سکا تھا یعنی خانقاہ ناگاہ منتقل ہو گئی اور جو نعمت اللہ کریم نے گورکھپور کو دی تھی وہ ہماری قدر ناشناسی کی شامت سے الہ آباد کو تفویض کر دی گئی۔ فیا حصرۃ علی العباد

ابتداء میں تو امید بہت سہارا دیتی رہتی تھی۔ مسجد کی نئی تعمیر زبان حال سے اسکی تائید کرتی تھی اور اندر سے ایک آواز آتی تھی کہ دلوں کی جس تعمیر میں حضرت نے ہاتھ لگایا تھا اسکا ناتمام رہنا گوارا نہیں فرمائیں گے اور کم سے کم کچھ دنوں کیلئے ضرورت شریف لائیں گے۔ احساس محرومی تڑپ کے کہتا تھا کہ حضرت اب تشریف لائیں گے تو ایک دن کی بھی حاضری ناغہ نہ ہوگی۔

اس قسم کے تصورات نے ایک دن ایک خواب کی شکل اختیار کی جس میں حضرت والا یہاں کی مجلس میں رونق افروز تھے میں وہیں پاس ہی نماز پڑھ رہا تھا نماز ہی کی حالت میں جیسے مجھے اس موہبت عظمیٰ کی بشارت ملی اور میں بیتاب زیاد ہو کر حضرت والا کو دیکھنے لگا۔ جبین اقدس پر تبسم کے انوار چھائے ہوئے تھے اور جسم مبارک پر ایک گرم اپکن تھی۔ یہ جذب صرف ایک لمحہ طاری رہا دوسرے لمحہ پھر میرا رخ قبلہ کی طرف ہو گیا لیکن نماز پوری کر کے قدمبوس ہونے کی آرزو آنکھ کھل جانے کی وجہ سے برباد ہو کر رہ گئی۔

حضرت کے تشریف لیجانے کے بعد تنفس کے سخت حملوں سے میری صحت پھر وہیں آگئی تھی جہاں چار چھ مہینے پیشتر تھی۔ اب کچھ دنوں سے کچھ سکون ہو چلا ہے

دعا فرمائیں کہ اللہ کریم پوری صحت عطا فرما کر اجر و ثواب کے کاموں کی توفیق مرحمت فرماتے رہیں۔

(تحقیق)

محبت محترم زاد اللہ عرفانکم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ کا محبت اور عقیدت نامہ آیا اسکے ایک ایک لفظ کا خاص اثر قلب پر ہوا
بیچ پوچھے تو بڑی ہمت افزائی ہوئی اور عزائم میں استحکام ہوا اور دل نے یہ فیصلہ
کیا کہ دنیا اب بھی قدر دانوں سے خالی نہیں۔ میں تو آپ کے اس خط سے بیچ جانے
آپ کا معتقد ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے ہوتے ہیں۔ خدا کا شکوہ ادا کرتا ہوں
جس نے ایسے لوگوں سے ربط و ضبط پیدا کر دیا جن سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں
میں اپنے آپ کو اس بکھنے پر مجبور پارہا ہوں کہ آپ سے مجھ کو محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ
اس میں خلوص دے اور قیامت میں ہمارے لئے ذریعہ نجات بنے۔ میں آپ کو
بتاتا ہوں کہ گورکھپور کے تعمیر کا کام اُدھورا اور ناتمام نہ رکھا جائیگا جبکہ آپ جیسے
بزرگوں کی توجہ شامل حال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ جواب آپ میرے دوستوں
کو سنادیں انھیں مسرت کا باعث ہو گا زیادہ بجز شوق ملاقات کے کیا عرض کروں۔
آپ کا خط میں نے رکھ لیا ہے اسکی نقل اور یہ جواب روانہ خدمت ہے
والسلام مکسک انخام خیر تمام۔

وصی اللہ عفی عنہ

(۲۱)

حال :- بحال ادب عرض گزار ہوں کہ عالی ہوں کہ دوسرے عریضے کی ترتیب
کے لئے خیالات جمع کر رہا تھا کہ ناگاہ صحت کی خرابی نے شدت اختیار کر لی اور
چکرا اور ضعف نے دماغ کو شکنجہ میں کس لیا اور حالت دیکھتے دیکھتے یہ ہو گئی کہ دعا
درخواست کے لئے بھی قلم نہ اٹھا سکا بس تصور کی نگاہ سے حسرت کے ساتھ حضرت والا
کی شفقت بے پایاں کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ حضرت جب یہاں جلوہ فرماتے تھے تب

ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے حضرت کی بارگاہ کی حاضری کی برکتیں ساتھ لے لیتا تھا۔ اس مرتبہ جب خاص اضطرابی جیہن اور دماغی الجھن کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف چلا تو حضرت کی دعار کا تصور ساتھ مولیا تھا۔ بستر علالت پر کھلی بیچینی سے تڑپتے ہوئے حضرت والا کی بے مثال کریم النفسی کو یاد کرتا رہتا ہوں یہ عریضہ بدقت تمام عالم اضطراب میں محض دعار کی درخواست کے لئے لکھ رہا ہوں۔

زندگی اپنے گناہوں کے کفارے کے لئے چاہتا ہوں اور دین کی حسب استعداد خدمت کے لئے۔ دماغ چاہتا ہوں دین کی فکر کے لئے۔ اور دل مانگتا ہوں اللہ کے ذکر کے لئے۔

آج پچھلے پہر کو اس رشک سے سو نہ سکا کہ عالم شب قدر کا خیر مقدم کر کے اسکے نزول کی برکتیں جمع کر رہا ہے اور ہاے میں محروم ہوں۔ اللہ کریم کاش اس احساس محرومی کو اسکی غامیاں درگزر فرما کر قبول فرما لیتے۔ اے کاش! تحقیق: — محب من! زاد اللہ تعالیٰ عرفانکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! الحمد للہ بخریت ہوں آپکے خط کا انتظار تھا عین انتظار میں آج محبت نامہ نے مسرور فرمایا۔ جیسے خط کے آنے سے خوشی ہوئی بیماری کی خبر سے رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعار کرتا ہوں کہ کامل صحت عطا فرمائے۔ زندگی عطا ہو جس سے تدارک مانگا اور دین کی خدمت ہو سکے اور دماغ بھی وہ عطا ہو جو دین کی فکر کرے اور دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے عطا ہو۔

آپ نے لکھا ہے کہ لیلۃ مبارکہ میں اس رشک سے سو نہ سکا کہ عالم شب قدر کا خیر مقدم کر کے برکتیں جمع کر رہا ہے اور ہاے میں محروم ہوں۔ یہ رشک میرے خیال میں باطنی طاعت ہے جو ظاہری طاعت سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نصیب فرمائے اور اسے قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

آپ نے خط کے ابتدائی جملوں میں جس عقیدت و محبت کا اظہار فرمایا ہے اللہ تعالیٰ اسکے نیک ثمرات عطا فرمائے۔ والسلام

(۳)

حال :- مرجع اہل وفا، مجمع صدق و صفادامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بکمال ادب ملتزم ہوں کہ ایک عرصے سے کوئی عریفہ خدمت عالی میں رسل نہ کر سکا اس محرومی کو سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غفلت نے اس نادان کو نقصان پر راضی کر لیا ہے۔ مراسلت کی جو برکتیں ہیں میرا شعور اس سے نابلد نہیں اور ان برکتوں کے حصول کے لئے جو تڑپ ہوتی ہے دیکو اس سے بھی خالی نہیں پاتا۔ تحقیق :- دیر آید درست آید انھیں مواقع کیلئے چسپاں ہے۔ دل کو تڑپ سے خالی نہ پانا اور غفلت سے ڈرنا اور تصور کا سمایا رہنا یہ سب مقاصد طریق سے ہیں حال :- بالاینہم جو کوتاہی ہوئی اسے ایک مہینہ سے برابر سوچتا رہا ہوں اور اپنے اندرون کو اسکے اسباب کی کرید میں مصروف پاتا رہا ہوں۔ تحقیق :- یہ سوچ بچار اور اندرون کو کرید میں مصروف کرنا طریق کے لوازم سے ہے۔

حال :- ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اچانک مجلس عالی سے دور اور مواعظ گرامی سے محروم ہو جانے کے بعد طلب و شوق کو گم کردہ راہ ہو جانے کا موقع ملا، میری طبیعت اس بچے کی سی تھی جس کی آوارہ طبیعت ایک باکمال استاد کی حکیمانہ توجہ سے ابھی اچھی طرح مانوس بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مکتب کی بساط ہی لپیٹ دی گئی اور اسکا نظام ہی ختم کر دیا گیا۔ کچھ دنوں تو وہ بچہ کھویا کھویا سا رہا اسکے بعد اسکی طبیعت کی افتاد نے اسے پھر اسکی پرانی ڈگر پر ڈال دیا اور وہ پھر اپنے پرانے مشغلوں کی بھیر میں گم ہو گیا۔

تحقیق :- ایسا ہوتا ہے مگر یہاں واقعہ اسکے خلاف ہے الحمد للہ کہ آپ پرانے مشغلوں میں گم نہیں ہوئے۔

حال :- (۲) دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو خاص نسبت مراسلت کا حقدار بناتی ہے یہ عقیدت مند ابھی اس تک پہنچ نہیں سکا تھا ابھی تو دو ایک زینے طے کئے تھے کہ طلسماتی طور پر وہ عمارت ہی اٹھالی گئی جس میں وہ زینے لگے تھے اور اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خواب میں ایک مرد کامل کے سامنے زانوئے ادب رکے بیٹھا تھا کہ اتنے میں آنکھ کھل گئی

تحقیق :- یہ صحیح ہے مگر طالب صادق کیلئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے کو عقیدت میں ناقص سمجھے ہی اسکے لئے از بس مفید ہے

حال :- اس واقعہ کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ طلب کا ایک پودا حضرت کی گرامی توجہ کی برسات میں اگ رہا تھا تھا اتنے میں باران فیض کا رخ ایسا بدلا کہ وہ ننھا سا پودا کرم کی چھینٹوں اور لطف کی پھواروں کو ترس ترس کر مرجھانے لگا۔

تحقیق :- مگر مرجھانہ سکا لطف کی پھواروں نے اسے تروتازہ کر دیا فللہ الحمد والمنة

حال :- (۳) تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دل کی طرف سے جب عرض احوال کی تحریک ہوئی تو دماغ نے طرح طرح کی مونگکافیاں شروع کر دیں، اور کیا لکھا جائے اور کس اسلوب سے لکھا جائے کے مسئلے اکھڑ ہوئے۔ زبان کی طرح چونکہ قلم بھی بے راہ روی کا عادی رہا ہے اسلئے کبھی اس نقص کا احساس بھی عنایں گیر ہوا۔ کبھی یہ ہوا کہ تصور کی بیاض میں حضرت کی یاد کے ہاتھ سے لکھے ہوئے جو نوشتے تھے کا غجب انکا عکس لینے لگا تو ادب نے اعتبار کا ہاتھ بڑھایا کہ تجھے اس تصدیق کا حق بھی حاصل ہے ؟

تحقیق :- یہ بھی وہی ہے جو اوپر عرض کر چکا ہوں یہ حضرت عشق کی زیرنگیاں ہیں۔

حال :- (۴) کبھی عام بیدینی کے ہولناک مناظر سے گھبرا کر اور کبھی اپنے باطنی انقباض سے اکتا کر حضرت سے فریاد کر لے کو جی چاہا تو اندر سے کسی نے ڈر دیا کہ بے تربیت قلم کی گفتگو کہیں بکواس نہ بن جائے

تحقیق :- یہ طلب صادق میں ہوتا ہے یہ ڈر لازم حال رہتا ہے

حال : — یہ عریضہ اسی لئے ارسال کر رہا ہوں کہ جناب والا سے اگرچہ میری نسبت ضعیف ہے اور جو تربیت حضرت کی مجلس سے کچھ دنوں تک ملی تھی وہ اگرچہ بہت خام ہے پھر بھی مجھے اجازت دی جائے کہ اپنے دینی تاثرات اور اپنے باطنی حالات اور کچھ دینی استفسارات کو حضرت سے مراسلت کرنے کا وسیلہ بناؤں تاکہ اس سبزہ انتساب کے پینے کے لئے جسے حضرت کے ابرکرم نے اس بے معرفت کے دل میں آگایا تھا کم سے کم شبنم کی تری ملتی رہے۔

تحقیق : — نہایت خوشی سے اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ روزافزوں ترقی نصیب فرمائے۔

حال : — میری صحت بزرگوں اور بالخصوص حضرت والا کی دعاؤں اور اللہ کریم کے فضل و کرم سے اب اچھی ہے، اور جو دینی مشاغل ناتندرسی کے باعث چھوٹ گئے تھے انکا دامن پھر ہاتھ میں آگیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہر دینی کام میں اخلاص عطا فرما کر اسے قبول فرمائیں۔ اور حضرت والا سے جو ہدایتیں ملتی رہی ہیں شعل راہ کا کام دیتی رہیں۔ تحقیق : — آمین۔

حال : — ایک مرتبہ کا واقعہ یاد آ رہا ہے کہ ایک دینی مجلس میں خطاب کے ارادہ سے جا رہا تھا راہ میں وسوسہ پیدا ہوا کہ اس مجلس کی رونق میرے دم سے ہے میں نہ ہوتا تو وہ کب کی درہم برہم ہو چکی ہوتی اس خیال کے آتے ہی حضرت کی ایک تازہ ہدایت نے رہنمائی کی اور آدھی راہ سے واپس آگیا۔

تحقیق : — یہ سب ہدایات غیبیہ ہیں جن سے طالب کی دستگیری کیجاتی ہے۔

حال : — گھوم پھر کر حضرت کی بارگاہ ارشاد میں اسلئے جاتا تھا کہ دینی خدمات کے لئے حضرت کی رہنمائی حاصل کروں۔ آہ وہ چراغ رہنمائی اب بھی ہے لیکن میری کم بین نگاہ سے بہت دور آسمان کے اس ستارے کی طرح جو عام نگاہوں کی دسترس سے اونچا ہوتا ہے۔

تحقیق : نظروں سے دور رہنے کا پیارے گلہ نہیں دل سے قریب ایسے ہو کچھ فاصلہ نہیں

حال :- البتہ اس منزل میں جب قدم رکھتا ہوں تو ان ایام کو یاد کر لیتا ہوں جب اس ستارے کی چھاؤں میں چلنے کی توفیق حاصل تھی۔ تحقیق : الحمد للہ

حال :- اللہ کریم ہمیں اسکی سچی قدر دانی عطا فرمائے اور اسے ہمارے سروں پر ہماری دینی و دنیاوی فلاح کے لئے قائم رکھے۔ آمین ثم آمین تحقیق : آمین۔

(۴)

حال :- چند ماہ پیشہ ایک عریضہ ارسال خدمت اقدس کیا تھا اور امید تھی کہ نصف ملاقات کا شرف جلد جلد ملا کر لیا لیکن نفس و شیطان کے غلبہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ میرے جیسے سراپا عصیاں کیلئے جناب کے فیض صحبت کی سخت ضرورت ہو لیکن قسمی سے اسکی نوبت نہیں آرہی ہے دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی خدمت میں حاضری اور فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جناب کی صحبت سے مجھے جو فائدے حاصل ہوئے ہیں ان میں میرے خیال کی مطابق سب اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ اللہ والوں سے عقیدت میں اضافہ اور ان پر نیکر سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے کیونکہ اپنے اعمال تو پریشان کن ہیں البتہ المرء مع من احب (انسان اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا) کی بشارت باعث تسلی ہے۔ میں اعمال کی دنیا میں بالکل تہیدست ہوں اگر جناب والا دعائے خیر سے سرفراز فرماتے ہیں تو کارنامی سے ہمکنار ہونے کی قومی توقع ہے۔

تحقیق :- ضرورت صحبت کا احساس کرتے ہوئے تشریف آوری اور فائدہ حاصل کرنے کے توفیق کی جو دعا کرائی ہے میں آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھ کو آپ سے دلی محبت و مناسبت اس لئے دل سے دعا کرتا ہوں اور اسکو چاہتا ہوں کہ یہ کیا کر دوں۔ آپ سے تحریر فرمایا ہے کہ سب اہم فائدہ اخذ (دیکھنے عبارت خط کشیدہ بالا) سبحان اللہ کیا کہنا ہے اس مضمون کے استحسان کا۔ کاش یہ مضامین بہت سے دلوں میں پیدا ہو جائیں۔ میں آپ جیسے مخلص کیلئے دعا کو اپنا فرض سمجھتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی نسبت صحیحہ صادقہ عطا فرمائے اور اپنے صاحبین بندوں میں داخل فرمائے۔ آمین

والسلام خیر ختام
وصی اللہ عفی عنہ

(۵۱) مخدوم مخدومان زمان خلاصہ ارباب عرفاں دامت برکاتکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

حال: بحال ادب ملتئم ہوں کہ معذرت نامے کا جواب پا کر قلم جانے کتنی بار کاغذ پر سنبھل سنبھل کر چلا ہے لیکن اپنی ہر تحریر کو ناقص سمجھ کر ستر دکتا رہا ہوں اور یہی اصل سبب اپنی کاغذی حاضری کی تاخیر کا ہے ورنہ التماس کے لئے بہت سے ایسے موقع آئے جو بڑے ہی اہم تھے۔ ان میں سے ایک موقع وہ تھا جب میرے بڑے بھائی نے موت و زندگی کی کشمکش کے کئی مرحلوں سے گذرتے رہنے کے بعد ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ مرحوم کے لئے سکون کی دعار کی درخواست کر چکا تھا اب ضرورت تھی کہ اپنے اس تحن کی دعار مغفرت کیلئے فریاد کروں جس کے اثار و خلاص کے سائے میں میں نے دینی علوم حاصل کئے تھے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب ٹھنڈک کی شبہ پا کر میرے پرانے مرض تنفس نے میرے سینے میں ہیجان پیدا کیا۔ حضرت جب یہاں رولت فروز تھے میں دوا سے پہلے حضرت کی دعار کی طرف لپکتا تھا لیکن اس مرتبہ قلم جب بھی اٹھا اس پر ایک ہر اس طاری ہوا اور میرا کام نہ ہو سکا البتہ حضرت کے تصور میں گم ہو کر اشعار کہتا رہا اور حضرت کی یاد سے استفادہ کرتا رہا اور دل میں سکون اور روح میں ایک روشنی سی محسوس کرتا رہا۔ اکثر ایسا نظر آتا تھا کہ جیسے حضرت واقعی میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں اور میرے لئے دعار فرما رہے ہیں۔ اسکے بعد آج گیارہ روز ہوئے ایک شدید حملہ تنفس کا ایسا پڑا جس سے سولہ گھنٹے تک تڑپتا رہا۔ نماز بستر پر اشارے سے ادا ہوئی اس وقت حضرت کی یاد بہت آتی رہی دو روز کے بعد بستر سے اٹھ کر روز دو ایک صفحے حضرت کو لکھ لکھ کر بھاڑتا رہا اور آج تب یہ کیا کہ جیسا بھی بن پڑے حضرت سے اپنے مرحوم بھائی کی مغفرت اور اپنی صحت کے لئے دعار کی درخواست کر رہی ہوں حضرت کے تصور کو میں اپنا ایک بڑا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں کیونکہ اس صورت میں قلب و نظر میں دین کی طرف رجحان رہتا ہے اور ایسا محسوس کرتا رہتا ہوں جیسے

ایک تاریک راہ میں ایک چراغ میری رہنمائی کر رہا ہے ۔
 معذرت نامے کے جواب میں جوار شادات صادر ہوئے وہ میری امید
 کے مطابق تھے میں جانتا تھا کہ میرے شوق کی لغزش کو حضرت کی کریم النفسی دل سے
 معاف کر دے گی ۔ صحیفہ عالی کو پا کر بہ جستہ ایک قطعہ موزوں ہو گیا تھا جسے ڈرتے
 ڈرتے عرض کر رہا ہوں ۵

دامن نگاہِ لطف کا پھر ہاتھ آگیا پھر شوق اپنی دولتِ نایاب پاگیا
 جیسے کوئی کبھی ہوئی قندیل جل اٹھی جیسے کوئی چراغ سب راہ آگیا
 پھر اک تبسمِ کرم آگیاں نظر میں سے پھر ایک نورِ دل کی سیاہی پہ چھا گیا

جب بھی چلا شکیں قدم تھر تھرا اٹھے
 لغزش کا خوف ایسا قلم میں سما گیا
 خادمِ عقیدت کیش چھڑ شکیں عباسی

تحقیق : عنایت فرمائے بندہ ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
 محبت نامہ عرصہ کے بعد آیا ۔ حالات معلوم ہوئے بھائی صاحب کے
 انتقال سے رنج ہوا اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس درمیان
 میں آپ کے مرض نے بھی کچھ شدت اختیار کر لی تھی اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عاجلہ
 کاملہ مستمرہ عطا فرمائے

باقی حالات جو آپ نے اپنے لکھے ہیں ان سے بہت خوش ہوا ۔ اس
 میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو بھی دولتِ باطنی ملے گی اور
 آپ محروم دنیا سے نہ جائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی باطنی کیفیات اور حالات
 میں روز افزوں ترقی نصیب فرمائے ۔

میں بحمد اللہ بخیریت ہوں ۔ والسلام خیر ختام
 وصی اللہ عفی عنہ

حال، چراغ طور عرفاں - سراپا نورایاں دامت برکاتکم
 بادب ملتئم ہوں کہ صحیفہ ہدایت ادائے رمضان میں صادر ہوا تھا جس کے
 جواب کے مسودے میں قوتِ ممیزہ کاٹ چھانٹ کر تی رہی اور تاخیر کی مدت بڑھتی
 رہی اس واقعہ کا تذکرہ کل ایک کارڈ میں کر چکا ہوں اس عریضے میں اس حادثہ کا
 بھی ذکر آچکا ہے کہ ٹھنڈی ہواؤں کے تند و تیز طوفاں کی زد میں آکر میری صحت کا یہ
 حال ہوا کہ ماہِ مبارک کا دامن میرے ہاتھ سے پھوٹ گیا اور جو سلسلہ حضرت کی
 دعار سے روزے کا قائم ہوا تھا اچانک ٹوٹ گیا اسی لئے ایک کارڈ دوبارہ دعار
 فرمانے کے لئے سرِ یاد کی تھی۔ میرا اب یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ کسی خدا دوست سے
 دعار کی التجا اسکے ہاتھ اٹھانے سے پہلے ہی قبول ہو جاتی ہے جیسا کہ اسی سال
 رمضان میں مشاہدہ ہوا کہ ادھر حضرت کی خدمت میں درخواست لکھ کر فارغ ہوا
 ادھر مجیب الدعوات کی طرف سے دراجابت وا ہو گیا یعنی صحت کی ناہمواری میں
 ایک تبدیلی نظر آئی اور تنفس کی گرفت ڈھیلی نظر آئی، اللہ کا نام لیا اور دوڑ کر
 ماہِ مبارک کا دامن تھام لیا۔ حضرت کی نسبت کا شرف کام آیا اور اس
 مایوس العلاج کے ہاتھ میں نشاطِ رمضان کا جام آیا تب سے شب میں صرف
 ایک خوراک دوا کی لے لیتا تھا اور روزے کی ناک کو حضرت کے دست دعار کے
 فیض سے کھلے لیتا تھا۔ ہوا میں جتنی نمی ہوتی تھی اس ستفیض کے ایمان میں اتنی
 ہی ہماہمی ہوتی تھی داؤں سے جو کام نہیں ہو سکا تھا دعار کی درخواست سے
 چند لمحوں میں ہو گیا اور دل ایک مستجاب الدعوات کی چشمِ مروت کی یاد میں کھو گیا۔
 کل سے اس سلسلے کے جوڑنے کا ارادہ ہے جو خاص طور پر حضرت کی
 دعار سے چل رہا تھا ڈاکٹر نے آج اجازت بھی دیدی ہے۔ دعا فرمائیں کہ یہ سفینہ
 ناسازگاری کی کسی چٹان سے اب نہ ٹکرائے اور ہلالِ عید کے ساحل تک بسہوت
 پہنچ جائے بلکہ اتنی طاقت آجائے کہ چھوٹے ہوئے روزوں کو عید کے بعد ہی

پورا کر لوں -

حضرت والا کی خدمت میں ارسال کرنے کے لئے عریفہ ترتیب دینے بیٹھتا ہوں تو شوق کچھ اس طرح خیال کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ نشر کو نظم کا لباس پہنھانے کے لئے اڑ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خالی اوقات کا اکثر حصہ حضرت کے تصور میں مصروف رہتا ہے اور اس توفیق پر دل وجد کرتا ہے۔ خیال کی خوش نصیبی ہے کہ حضرت کے مکارم اخلاق سے رنگ و روغن مانگ مانگ کر سنورتا ہے۔ چنانچہ حضرت کی دعا سے جو توفیق روزہ رکھنے کی ملی تھی اس کے تصور نے فوراً چند اشعار ترتیب دیئے میرے شوق کا ارمان ہے کہ حضرت اسے ملاحظہ فرمائیں۔

مری صحت کو جو روزے پہ آج قدرت ہے دعائے حضرت والا کی استجابت ہے
ہے اندلوں تو مرے دل میں ایک افشیں ہیں نہ زندگی کی تمنا نہ تازگی کی ہوس
دلادے مجھ کو شریعت سے رخصت افطار نہ اتانگ بوسینے میں میرے سانس کا تار
یہ ناؤ اب کسی چٹان سے نہ ٹکرائے ہلال عید کے ساحل سے جا کے لگ جائے
میں چل رہا ہوں عزیمت کا رواں کساتھ ہے میرے ساتھ مرے شیخ کی دعا کا ہاتھ
چراغ راہ مدہی، با خدا و صی اللہ ضیائے دین و شریعت ہے جہان نورنگا
شکیل دیدہ و دل کو جو ان سے نسبت ہے
انھیں کی چشم عنایت کی یہ کرامت ہے

اس عریفے کی ترتیب و تہذیب کی اثنائے میں دو خواب بھی دیکھے ہیں۔
(الف) ایک خواب تھا کہ اپنے ایک شاگرد عزیز کے ساتھ جنکی دوکان پر اکثر بیٹھا کرتا
اور کبھی کبھی سہ پہر کو ان کے ساتھ ناشتہ کرنے کا بھی اتفاق ہوتا ہے بیٹھا ہوا کچھ
کھا رہا ہوں اتنے میں محترم واجد علی خاں صاحب سامنے آ جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر یاد
آ جاتا ہے کہ یہ مہینہ رمضان کا ہے۔ فوراً منہ کے لقمے کو تھوک دیتا ہوں اور دل میں یہ
کہتا ہوں کہ بھولو کھا لینا معاف ہے۔

(دب) دوسرا خواب اُس رات میں دیکھا جسکی شام سے مندرجہ بالا اشعار کی ترتیب دماغ پر مستولی رہی بالخصوص آخر کے دونوں اشعار نے فکر کو حضرت والا کے محاسن صفا کی یاد میں مستغرق رکھا۔ خواب یہ تھا کہ بعض تشویشناک ہنگاموں سے گذرتا ہوا اس مقام پر پہنچا ہوں جہاں حضرت کی حیات ہی میں حضرت کا مزار بنایا جا رہا ہے۔ یہ مزار ایک مسجد کے اندر اسکے اندرونی صحن کے جنوبی مشرقی حاشیے پر واقع ہے۔ ہے تو یہ مزار بہت سادہ و بے تکلف سالیکن اس میں سنگ مرمر نصب ہیں سرہانے ایک چھوٹی سی محرابی دیوار کھڑی کی گئی ہے اور اسکی پشت پر لوگ بیٹھتے جا رہے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے حضرت کا عرس کیا جا رہا ہے اور دماغ میں تیزی سے یہ خیال بھی ایک لمحے کے لئے دوڑ گیا کہ تو الی بھی ہوگی۔ میرے دل پر غم کا دباؤ اور حیرانی سی ہے لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم تو آگے کی صف میں بیٹھو انکا مطلب یہ ہے کہ حضرت کی مجلس میں چونکہ اس خادم کو انتہائی قرب حاصل رہتا تھا اسلئے آج بھی مجھے ممتاز صفت میں جگہ ملنی چاہیئے۔ لیکن میں ایک تاثر کے ساتھ سب سے پیچھے کی صف میں بیٹھ گیا اور دل یہ سوچ کر ڈوبنے لگا کہ جو کچھ ہو رہا ہے حضرت کے مسلک کے خلاف ہو رہا ہے۔ بس اسی حالت میں آنکھ کھل گئی۔

(تحقیق)

مجی سلم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پہلے آپ کا کارڈ ملا اسکو پڑھ کر اور اجاب کو سنا کر دل حزیں کو تسلی دے رہا تھا کہ دوسری ڈاک سے آپکا لفافہ بھی مل گیا سبب حزن تو اب آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہوگا۔ اس واقعہ فاجعہ کا ہم سب پر بہت اثر ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی چونکہ صبر بھی مرحمت فرماتے ہیں اسلئے تدریجاً غم کم ہو رہا ہے ورنہ صدمہ عظیم تھا اور ایسے وقت میں پیش آیا کہ خود میں کسی دنوں سے اپنے مرض کی تکلیف اور سخت ریاچی دورہ میں مبتلا ہو چکا تھا اور ابھی اس سے طبیعت پوری طرح سنبھلی بھی نہ تھی کہ یہ لڑکی بیمار ہوئی بعارضہ چیچک اور پھر اس سے جانبر نہ ہو سکی اسی واقعہ کی جانب میں نے

او پر ذکر کیا ہے کہ اپنے دل حزیں کو تسلی دے رہا تھا۔
 خط سے آپ کی علالت اور روزوں کے چھوٹنے کا حال معلوم ہوا اللہ تعالیٰ
 آپ کو صحت کئی عطا فرما دیں اور بقیہ ایام نشاط کے ساتھ گزار دیں۔
 محبت میں تو آدمی نجانے کیا سے کیا کرنے لگتا ہے اور شر سے نظم
 کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو کچھ ایسی بات ہی نہیں یہ سب آثار محبت سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
 اس میں ترقی عطا فرما دیں اور اسکے برکات و ثمرات سے جانبین کو بہرہ ور فرما دیں۔
 خط کے آخر میں آپ نے دو خواب اپنے بکھے میں، پہلے خواب میں آپ کے
 قلب میں رمضان شریف کی جو عظمت و احترام ہے جیسا کہ آپ کے خط کے مضمون سے
 ظاہر ہوا کہ آپ کو ان روزوں کے چھوٹنے کا بڑا قلق ہوا اسی کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ
 آپ دیکھ رہے ہیں کہ افطار کبھی کر رہے ہیں اور پھر بھولے کھا رہے ہیں اور پھر یاد آنے
 پر فوراً اس سے باز رہتے ہیں یہ سب اسی عظمت کی جانب مشیر ہیں جو اس سلسلہ
 میں آپ اپنے قلب میں پاتے ہیں چنانچہ واجد سے اسی پائے کی جانب اشارہ ہے۔
 اور دوسرا خواب طویل جو آپ نے دیکھا تو فوراً یہ بات سمجھ میں آئی کہ خواب میں
 بعض مرتبہ بہت لطیف مناسبات ہوتے ہیں۔ پس مزار کے وہ معنی نہیں جو متباد
 ہیں بلکہ مزار سے مراد زیارت گاہ کے ہیں اور قبر کو مزار اسی اعتبار سے کہا بھی جاتا ہے
 تو وہاں ہجوم کا ہونا اور قوالی کا ہونا یہ سب اس کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کی توجہ یہی
 جانب نشاط کے ساتھ ہو رہی ہے تو کیا عجب آپ غفیر کوئی ایسی خبر سنیں یا ایسا
 واقعہ دیکھیں جس سے بیمار کی لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو کر کچھ کام ہو جائے
 یہاں آباد میں ایک دینی دارالعلوم کی بنیاد رکھنے کا خیال ہے اور بستی کے لوگ بھی
 اب کچھ متوجہ نظر آتے ہیں۔ باقی حیات میں مزار یہ موت و اقبال ان تموتوا کے قبیل سے
 ہے۔ اہل استدھتاری موت زندگی ہی میں حاصل کر لیتے ہیں اور اسکا حکم ہے۔
 چنانچہ حضرات اپنے ارادہ کو اپنے نفس کو سب ہی کو فنا کر دیتے ہیں۔ یہی موت ہے
 پس چونکہ آپ کو مجھ سے محبت ہے اسلئے ہو سکتا ہے ایسی کوئی بات اور نمایاں

کوئی کام میری ذات سے انجام پانے والا ہو جو زیارت گاہ خاص و عام بنے۔
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعلق خاطر کی وجہ سے یہاں پچی کی قبر اور وہاں احباب کا
اجتماع صبح و شام یہ سب آپ پر منکشف ہوا ہو کیونکہ اولاد کی مزار باپ ہی کی مزار ہے۔

والسلام خیر ختام
(صاحب مکتوب کا ایک اور مکتوب ملاحظہ فرماتے چلئے یہ خط مولوی شکیل حسین صاحب نے
اپنے ایک لائق و محبوب شاگرد پروفیسر عبدالحکیم صاحب ڈگری کالج بلرام پور کے نام
لکھا تھا دیکھئے حضرت اقدس کا تذکرہ کس محبت سے کیا ہے ماسٹر صاحب موصوف
میرے بھی کرم فرما اور مخلص دوستوں میں سے ہیں انھیں کے واسطے سے یہ جواہر پارے
مے جو درحقیقت امت کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انکو جزائے غیر
عطا فرمائے اور صاحب مکتوب جناب شکیل عباسی صاحب کو صحت عطا فرمائے اور
حضرت اقدس کے ساتھ ان کے اس مخلصانہ تعلق کا بھرپور صلہ عطا فرمائے۔ آمین)

(مکتوب مولوی شکیل عباسی صاحب نام پروفیسر عبدالحکیم صاحب)

عزیم سلمک اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرے حال پر مالک کا خاص کرم ہے کہ روزے نبھ رہے ہیں تراویح میں
بحمد اللہ کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی۔

اپنا ایک نہایت قیمتی سرمایہ تمھارے سپرد کرتا ہوں ایک یہ کہ تمھارے
پاس زیادہ محفوظ رہ سکے گا تمھارے گھر میں تو اس طرح کی چیزوں کی قیمت بہت
گھٹ گئی ہے ریٹائرڈ ہونے کے بعد گھر اگر دین کے استحقاق اور دنیا کے اعزاز
کو دیکھا تو دل خون ہوتا اور اسکی ایک بوند ٹپک کر شعر بن گئی ہے

تکلف دم گھٹ رہا ہے یہاں بھی شکیل آہ اب وہ بیارہ نہیں ہے

دوسرے یہ کہ اس کے کچھ مکتوبات معرفت حق میں شایع ہو سکیں گے۔ ان مکتوبات
کو بہت غور سے مطالعہ کرنے کے بعد دیکھو کہ کون سا جزو لائق اشاعت ہو سکتا ہے

الہ آباد کو کوئی بہت معتبر جانے والا ملے تو اسکو بھیج دینا، لیکن زیادہ بہتر شکل یہ ہے کہ جب بھی الہ آباد جانا ہو تو خود لیتے جانا اور کسی ذمہ دار کو خود اپنے ہاتھ سے دے دینا۔ حضرت والا کی یاد کبھی کبھی ایک تیز جھونکے کی طرح آتی ہے اور خیالات منتشر ہو جاتے ہیں اور چند واقعات کرم خاص کے یاد آتے ہیں تو دل کا ایک عجیب حال ہو جاتا ہے۔ لاوارثی سی محسوس ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہونٹ کو انگشت مبارک سے پکڑ کر فرمایا "ذکر ہونٹ سے نہیں دل سے ہوتا ہے" اس وقت یہی موضوع مجلس میں چل رہا تھا

ایک مرتبہ فرمایا "آپ سمجھئے۔ (پھر مجمع کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) یہ لوگ نہیں سمجھ پائیں گے۔"

الہ آباد سے کہلایا کہ "تبلیغ میں خوب کام کرو"۔ خادم اور مخدوم کے درمیان طریقے کا جو ایک فاصلہ سا تھا وہ بھی ختم ہو گیا لیکن آہ استغنیٰ میں بساط ہی لپیٹ دی گئی اور ایک لمبے چوڑے اندھیرے میں نورانی تبسم کی یاد کا سہارا رہ گیا اور بس۔

اپنے اور بچوں کے احوال بکھڑکھڑی ہو گئے انتظار رہے گا۔ فقط۔ دعائیں۔

(اس موقع پر صاحب مکتوب کی ایک نظم جو انھوں نے "حضرت والا کی یاد" کے عنوان سے کہی تھی یاد آگئی ناظرین بھی ملاحظہ فرماتے چلیں) :-

تصور کو بے نسبت ایک نورانی تبسم سے اسی سے دل میں بھی اک روشنی معلوم ہوتی ہے
بساط اس بزم کی کب کی لپیٹی جا چکی لیکن نظر اسکی تجلی سے بھری معلوم ہوتی ہے
وہی اک بات جو سوار گزری ہے نگاہوں سے زبان شیخ پر آ کر نئی معلوم ہوتی ہے
یہ تو نے کیا کیا اے شوق عرض دعا کر کے نگاہ شوق میں مجھ کو کی معلوم ہوتی ہے

شکیل اک رند اور اس درجہ گم سم بات کیا ہے یہ
کسی اہل نظر کی رہبری معلوم ہوتی ہے

(مکتوب میں جس دارالعلوم کا ذکر ہے وہ یہی مدرسہ وصیۃ العلوم ہے اور حضرت کا رسالہ معرفت حق کے بجائے اب "وصیۃ العرفان" نکل رہا ہے)

مولوی شکیل عباسی مدظلہ کے نام حضرت مصلح الامة کا ایک اور خط

(نوٹ: اس خط میں حضرت اقدسؒ نے خود اپنے ہجرت از وطن کا اجمالی حال بیان فرمایا ہے اور اہل گورکھپور کی دعوت تشریف بری گورکھپور سے معذرت ظاہر فرمائی ہے۔ جامی)

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

میں نے فتحپور کا قیام اپنی مصالح ذاتیہ کی بنا پر ترک کیا تھا اور جب اپنے مولد و مسکن کو ترک کیا تو کہیں رہنا ضروری تھا۔ گورکھپور کے لوگ وہاں موجود تھے انکے ہمراہ گورکھپور آگیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا وہاں رہا جب وہاں زیادہ بیمار رہنے لگا یہاں کے آنیکا ارادہ کیا اپنی صحت کے خیال سے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے فائدہ ہوا۔ وہاں کی بہ نسبت یہاں بجز اللہ صحت ہے۔ قیام یہاں (الہ آباد میں) بھی اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر ہوا ہے۔ جب رہنا طویل ہو گیا تو مکان بھی خرید لیا گیا، لوگ بھی آمد و رفت رکھنے لگے۔ اسکو کیا کروں، انکو کیسے روک سکتا ہوں؟ تدریس کا بھی سلسلہ ہے اور بھی کام ہیں جو مجھے روک کرنے ہوتے ہیں۔ آنے جانے میں سب فوت ہو جاتے ہیں۔ صحت خود کہیں آنے جانے سے مانع ہے اور دوسرے امور بھی مانع ہیں۔ طبیعت اب ڈر گئی ہے سہم گئی ہے ہر امر میں خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت جگہ سے لوگ بلانا چاہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں اپنے اعدا بیان کر دیتا ہوں خاموش ہو جاتے ہیں اولاً تو تعلیم و تربیت میرے بس کی بات نہیں سرے تھوڑا وقت اسکے لئے کافی نہیں کہیں جم کے آدمی رہتا ہے تب ہی کام ہوتا ہے۔ میں نے وہیں قیام کا ارادہ کیا تھا مگر منظور نہ ہوا۔ اب کیا کروں بالکل اپنی مجبوری کا اظہار کر رہا ہوں آپ

بھروسہ سمجھ کر معاف فرمائیں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

والسلام خیر ختام وصی اللہ عفی عنہ

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت والا ترک قیام فتحپور کی وجہ اپنی ذاتی مصالحت کو فرما رہے ہیں۔ اور وہ یہی تھی کہ مفسدوں نے یہاں کی فضا ایسی مسموم کر دی تھی کہ یہاں دین و اصلاح کا کام سکون و یکسوئی کے ساتھ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور حضرت اقدس کا جو مشن تھا یعنی خانقاہی طرز کا کام وہ کامل سکون کو چاہتا تھا۔ پس حضرت والا نے یہاں اپنے دینی کام کے ضیاع کو محسوس فرما کر وہاں سے ہجرت کر جانا ہی مناسب سمجھا۔ باقی یہ بات ہرگز نہیں تھی کہ حضرت اقدس کی پوزیشن یا احترام خدا خواستہ وہاں باقی نہیں رہ گیا تھا اس لئے آپ نے وطن چھوڑ دیا تھا یا وہاں کے فتنہ میں کوئی قتل کا کیس ہو گیا تھا۔ تو بہ تو بہ ان چیزوں کا تو وہاں دور تک پتہ نہ تھا جن حضرات کے لغزش قلم سے اس قسم کی باتیں سرزد ہو گئی ہیں وہ ان کے انتہائی غیر تحقیقی رویہ اور بے احتیاطی کے ماتحت وقوع میں آئی ہیں۔ اور غلطی کا منشاء یہ ہوا کہ واقعات کی تحقیق غیر محل سے کی گئی حضرت اقدس کی خدمت میں رہنے والے اور بوقت واقعہ موجود رہنے والے بہت سے لوگ اب بھی زندہ ہیں کا ش ان سے ہی دریافت کر لیا جاتا تو یہ بے احتیاطی راہ نہ پاتی۔

اسی طرح سے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت خود ارشاد فرما رہے ہیں کہ گورکھپور کے لوگ وہاں موجود تھے ان کے ہمراہ گورکھپور چلا آیا۔ اب یہ کہنا کہ حضرت پاکستان جانا چاہتے تھے اور گورکھپور کے حضرات وہاں جانے سے مانع ہو گئے اور اپنے یہاں باصرہ حضرت کو لائے اور لا کر معاذ اللہ حضرت کو پریشان کیا اور ذلیل کیا اس قسم کی باتیں کسی مقصد کے پیش نظر تو کہی جاسکتی ہیں باقی واقعاتی دنیا سے انکا کچھ تعلق نہیں ہے۔ پاکستان کا سفر اس وقت حضرت اقدسؒ کے ارادے میں تو کیا گوشہ تصور میں بھی نہ تھا۔ اور کسی معاملہ میں اصرار کی کس کی مجال تھی حضرت والا خوشی خوشی گورکھپور تشریف لے گئے تھے اور جو لوگ حضرت کو لے گئے تھے انکا احسان حضرت

عمر بھرمانتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ باب اصلاح میں کبھی کسی کو کچھ تنبیہ فرمادیا ہو یا کسی مرید کی غفلت پر اس سے کچھ مواخذہ فرمایا گیا ہو، تو یہ تو اس طریق کے اور باطنی تعلقات کے لوازم ہی سے تھا۔ کوئی بھی مخلص اپنے شیخ کی اس نوع کی اصلاحات سے بچا نہیں کرتا بلکہ وہ مخلص ہی بنتا ہے اس قسم کی آزمائشوں میں بڑھنے اور انکے سہنے اور برداشت کرنے کے بعد ہی ۵

آئینہ بنتا ہے رگڑیں لاکھ جب کھاتا ہے دل

دوستو! یہ دل بڑی مشکل سے بن پاتا ہے دل

اب اس نوع کے واقعات کو دیکھ کر کسی کو غیر مخلص کہہ دینا ایسا مغالطہ ہے کہ کوئی مخلص ہی اس سے بچ سکتا ہے اسی طرح سے حضرت اقدس کے متعلق یہ کہنا کہ وطن میں لوگ آپ کے دشمن بہت ہو گئے تھے جسکی وجہ سے آپ کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس لئے آپ نے ترک وطن فرمایا تھا اس قسم کے پروا گندے اہل عبت نے تو بہت کئے تھے اور ان کے لئے یہ مناسب بھی تھا باقی اہل حق بالخصوص حضرت والا سے کچھ بھی عقیدت یا تعلق رکھنے والوں سے تو اس قسم کی باتیں کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کوئی شخص کسی بزرگ کے صحیح حالات سے واقف نہ ہو تو اسے ان بزرگ کی سیرت اور حالات لکھنے کی مصیبت ہی کیا آ پڑی ہے کیونکہ اس طرح غلط سلط حالات بیان کرنے سے ان بزرگ سے بجائے قرب و عقیدت پیدا ہونے کے بعد پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے جو کہ صاحب سیرت کی اعانت نہیں امانت ہے۔

حضرت اقدسؒ کا رعب وطن میں نہ صرف اپنوں ہی پر تھا بلکہ غیروں پر بھی بہت کافی تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ کوئی حضرت والا کے سامنے زبان ہلا سکے یا آنکھ ملا سکے۔ اسی طرح سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو خدا تھے ہی غیر مسلم بھی بے انتہا عقیدت سے پیش آتے تھے۔ الہ آباد تشریف لانے کے بعد جب آپ دوبارہ وطن تشریف لے گئے ہیں تو حضرتؒ کے ہمراہ الہ آباد سے چند معزز حضرات بھی

تشریف لے گئے تھے اگر کسی کو حضرت والا کی عزت و احترام اور اپنے پر اسے کی نظروں میں حضرت کا مقام کا اندازہ کرنا ہو تو ان حضرات سے دریافت کر لے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے خود قدر و منزلت کے مناظر دیکھے تھے۔

غرض وطن میں نہ قتل کا واقعہ پیش آیا تھا نہ لوگ حضرت کے جانی دشمن ہوئے تھے، نہ حضرت پاکستان جا رہے تھے، نہ وطن میں بے قدری تھی یہ سب باتیں بالکل غلط اور بے بنیاد مشہور کی گئی ہیں۔

رسالہ البلاغ کراچی کی چند ماہ قبل کی اشاعت میں ایک مضمون حضرت کے حالات کا نظر سے گذرا تھا جو اسی قسم کے بہت سے غیر تحقیقی واقعات پر مشتمل تھا۔ آپ خود خیال فرمائیے کہ کسی بزرگ سے مخلوق کو ایسی دشمنی ہو جانا کہ لوگ اسکے جانی دشمن ہو جائیں اسکے مرید قتل و قتال میں حصہ لیں، وہ شیخ اپنے وطن میں وقعت اور بے عزت ہو جائے، اسکے ہی مریدین خود اسکو دھوکا دیں، دوسری جگہ وہ شیخ وقت ہو کر بھی اپنے متعلقین کو چھوڑ کر دوسروں سے پناہ طلب کرے اور ایسا ہو جائے جیسے کوئی بے بس اور بے سہارا شخص ہوتا ہے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، یہ سارے امور اسکے کن صفات عالیہ کے مظہر ہیں اور سیرت کے کون سے درخشندہ موتی ہیں جن سے کسی بزرگ کی سیرت سجائی جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وطن سے سبب ہجرت صرف یہ ہوا کہ حضرت والا نے وہاں سکون اور یکسوئی کو مفقود پایا اور اب اس جگہ کو تعلیم و تربیت کے لئے مناسب نہ جانا اس لئے وہاں سے ہجرت فرمائی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اب یہاں فتنہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کی جگہ سے پناہ مانگی ہے اور ایسی جگہ سے دوری اختیار فرمائی ہے اسلئے اب میں یہاں رہنا مناسب نہیں سمجھتا

اوپر حضرت اقدس کا ایک مکتوب مولوی شکیل صاحب کے نام نقل کیا گیا درمیان میں بعض ضروری باتیں آگئی تھیں اب اسی سلسلہ کی ایک اور تحریر ایک دوسرے مولوی صاحب کے توسط سے مولوی شکیل صاحب کو بھیجی گئی چونکہ حالات کیلئے وہ بھی

کاشف ہے اسلئے اسکو بھی ملاحظہ کے لئے پیش کرتا ہوں

حضرت صالح الائمہ کا ایک اور خط مولوی شکیل حسنا کے نام

محبی سلم اللہ و زاد عرفانکم . السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احمد شہ بخیریت ہوں مولوی ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کے جواب کے ہمراہ آپکا بھی محبت نامہ ملکر مزید مسرت کا سبب بنا ۔ میں نے اپنے خط میں گو رکھپور کیوں آؤں اور آؤں کہ نہ آؤں کا جو سوال کیا تھا تو اسکی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ نے پہلے کبھی مجھے یہ تحریر فرمایا تھا کہ — " اندر سے ایک آواز آتی تھی کہ دلوں کی جس تعمیر میں حضرت نے ہاتھ لگایا تھا اسکا ناتمام رہنا گوارا نہ فرمائیں گے اور کم از کم کچھ دنوں کے لئے ضرورت شریف لائیں گے ۔ احساس محرومی تڑپ کر کہتا ہے کہ حضرت اب تشریف لائیں گے تو ایک دن بھی حاضری ناغہ نہ ہوگی " — یہ بات مجھے یاد تھی تو میں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ دیکھوں اور لوگ اسکے متعلق کیا کہتے ہیں ؟ کیونکہ مجھے بھی یہ پسند نہیں کہ ایک کام کو شروع کر کے اسکو ناتمام رہنے دیا جائے اسلئے مجھے آپ کی یہ بات بہت پسند ہوئی تھی اور میں بھی دل سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں ، گو اسکا اہل تو تو نہیں تاہم آپ حضرات کی محبت و عقیدت کی وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے ہی کوئی کام لے لیں تو کیا بغیر ہے لیکن اس خدمت کے لئے میرا جسمانی قرب (کہ میں وہاں آؤں) نہ ضروری ہے نہ کچھ زیادہ مفید ہے ۔ ہاں روحانی قرب البتہ ضروری ہے جو احمد شہ کہ میرے یہاں ہونے پر بھی آپ حضرات کو حاصل ہے ۔ بس کام کیجئے ۔

باقی وہاں آنے کا مجھے انکار بھی نہیں ہے مگر اسکے لئے ایک شرط ضرور ہے وہ یہ کہ میں یہ سمجھ لوں کہ یہاں کی عارضی غیر حاضری بھی یہاں کے کام کے لئے مضر اور محل نہ ہوگی اسکا ضرور انتظار ہے کیونکہ ایک جگہ کا ہوتا ہوا کام خراب کر کے دوسری جگہ کا کام بنانا کیا مفید ہوگا لطف تو جب ہے کہ یہاں بھی کام ہوا اور وہاں بھی ۔ جس دن آپ حضرات کے خطوط آئے تھے اتفاق سے مولوی وصی الدین

صاحب ایسے وقت جا رہے تھے کہ موقع تحریری جواب کا نہ تھا چنانچہ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ ہی کو جواب بنا کر بھیجتا ہوں مگر دل اس زبانی جواب پر نہ مانا اسلئے آج یہ تحریر بھیج رہا ہوں اسکو سب حضرات کو سنا دیجئے اور یہ آپ کے مولوی عبدالحمن صاحب اور حکیم وصی احمد صاحب کے خطوط کا مشترکہ جواب ہے۔

حضرت مصلح الامۃؑ کے حالات گورکھپور کے سلسلہ میں راقم نے وہاں کے چند خاص خاص لوگوں کے حالات بیان کئے ہیں چنانچہ آخر میں محترمی مولوی شکیل احمد صاحب عباسی مدظلہ کی مکاتبت سے ناظرین کو اندازہ بھی ہوا ہوگا کہ حضرت کا فیض گورکھپور میں کیسا کیسا پہونچا اور چند ماہ کے قیام نے وہاں بھی کیسے کیسے مخلص پیدا کئے چنانچہ ایک کثیر مخلوق کو حضرت والا کا فیض پہونچا جی چاہتا ہے کہ چند حضرات کے خطوط اور نقل کردوں جن سے حضرت والا کا افادہ اور حضرت کے الہ آباد چلے آنے پر وہاں کے لوگوں کے قلبی تاثرات کا اندازہ ہوتا ہے

(مکتوب بنام حضرت مصلح الامۃؑ)

حال :- نہایت ادب سے عرض ہے کہ جس وقت سے حضور والا کی تشریف آوری گورکھپور میں ہوئی اسی وقت سے یہ گنہگار خدمت والا میں حاضری کا شرف حاصل کر رہا ہے اور جو بیش بہا موتی آنحضرت اپنے وعظوں میں بکھیرتے ہیں جن جن کو لاتا ہوں اور حتی الوسع اس سے مستفید ہونے میں مشغول رہتا ہوں۔ احقر ان احکامات کی بجا آوری میں تسکین اور خوشی محسوس کرتا ہے اور خدا سے دعا کرتا ہے کہ اسی حالت کو تازیت حضور کے طفیل سے قائم و برقرار رکھے۔

مجھے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضری سے دو فوائد روز حاصل ہوتے ہیں اول یہ کہ جتنی دیر نشست ہوتی ہے اتنی دیر عبادت میں گزرتا ہے۔ دوم یہ کہ نبی بات دین کی معلوم کر کے عمل کرنے کی گدگدی دل میں پیدا ہوتی ہے

بسا اوقات اللہ تعالیٰ سے دست بہ دعا ہوتا ہوں کہ حضور والا کو مدت دراز تک ہم لوگوں میں قائم رکھے۔ تحقیق: آمین۔ میں اس دعا کا ممنون ہوں۔
 حال:۔ اکثر اس خیال سے بھی کانپ اٹھتا ہوں کہ حضرت ہم لوگوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کو نہ تجویز فرمائیں۔

تحقیق:۔ یہ آپ کی محبت ہے، محبت میں جدائی گوارا نہیں ہوتی
 حال:۔ اور یہ دین کا چشمہ جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے گورکھپور میں جاری کر رکھا ہے کسی دوسری جگہ رجوع نہ ہو جائے۔ میرا یہ خدشہ صحیح بھی ثابت ہوا لیکن خدا کا شکر ہے کہ اللہ رب العزت نے اس چشمہ فیض کی روانی کو دوسرے شہر کی جانب رُخ کرنے سے روک دیا اور جناب ۔۔۔۔۔ صاحب کو اللہ تعالیٰ انکو اجر عظیم فرمائے (تیار کر دیا کہ وہ گورکھپور کو اسی چشمہ دین سے سیراب ہونے میں مدد دیں۔ یہ گورکھپور اور اہل گورکھپور کی خوش قسمتی ہے کہ ایسی ہستی جو مندوستان میں نایاب ہے یہاں قیام پذیر ہے۔

تحقیق:۔ میں آپ کی عقیدت و محبت سے بہت خوش ہوں اور دل سے دعا گو ہوں
 حال:۔ میں حضور والا کی شفقت و محبت و عنایت کا تہ دل سے شکر گزار ہوں، مجھ کو حضرت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا جس کا احساس مجھی کو ہو سکتا ہے۔
 تحقیق: اور بھی نفع ہوگا

حال:۔ خداوند عالم کی یاد و اتباع سنت و احکامات شرعیہ کا ذوق و شوق ہر وقت دائم گیر رہتا ہے یہ سب حضور کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ تحقیق: اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔
 حال: امید ہے کہ حضرت ایسے ہی خیال فرماتے رہیں گے اور اس گنہگار کو نجات کا راستہ دکھلاتے رہیں گے۔ تحقیق: ضرور بالضرور

ایک اور طالب کا خط حضرت مصلح الامتہ کے نام

حال: حضرت والا کا قیام گورکھپور بیشک ایک نعمت عظمیٰ تھا جس کا احساس

اب ہو رہا ہے۔

تحقیق: بیشک اب احساس آپ کو ہوا۔ قدرِ نعمت بعد زوال۔
حال: حضرت والا کے جانے کے بعد سے عمل میں کوتاہیاں ہو جایا کرتی ہیں جیسے
مشعل راہ ٹٹنے کے بعد سے راہ رو کو بھٹک پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر حضرت والا
کی دعائیں شامل حال رہیں تو اس ناتواں بازوؤں میں قوتِ خدا داد پیدا ہو سکتی ہے
تحقیق:۔ دعا کرتا ہوں

حال:۔ گزرے ہوئے حالات اور کیفیات اور شفقت جب یاد آتی ہے تو
اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے حالانکہ یہ نعمتِ خلافت امید ملی تھی افسوس کہ
ہم لوگوں نے قدر نہ کی، اب اللہ تعالیٰ ارشادِ عالیہ پر توفیقِ عمل کی عطا کرے۔
حال:۔ ڈیڑھ سال کے قیام گورکھپور میں حضرت والا نے شب و روز احکامِ خدا
و رسول ہم لوگوں تک اتنا پہنچایا کہ اگر عمل کیا جائے تو کافی و وافی ہے تحقیق بیشک
حال:۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ جن باتوں کو سنا ہے اس پر عمل کی توفیق دیدیں
دین کا کام کرتا ہوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔
تحقیق: اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائے۔

حال: ص ۷ شاہاں چہ عجب گر بنوا زندگدارا۔

۷۔ تہستانِ قسمت را چہ سودا ز رہبرِ کامل کہ خضر از آبِ حیاں تشنہ می آر و سکندرا
تحقیق: بھائی یہ کیوں لکھ رہے ہو۔ سود تو ہوا ہر شخص کو گو کامل نہ ہوا ہو۔ تو
کامل جلدی ہو جاتا ہے؛

(راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کو خط میں بہت سے لوگ یہ شعر لکھتے تھے جس سے
مایوسی جھلکتی تھی اور پست ہمتی ٹپکتی تھی حضرت کو یہ مضمون لوگوں کا کبھی بھی پسند نہیں ہوا
چنانچہ ان صاحب کو بھی ٹوکا کہ ”بھائی یہ کیوں لکھتے ہو“۔ مطلب یہ کہ جب سمجھتے ہو کہ کوئی
رہبرِ کامل مل گیا ہے تو اب کس بات کا انتظار ہے اس سے نفع اٹھاؤ۔ باقی یہ جو اس قسم
کی بات لکھتے ہو یہ نفس کا کید اور شیطان کی رہزنی ہے کہ وہ ہمت پست کر کے عمل سے باز رکھنا چاہتا)

اسکے بعد ایک خط حاجی ولی محمد صاحب کا ملاحظہ فرمائیے۔ حاجی صاحب موصوف
مولوی حکیم وصی احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے اور حضرت اقدس کے مخلص خدام میں
سے تھے۔ حکیم وصی احمد صاحب کے مکان میں منتقل ہونے میں دخل حاجی صاحب کے
تعلق خاص اور ان کے اخلاص کو بھلی تھا۔ یہ کسی بھائی تھے اور ان کا بڑا خاندان تھا سب ہی
حضرات کم و بیش حضرت کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ حاجی صاحب موصوف بڑے سیدھے
سادے اور بھولے بھالے انسان تھے گورکھپور میں اردو بازار میں عطاری کی دوکان تھی اور
اس میں شک نہیں کہ حضرت اقدس سے اس ولی کو دلی محبت تھی۔ خط ملاحظہ فرمائیے کہ
کس طرح چند سادے لفظوں میں اپنے قلبی درد کا اظہار کیا ہے

(خط جناب حاجی ولی محمد صاحب نام حضرت مصلح الامۃ؎)

حال: — مخدومی محترمی جناب حضرت والا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
الحمد للہ کہ خادم خیریت سے ہے حضرت لالکی دعا چاہیے۔ حضرت والا کی
صحت کے لئے ہملوگ دعا کرتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ایک دفعہ
حضرت والا کا قدم اور آجائے خدا کے حکم سے۔ خادم ولی محمد
تحقیق: — مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
بھائی صاحب اتنی جلدی گھبرا گئے، ابھی تو کچھ ٹھیک ہو رہا ہوں۔ دیکھو بھائی
دین کی خدمت کے لئے صحت بہت ضروری ہے اور یہ بغیر اسکی حفاظت کئے نہیں ہو سکتی
میں آپ لوگوں کی طرف دل سے متوجہ ہوں برابر خیال نگاہ رہتا ہے اور میں نے آنے جانے
سے کب انکار کیا ہے۔

آپ میری طرف سے حکیم وصی احمد صاحب سلمہ کی اہلیہ سے کہہ دیجئے کہ تم کیوں
رنج میں اپنی صحت خراب کر رہی ہو، کیا اب ملاقات ہو ہی نہیں سکتی؟ دیکھو تو میں کس طرح
آپ مجھے کس قدر تکلیف تھی یہاں آکر اچھا ہو گیا اس سے آپ کو اور سب کو خوش ہونا چاہیے
صحت بہت ضروری چیز ہے مجھ کو اتنا غم پسند نہیں میرا یہ خط وہ بار بار پڑھیں انکا غم

اسی سے جاتا رہیگا بلکہ یہ خط میرے سب متوسلین کو پڑھکر سنا دیجئے۔ میں سب کے لئے دعا کر رہا ہوں اطمینان رکھیں۔ والسلام۔

وصی اللہ عفی عنہ

ذیل کا ایک اور خط جناب حکیم وجیہ اللہ صاحب کا ہے۔ آپ بھی غالباً اعظم گڑھ کے باشندے تھے گورکھپور میں مطب فرماتے تھے وہاں کے مشہور طلباء میں سے تھے حضرت اقدسؒ سے ملتے تھے لیکن بہت کم۔ دیندار آدمی تھے اور اپنے ہی مسلک کے لوگوں میں سے تھے لیکن رجحان کچھ مودودی خیالات کی جانب بھی تھا اسی لئے ان کا خط پا کر حضرت کو تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی جیسا کہ جواب والا سے ظاہر ہے۔

خط جناب حکیم وجیہ اللہ صاحب بنام مصلح الامۃ

حال : — محترم و مولانا سلام مسنون — آپ کے بلا علم و اطلاع تشریف لیجانے اسلئے اور بھی افسوس رہا کہ نیاز نہیں حاصل کر سکا اور ایک افسوس و مایوسی کا باعث یہ ہوا کہ بعد میں آپ نے گورکھپور چھوڑ دینے اور الہ آباد میں مستقل رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولوی غیاث الدین صاحب اور حاجی دلی محمد صاحب سے واپسی پر غیریت مزاج معلوم کرتا رہا۔ بہر حال یہ توقع اور امید ضرور قائم ہے کہ خصوصی اوقات میں اس ناچیز کے لئے بھی عاقبت بخیر ہونے کی دعا فرماتے رہیں گے۔

بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے میں جو فادیت ہے اس پر پورا پورا یقین رکھنے کے باوجود اپنی بعض معذوریوں کے باعث اسکا حق نہیں ادا کر سکا کاش یہ پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ مواقع تھوڑے ہی دنوں کے لئے میسر ہوئے ہیں تو شاید یہ تساہل نہ ہوتا۔ فقط۔

والسلام۔ نیاز کیش حکیم وجیہ اللہ

تحقیق : — مجی و مکر می زاد اللہ تعالیٰ اخلاصکم و اعزکم اللہ و اکرمکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آپ کا محبت نامہ ملا آپ کے اس تعلق اور محبت کا میرے قلب پر خاص اثر ہوا۔
اس سے پہلے آپ کے تعلق کا اندازہ نہ تھا لیکن آپ کے اس خط سے بید متاثر ہوا اور

معلوم ہوا کہ آپ کو مجھ سے اتنا زیادہ تعلق ہے واقعی آپ حضرات کو میری جدائی کا صدمہ اور قلت ہے۔ لیکن حکیم صاحب میں کرتا کیا دیکھنے میں کس حال میں یہاں آیا ہوں، انتہائی کرب اور تکلیف تھی جسکی وجہ سے سفر پر مجبور ہوا اگر ویسے آجاتا تو آپ حضرات کے لئے بیشک رنج اور افسوس کا موقع تھا مگر میں تو کسی اور ہی حال میں آیا۔ بہر حال آضرور گیا ہوں لیکن آئندہ کے لئے کچھ کہہ نہیں سکتا۔

رشتہ، درگروں، انگنہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست
 (میرے دوست نے تو میرے گلے میں پھندا ڈال رکھا ہوا اسی رسی کو کھینچتے ہوئے مجھے جہاں چاہتا ہے لیجاتا ہے)
 اہل گورکھپور کی محبت کا مجھ پر اثر ہے۔ رہا ملاقات کا معاملہ تو یہ کیا مشکل امر ہے؟
 جب باہم محبت ہے تو محبت ہر چیز کو آسان کر دیتی ہے۔ والسلام۔
 وصی اللہ عفی عنہ

(خط جناب سراج علی صاحب بستوی بنام مصلح الامتہ رحمہ)

حال : — الحمد للہ تم احمد شہید ہاں پہنچنے پر پہلا کام یہی کیا کہ اپنے جملہ دینی بھائیوں کو
 نشر گرامی سے مطلع کیا تاکہ رضائے حق کا مورد بنوں۔ جن جن حضرات سے انفرادی و اجتماعی
 دونوں حیثیتوں سے ملاقات ہوتی گئی تشریح و وضاحت کے ساتھ نشر گرامی کو پیش کرتا
 رہا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ عند ملاقات پیش کرتا رہوں گا۔ تحقیق : اللہ تعالیٰ توفیق دے
 حال : — احقر نے بھائیوں کی خدمت میں جو کچھ پیش کیا اسکا خلاصہ حضرت اقدس
 کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش ہے : —

عرض کیا کہ ہم باشندگان گورکھپور پر حق تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ حضرت والا
 مدظلہ العالی ہم میں سے ہر ایک سے خوش ہیں اور کسی سے ناراض نہیں ہیں یہ ایک نعمت
 غیر مترقبہ ہے اسکی ہم کو بجان و دل قدر کرنی چاہیے۔ تحقیق : بیشک
 ہماری بے حسی اور غفلت کا مقتضار تو یہ تھا کہ انجام اسکے برعکس ظہور پذیر ہوتا
 لیکن قربان جانیے حق تعالیٰ کی اس رافت اور انعام کے کہ بجائے ناراضگی ہم کو اپنی رحمت

سے نوازے ہمارے فرض عین ہے کہ اب سے ہم میں سے ہر ایک اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر و ثمن کو اعمالِ خالص پیش کر کے اور حضرت والا کی مزید خصوصی شفقتوں کو اپنے شامل حال کر کے رحمتِ الہی کا مورد بنے۔ تحقیق :- بیشک

حال :- یہ بھی عرض کیا کہ حضرت والا مدظلہ العالی کے یکایک الٰہ آباد تشریف لیجا نیکا واحد سبب حصولِ صحت ہے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ روز افزوں ترقی کے ساتھ صحتِ نصیب ہو رہی ہے۔ ہم طالبان و مجتہانِ صادق میں سے ہر ایک کے لئے نہایت مسرت و سجدۂ شکر کا مقام ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم نہایت عافیت و راحت سے ہیں اور لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں ہماری مخلصانہ محبت کا مقتضاء یہی ہے کہ حضرت والا مدظلہ العالی کو حق تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائیں اور اپنا یہ نفل ہم پر قائم و دائم رکھیں

اب ہم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ انعامِ خصوصی کی دل سے قدر کریں اور حضرت والا مدظلہ اپنی طویل مدت کے قیام میں شب و روز جو تعلیم اور تربیت دی ہے اس پر اپنے کو مامور کر لیں اور اپنے اعمال پیش کر کے اپنی اپنی اصلاح کریں اور محبوب کی فرقت میں جو تکلیف ہو سپر صبر کریں اور اپنے اس انعامِ خصوصی میں اس طرح عمل کر کے اضافہ و ترقی کے طالبِ صادق بنکر حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کریں۔ تحقیق :- بیشک

حال :- اگر مہلوگ اس طرح کام پر لگ جائیں گے تو حضرت اقدس نے فرمایا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو رستہ کھلتا نظر آئیگا اور فلاح دارین نصیب ہوگی۔ حضرت والا بجان و دل دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ ہم جملہ وابستگان و متبیین کو منشاِ رگامی کے بموجب صدق و اخلاص کے ساتھ کام پر مامور فرمادیں۔

تحقیق :- دل سے دعا کرتا ہوں میضنون بہت ضروری ادا ہوا۔

حال :- الحمد للہ ثم الحمد للہ حضور والا کی دلی دعاؤں کی برکت سے اس ناکارہ کو جملہ حرکات و سکنات میں اپنے باطن کی اصلاح کر کے اللہ و رسول اور حضور والا سے تعلق صحیح میں رسوخ پیدا کرنے کی نکر و دھن قلب میں جاگزیں ہو چکے۔ حضرت والا دل سے یہ دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل و کرم سے اس ناکارہ کے قلب سے مکمل طریقہ

غفلت کا ازالہ فرما کر مقصود کی تحصیل میں بامراد فرما دیں۔

مزید خیر و برکات، کام کا مسلمان بننے، جملہ خواطر کو قلب سے نکالنے، ازالہ غفلت میں بامراد ہونے اور حسن خلق سے متصف ہونے کی دل سے دعا فرماویں۔
تحقیق :- دعا کرتا ہوں

(راقم عرض کرتا ہے کہ صاحب مکتوب بالا جناب مکرمی ماسٹر واجد علی صاحب بستوی بھی میاں صاحب جارج اسلامیہ کالج گورکھپور میں پڑھاتے تھے وطن تو آپ کا بستی ضلع کا ایک دیہات تھا لیکن عرصہ سے گورکھپور ہی میں قیام رہا۔ پرانے اور عمر لوگوں میں سے تھے اور گورکھپور کے تو سابقین اولین میں سے تھے حضرت والا کے مخصوص لوگوں میں آپ کا شمار تھا۔ فچپور تال نر جا کے اپنے ابتدائی قیام ہی میں دیکھتا تھا کہ حضرت والا کے یہاں جب ماسٹر صاحب تشریف لاتے تو خاصا مجمع اہل بستی اور گورکھپور کا آپ کے ہمراہ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ بستی دیوڑیا اور گورکھپور کے بہت سے لوگوں بالخصوص نوجوانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے دین پر نگے اور حضرت اقدسؒ سے اصلاحی تعلق کرنے کا ذریعہ ماسٹر صاحبؒ ہی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت نصیب فرمائے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ حضرت والا بھی اپنے زمانہ قیام گورکھپور میں اہل گورکھپور سے گفتگو کرنے میں واسطہ مولوی امجد اللہ صاحب کو بناتے یا پھر ماسٹر صاحب موصوفؒ ہی کو بناتے تھے نیشن ہو جانے کے بعد اپنے وطن بستی ہی میں مستقل طور سے رہنے لگے اور حضرت اقدسؒ کے وصال کے کچھ دنوں بعد حضرت ماسٹر صاحبؒ بھی اپنے شیخ سے جا ملے۔ بہت ہی خوب آدمی تھے نہایت فہیم متواضع اور نرم خوان انسان تھے اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرماوے۔ آمین۔)

(خط جناب حکیم مولوی عبدالحق صاحب بنام مصلح الامۃ)

حال :- گزاریش ہے کہ حضرت والا کے تشریف لیجانے کے بعد گورکھپور میں جیسے خیر و برکت ہی ختم ہو گئی امید ہے کہ حضرت کی تندرستی بہ نسبت گورکھپور کے قیام کے الٰہ آباد میں بہتر ہوگی خاکسار حسن عمل و حسن خاتمہ کے لئے دعا کا خواہاں ہے۔

تحقیق : — آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ تمہارے جانے کے بعد گورکھپور کی
 خیر و برکت ہی ختم ہو گئی، یہ آپ کا ایمانی احساس ہے۔ اہل ایمان اور اہل ادراک کو
 یہ احساس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ خیر و برکت میں برابر ترقی عطا فرمائے
 اور کبھی ختم نہ ہو۔ آپ حضرات کی محبت و جدائی کا مجھے بھی خیال ہے۔

(دوسرا خط جناب مولوی صاحب موصوف کا بنام حضرت صالح رحمہ اللہ)

حال : — گزارش ہے کہ عرصہ سے خیال ہو رہا تھا کہ ایک عریفہ خدمت اقدس
 میں ار سال کروں مگر اپنی تباہی کی وجہ سے نہ کھ سکا غالباً جناب عالی کی طبیعت ٹھیک
 ہوگی۔ ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت نے فرمایا کہ یہاں صحت بھی ٹھیک ہے اور
 کام بھی خوب ہو رہا ہے۔ تحقیق : الحمد للہ ہو رہا ہے۔

حال : — حضرت یہ تو گورکھپور والوں کی بد قسمتی ہے کہ مکان کے اندر پاؤں اور اس
 آجانے کے باوجود اپنے قلوب کو تاریک ہی رکھا اور اس بد قسمتی کی کوئی حد ہے کہ آج
 بھی مطمئن ہیں۔

تحقیق : — جن لوگوں نے روشنی حاصل کی ہے انکا اطمینان دوسرے قسم کا ہے
 اَلَا یَذِکْرُ اللّٰہُ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ سن لو کہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہی سے قلوب اطمینان حاصل ہوتا ہے
 حال : — اس اطمینان نے مسلمانوں کو تباہ کر ڈالا کہ دینی امور میں ترقی کی کوئی
 حرص ہی نہیں اور دنیاوی امور میں اسی نسبت سے غیر مطمئن ہیں۔

تحقیق : — اطمینان بال دنیا نے بیشک تباہ کر ڈالا مگر سب ایسے نہیں۔

حال : — احقر نے ارادہ کیا تھا کہ شوال کی کسی تاریخ میں خدمت اقدس میں
 حاضری کے لئے سفر کروں گا مگر میری بد قسمتی کہ امام صاحب ایک ماہ کے لئے وطن تشریف
 لے گئے اور مجھے انکی جگہ پر امامت کا فرض انجام دینا پڑتا ہے۔

مولانا مدنی کا وصال ہوا ہے اب تک چین نصیب نہ ہوا اور یہی حال دنیا کا بھی ہو گیا ہے
 کہ مطب کا حال بہت خراب ہے مالی حالت بہت سقیم ہو گئی ہے خرچ کا چلانا مشکل ہو گیا ہے

عید کے بعد فوراً حاضر ہو سکتا تھا مگر یہ وجہ بھی مانع ہوئی۔ تحقیق معقول عذر ہے۔
 حال ۱۔ حضرت سے استعاضہ کے دعار فرمائیں کہ دینی و دنیاوی دونوں قسم کی
 راحت نصیب ہو۔ تحقیق ۱۔ دل سے دعار کرتا ہوں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں خطوط جناب مولوی عبدالحق صاحب
 مدظلہ کے ہیں۔ آپ طبیب بھی تھے اور گورکھپور کی جامع مسجد کے نائب امام بھی تھے
 حضرت والا کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ جامع مسجد کے امام صاحب بھی حضرت
 اقدس سے واقف تھے لیکن چونکہ وہ خود بھی مقامی طبیب تھے اسلئے مجلس وغیرہ کے
 موقع پر تو انھیں کبھی تشریف لاتے دیکھا نہیں۔ یوں وہ بدن کے بھی بھاری تھے اس لئے
 چلنا پھرنا مشکل ہوتا تھا البتہ حضرت اقدس سے محبت بہت فرماتے تھے۔ حضرت بھی جمعہ کی
 نماز زیادہ تر جامع مسجد ہی میں پڑھتے تھے، گورکھپور کی جامع مسجد بڑی مسجد ہے جمعہ کے
 دن بالکل بھر جاتی ہے۔ حضرت والا کے لئے یہ دشواری تھی کہ اگر اندر جگہ لینے کے خیال سے
 پہلے تشریف لیجاتے تھے تو اپنے مرض اور ضعف کی وجہ سے اتنی دیر تک انتظار کا تحمل
 مشکل ہوتا اور وقت پر روانہ ہونے پر جگہ ملنی مشکل ہو جاتی اس مجبوری اور معذوری کو معلوم
 کر کے امام صاحب نے جامع مسجد کے اندر مسجد سے متصل ہی اپنا ایک کمرہ حضرت والا کے
 لئے خالی فرما دیا تھا حضرت نماز سے ایک دو گھنٹہ قبل تشریف لیجاتے اور اسی میں آرام
 فرماتے پھر اذان کے بعد وہیں ضروریات سے فراغت فرما کر وضو فرماتے اور جماعت
 کیوقت بس کمرہ کا دروازہ کھول کر مسجد میں آجاتے اس انتظام کی وجہ سے بڑی ہی سہولت
 ہو گئی تھی اور حضرت والا کو نہایت ہی آرام ملا۔ نماز کے بعد امام صاحب بھی تشریف
 لاتے اور حضرت سے ملاقات فرماتے یہی معمول عرصہ تک رہا۔ یہاں کے امام صاحب
 مولوی فضل اللہ صاحب حضرت مولانا نور محمد صاحب پنجابی کے صاحبزادے تھے جو کہ فقہ حنفی
 ہندوہ کے مدرسہ اسلامیہ میں کبھی صدر مدرس رہ چکے تھے اور حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب
 گنج مراد آبادی نور اللہ مرقدہ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ اور انھیں مولانا نور محمد صاحب سے
 ہمارے الہ آباد کے حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب خلیفہ حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے

زمانہ قیام فتحپور میں مشکوٰۃ شریف سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔ غرض امام صاحب جامع مسجد ایک بزرگ کی اولاد تھے اسلئے بھی حضرت والا انکا بہت احترام فرماتے تھے انھیں امام صاحب کے نائب یہ مولوی حکیم عبدالحق صاحب تھے جنکے خطوط اور نقل کئے گئے۔

یہاں جن حضرات کا بھی تذکرہ مستقلاً یا ضمناً ہوا ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات تھے جن کو حضرت والا سے خصوصی تعلق بھی تھا یہاں سب کا بیان مقصود نہیں ہے اسلئے صرف چند پر اکتفا کیا گیا کیونکہ بتلانا صرت یہ ہے کہ حضرت والا کے گورکھپور پہنچ جانے پر وہاں کی بھی دینی کھیتی لہلہا اٹھی اور چمن معرفت میں بہار آگئی اطراف و جوانب کے لوگ بھی خوب خوب رجوع ہوئے اور دوسرے مقامات کے حضرات کے لئے بھی حضرت تک رسائی آسان ہو گئی۔ لکھنؤ سے سیدھی ریلوے لائن آنے کی وجہ سے گونڈہ۔ بہرائچ۔ سیتا پور اور خود لکھنؤ سے بھی لوگ زیارت و ملاقات کے لئے آنے لگے۔ ایک دفعہ مولوی محمد منظور صاحب نعمانی تشریف لائے۔ ایک دفعہ مولوی محفوظ الرحمن صاحب نامی بہرائچ سے تشریف لائے۔ ایک دفعہ صدیق حسن صاحب جو غالباً لکھنؤ میں پبلک و س کمیشن کے ممتاز لوگوں میں سے تھے وہ بھی آئے۔ صدیق حسن صاحب نے واپس جا کر لکھنؤ سے مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کو اپنے اس سفر کے تاثر کا خط لکھا اس میں یہ بھی لکھا کہ : —

مجھے سب سے زیادہ خصوصی اور نمایاں چیز جو حضرت کے یہاں نظر آئی وہ یہ تھی کہ میں نے وہاں سب ہی حضرات کے چہروں پر ایک سکون اور طینان دیکھا جو کہ آج کی دنیا میں ہر جگہ مفقود ہے۔

یہ الفاظ راقم کے ہیں مگر مفہوم ان کے کہنے کا یہی تھا۔ حضرت والا نے انکی یہ بات مجلس میں سنائی اور فرمایا کہ انھوں نے جس سکون و طمانینت کو لکھا ہے جانتے ہیں وہ کیا چیز ہے؟ وہ ہے اللہ تعالیٰ سے تعلق کا اثر جو خدا کی جانب سے مومن کو اس دنیا میں عطا ہوتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے پھر جب قلب میں سکون آگیا تو دیگر جوارح تو قلب کے تابع ہی ہوتے ہیں اِذَا صَلَّحْتَ صَلَّحَ الْجَدِ كُلُّہُ جب قلب درست ہو جاتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے۔

پس یہاں جو آپ لوگ تھوڑا بہت ذکر وغیرہ کر لیتے ہیں یہ اسی کا اثر ہے جسکو یہ صاحب لکھ رہے ہیں یہ سنا کر فرمایا کہ اس قسم کی بات صرف انھوں نے لکھی ہے یوں آنے کو یہاں بہت لوگ آتے ہیں مگر ایسی بات کسی نے نہیں کہی بات یہ ہے کہ عاقل شخص میں کم از کم دنیا کی تو عقل رکھتے ہی ہیں اسلئے انکی عقل نے رہنمائی کی اور انکو متوجہ کیا کہ آخر کیا بات ہے کہ آج جبکہ دنیا والے پریشان ہیں یہ لوگ کس دنیا کے لوگ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ہشاش بشاش اور گویا دنیوی افکار سے بے فکر نظر آتا ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بالکل بجا اور عین صواب ہے لیکن کیا ہم لوگ اور کیا ہمارا ذکر و شغل، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت والاؒ کے قلب مبارک میں تعلق مع اللہ کی وجہ سے جو طمانینت اور سکینہ عطا فرما رکھی تھی پاس والوں پر بھی اسی کا پڑ پڑتا تھا دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ یہ سکون انکا ذاتی ہے حالانکہ وہ کسی اور کام میں منہ نہ مڑتا تھا۔ دھوپ میں پڑے ہوئے آئینہ کو دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ آئینہ خود چمک رہا ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ فیض حضرت شمس کا ہے ۵

مری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہو قدم یہ اٹھتے نہیں میں اٹھائے جا رہی

مولانا محفوظ الرحمن صاحب نامی سے ناظرین واقف ہی ہوں گے بہرائچ کے مدرسہ نور العلوم سے تعلق تھا کچھ دنوں کے لئے چھوٹی اسمبلی کے پرائیویٹ سکریٹری بھی رہ چکے تھے اسلامی اور قومی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے قرآن کے ترجمہ کی جانب قوم کو متوجہ کیا اس سلسلہ میں ترجمہ قرآن پر آسانی سے واقف ہو جانے کے لئے اور عربی قواعد پر وقوف کے سلسلہ میں کچھ کتابیں بھی تصنیف فرمائی تھیں۔ چنانچہ جس زمانہ میں حضرت اقدسؒ کا قیام وطن ہی میں تھا مولانا نے حضرت والا کو ایک خط بھی لکھا تھا اور اپنے رسائل بھی ارسال فرمائے تھے اس طور پر حضرت والاؒ سے

غائبانہ تعلق مولانا کو پہلے سے تھا وہ خط اور اسکا جواب ہدیہ ناظرین ہے۔

مولانا محفوظ الرحمان صاحب نامی کا مکتوب گرامی حضرت مصلح الامۃ کے نام

گرامی نامہ کے حدود نے عزت بخشی اور جناب کے مبارک کلمات سے بڑی ہمت افزائی ہوئی مجھے یقین ہے کہ اگر ہمیں آپ جیسے بزرگوں کی رہبری حاصل ہو جائے جو کام کی کوتاہیوں پر تنبہ فرمائیں اور کام کو صحیح معنی میں مفید بنانے کیلئے مشورے عنایت فرمائیں تو بڑے سے بڑا کام ہو سکتا ہے۔ جو نصاب تعلیم اس ناچیز نے تیار کیا ہے اس کا مکمل سٹ خدمت مبارک میں روانہ کر رہا ہے انہیں غنیمت کو تاہم کیا اور فروگزاشتیں ہوں انکا اس ناچیز کو اعتراف ہے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم پر سراپا شکریہ ہے کہ اس نصاب کے ذریعہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں ہزاروں مسلمان بچے بچیاں، مرد و عورتیں عربی زبان اور ترجمہ قرآن سے مناسبت پیدا کر رہے ہیں اگر ہر ضلع کے لوگ پوری قوت سے اسکی طرف متوجہ ہو جائیں تو انشاء اللہ چند ہی سال میں اردو ہی کو نہیں بلکہ عربی زبان کو مسلمانوں میں فروغ ہو جائے گا اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وحی الہی اور تعلیمات نبوی سے استفادہ آسان ہو جائے گا۔ بہر حال دعا رہے اور سرپرستی کا طالب ہوں۔ والسلام

احقر محفوظ الرحمان نامی - ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ

حضرت مصلح الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کا جواب با صواب

کارڈ پونچا اور اس کے قبل چھ کتابوں کا مکمل سیٹ۔ کتابیں ماثرا اللہ اپنی افادیت۔ کتابت۔ طباعت اور نفاست میں میرے نزدیک بہت عمدہ اور مرغوب و مطلوب معلوم ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ انکو مفید اور نافع بنائیں۔ اشتہار سے آپ کے عزائم بھی معلوم ہوئے آپ کی حوصلہ مندی سے جی بہت خوش ہوا دل سے

دعا کرتا ہوں کہ آپ کا حقیقی مقصد (یعنی قرآن سے مسلمانوں میں مناسبت پیدا کرنا) حاصل ہو جائے اور یہ بات حق تعالیٰ کو کچھ دشوار نہیں وہ تو صرف نیتوں کا خلوص، اپنی کوشش سے صرف نظر اور اسکے بعد صبر و استقلال، بس انہیں چیزوں کو دیکھتے ہیں اسکے بعد انہی یہاں نہ اپنوں کے لئے کوئی تنگی ہے نہ دوسروں کے لئے کُلا نِمْدُ هُوَلَاءُ وَ هُوَلَاءُ مِنْ عِطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عِطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (ہم انہی بھی مدد کرتے ہیں اور انہی بھی آپ کے رب کے عطایا کے ساتھ اور آپ کے رب کا عطیہ کسی سے رکا ہوا نہیں ہے) کام کرتے جائیے کام ہوتے اور اسکے نتائج نکلتے دیکھ کر خود ہی سب کے دل سے دعائیں نکلیں گی۔ میں نے آپ کی کتاب تو فی الحال اپنی لڑکیوں کو پڑھانا تجویز کیا ہے۔ عملی تجربہ کے بعد کوئی بات قابل ذکر سمجھ میں آئیگی تو انشاء اللہ لکھوں گا۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ - یکم ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ

مولانا نامی سے حضرت والا کی یہ مکاتبت بہ زمانہ قیام وطن ہوئی تھی اس غائبانہ تعارف کے بعد گورکھپور کے زمانہ قیام میں مولانا نامی حضرت کے یہاں تشریف لائے اور ملاقات کا بھی موقع ملا اور مجلس میں بھی شرکت کی اور حضرت اقدس سے ملکر بہت محظوظ ہوئے۔

وطن میں پیش آنے والے حالات کی مصلحت اب سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے حضرت کے فیض کو عام کرنا کتنا چنانچہ عسی ان تکرہوا شیئا و هو خیر لکم (یعنی ہو سکتا ہے کہ تم کسی کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو) کی تفسیر سمجھ میں آگئی چنانچہ آپ نے بھی گزشتہ سطور کے خطوط سے اندازہ فرمایا ہوگا کہ اہل گورکھپور نے بھی حضرت والا سے کیسا کیسا فیض اٹھایا اور کس درجہ حضرت کی محبت لوگوں کے قلوب میں پیوست ہو گئی تھی جس کا ظہور حضرت کی جدائی کے بعد ہوا نیز پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وطن ہی میں حضرت اقدس نے اصالۃ اپنے

ہر دو خوش جناب قاری محمد مبین صاحب مدظلہ اور مولوی قمر الزمان کو خود ہی پڑھانا شروع کر دیا تھا چنانچہ اس سلسلہ میں خود حضرت اقدسؒ سے سایہ فرماتے تھے کہ سہارن پور اور دیوبند سے فارغ ہو کر جو مولوی صاحبان میرے پاس آئے تو کبھی کسی موقع پر کتاب سے کوئی مضمون نکلوانے یا کبھی کچھ عبارت پڑھوانے کی ضرورت پیش آئی تو انکو نہایت ہی کم استعداد بلکہ بد استعداد تک پایا اس سے میں نے سمجھا کہ اب ان مدارس میں بھی تعلیم اطمینان بخش نہیں ہو رہی ہے کہیں سیاست کے شمول نے طلبہ کو علم دین سے مٹا دیا کہیں تعداد طلبہ بڑھ جانے کے سبب طلبہ کی نگرانی جیسی ہونی چاہئے ہو نہیں پا رہی ہے اسلئے انکی علمی استعداد کمزور ہوتی جا رہی ہے یہ منظر دیکھ کر میں نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ اپنے ان بچوں کو کہیں باہر تعلیم کے لئے نہیں بھیجوں گا بلکہ خود ہی انکو تعلیم بھی دوں گا اور انکی تربیت بھی کروں گا اور کبھی اسی سلسلہ میں بطور تحریک یہ بھی فرماتے کہ مجھے ان مدارس سے بھی اس قدر علم کے ضیاع کا اندیشہ نہیں تھا ورنہ شاید میں اب سے بہت پہلے اپنے یہاں تعلیم و تعلم کا کچھ سلسلہ جاری کئے ہوتا اور اگر بڑے پیمانہ پر نہ ہی تو دو چار دس کو تو پڑھا ہی دیتا۔ اس خیال کے تحت حضرتؒ نے اپنے دونوں بچوں یعنی دامادوں کو کہیں باہر جانے نہیں دیا بلکہ خود ہی پڑھایا۔ پھر جب اسباق ہونے لگے تو قرب و جوار کے کچھ طلبہ اور بھی آکر شریک ہو گئے۔ حتیٰ کہ فارغ التحصیل جو مولوی صاحبان حضرت سے متعلق ہوتے وہ بھی اپنے زمانہ قیام میں اجازت لیکر درس میں بھی شریک ہو جاتے اور جواہل علم خانقاہ میں مستقلاً مقیم تھے ان کے لئے تو شرکت درس لازم ہی تھی۔ چنانچہ کوپانگج کے حکیم مولوی بشیر الدین صاحب۔ مولوی شہار احمد صاحب۔ مولوی عبدالرؤف صاحب۔ مولوی محمد صاحب۔ مولوی ابوالحسن صاحب۔ گھوسی کے مولوی وقار احمد صاحب۔ مرحوم اور ان کے برادر خور و مولوی عماد احمد سلمہ۔ جون پور کے مولانا عبدالکلیم صاحب مدظلہ اور مولوی محمد حنیف صاحب۔ اسی طرح سے یہ ناکارہ عبدالرحمن جاتی اور اس کے برادر خور مولوی عبدالعلیم عیسیٰ سلمہ۔ نیز مٹو سے آکر مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ

مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ - مولانا محمد امین صاحب مرحوم اور انکے علاوہ اور دوسرے بہت سے حضرات وقتاً فوقتاً شریک درس ہوتے رہے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق سب ہی حضرات نے حضرت والا سے علاوہ مدرسہ کے علم کے مزید علمی اخذ فیض کیا۔ چنانچہ بلا کسی تصنع اور مبالغہ کے عرض کرتا ہوں کہ اس مسجد میں جو کچھ آیا وہ سب حضرت اقدس ہی کے فیض کا صدقہ ہے۔ جس طرح سے کہ علم طب کے طلبہ طبیہ کالج میں طب پڑھتے ہیں لیکن ان کے اس علم کا اجرا کسی حاذق طبیب کے مطب میں شرکت کے بعد ہی ہوتا ہے اسی طرح مذکورہ بالا تمام علماء کی جانب سے کہتا ہوں کہ سب نے مختلف مدرسوں میں پڑھا پڑھا یا ضرور تھا لیکن حضرت اقدس نے ہم سب کو حقیقی علم سے روشناس کرایا۔ اور کسی مسئلہ کی تحقیق اور کسی تحقیق کا ریسرچ علمی کیونکر کیا جاتا ہے یہ حضرت ہی نے سب کو سکھلایا اس میں دورائے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی جانب سے حضرت اقدس کو جزائے خیر عطا فرمائے اور حضرت والا کی آرام گاہ کو نور سے بھر دے۔ ہم نالائقوں کو کسی لائق بنانے کے لئے بلاشبہ حضرت والا نے بڑا تعب اور بہت ہی مشقت اٹھائی۔ حضرت اقدس کا یہ احسان فراموش نہیں کیا جاسکتا اور حضرت والا کے اس احسان سے ہم لوگ تازہ زندگی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اسکا منکر ہو جانا تو بجائے خود رہا اسکو بھلا دینا بھی ظلم عظیم ہی ہے۔ بہر حال تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ حضرت کے وطن سے گورکھپور منتقل ہو جانے کے بعد گورکھپور میں بھی بدستور قائم رہا۔

یہاں ناظرین پر یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ حضرت اقدس کا یہ مدرسہ جو بہت ہی مختصر اور نہایت ہی محدود اور گویا خانقاہ کے زیر سایہ ہی قائم تھا اس کے وجود میں آنے کا اولین سبب حضرت اقدس کی اولاد یعنی حضرت کے داماد ہی بنے جن میں سب سے پہلا نمبر حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب دام مجدہ ہی کا تھا۔ چنانچہ حضرت اقدس کے تعلیمی اور اس سلسلہ کے سب سے پہلے سبق اور سب سے آخری سبق ہر ایک میں محب مکرم جناب قاری محمد مبین صاحب دام مجدہم شریک رہے اور دوسرے حضرات تو

بعد میں آتے گئے اور ٹریک ٹیٹے گئے۔ پس کس قدر ظلم کیا ہے اس سوا کچھ بھگانے والے نے
 حضرت اقدس کے شاگردوں کی گنتی میں حضرت قاری صاحب جیسے اولین و آخرین شاگرد
 کو شمار ہی نہیں کیا۔ رہی یہ بات کہ تفصیل علم کے بعد انکا کسی مدرسہ سے تعلیم و تعلم
 کا تعلق نہیں دیکھا گیا تو یہ تو کوئی وجہ عدم شمار کی ہو نہیں سکتی تھی بہت سے حضرات
 دیوبند سے فارغ ہوئے اور علاوہ تعلیم و تعلم کے دیگر مشاغل میں لگے اور مشہور ہوئے
 آج دیوبند کے فارغین میں انکا نام بھی موجود ہے چنانچہ حضرت قاری محمد حسین صاحب مدظلہ
 کا اگر علمی اور تعلیمی کام کسی پر مخفی بھی رہا ہو تو حضرت نور اللہ مرقدہ کا جانشین ہونا۔ حضرت
 کی خانقاہ کا متولی ہونا اور حضرت کے مدرسہ کا مہتمم ہونا تو کوئی پوشیدہ بات نہ تھی پھر
 جہاں حضرت والا کا ذکر آئے وہاں اس جیسے متعلق کو کیونکر بھلایا جاسکتا ہے۔ اب اگر
 اس عدم ذکر کا منشا علمی اور عدم واقفیت ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اگر
 کوئی غلط جذبہ اسکا باعث بنا ہو تو حضرت اقدس کے متبعین تو اس حق تلفی کو معاف
 نہیں کر سکتے۔ اتنی بڑی غلطی اور ایسی زبردست بھول کا پیش آجانا محض تعجب ہی کی
 بات ہے بقول قائل ۵

فان كنت لا تدري فتلك مصيبة وان كنت تدري فالمصيبة اعظم
 (تم اگر حقیقت حال سے ہی ناواقف تھے تو خیر یہ بھی ایک مصیبت ہی تھی اور اگر واقف
 تھے تب تو وہ مصیبت دو چہرہ ہو گئی)۔ اور میں اس موقع پر حضرت قاری صاحب مدظلہ
 کی جانب سے یہ کہتا ہوں وافوض امری الی اللہ واللہ بصیر بالعباد اپنا
 معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں سے (اور ان کے احوال سے)
 باخبر ہیں۔ خیر گفتگو تو حضرت والا کے تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں آگئی عرض یہ کر رہا تھا کہ گورکھپور
 میں بھی یہ سلسلہ باقی رہا۔

اللہ تعالیٰ نے اس عالم میں چونکہ خیر و شر دونوں کو توأم بنایا ہے چنانچہ جہاں
 پھول ہوتے ہیں وہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں جہاں خزانہ ہوتا ہے وہیں سانپ بھی
 ہوتا ہے۔ جہاں حق ہوتا ہے وہاں باطل بھی ہوتا ہے۔ جہاں کوئی بڑا ولی ہوتا ہے

وہیں بڑا شیطان بھی ہوتا ہے اسلئے یہاں گورکھپور میں بھی اسکا ہونا ناگزیر تھا ابھی وطن میں اسکا نمونہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ دین کا کام کیسے سکون و اطمینان کے ساتھ ہو رہا تھا اور آن کی آن میں معاملہ کیا سے کیا ہو گیا۔ تقریباً اسی نوع کا ایک واقعہ یہاں بھی پیش آیا۔

تفصیل اسکی یہ ہے کہ حبیب حضرت والا کا فیض عام ہوا اور شہر کے ہر گروہ سے لوگ مجلس والا میں آنے لگے اور یہ کوئی سالانہ یا ماہانہ جلسہ نہ تھا بلکہ روزانہ کا ایک معمول تھا تو اسکی اطلاع اہل بدعت میں بھی پہونچی اب آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ان مبتدعین پر کیا گذر گئی ہو گئی؟ پوری جماعت میں اس نور حق کو نبھانے کے سلسلے میں مشورے ہونے لگے اور تدبیر سوچی جانے لگی یہ سمجھتے تھے کہ نہ حضرت والا کی طرح مجلس کیجا سکتی ہے اور نہ ویسا با اثر و عطا کہنا کسی کے بس کی بات ہے نہ حضرت کا مزاج مناظرہ کا تھا کہ اسی کو میدان جنگ بنایا جاتا اس لئے دماغ عاجز تھے کہ پھر انکے ساتھ کس طرح سے مقابلہ کیا جائے؟ بالآخر شیطان نے جو سب اہل امور کا گرد گھٹال ہے ایک تدبیر یہ سمجھائی کہ انکو معاذ اللہ دنیا دار اور اہل پرست پرست شہر کرودہ اپنے سے اس الزام و بہتان کو دفع کرنے کے لئے یہ کو بھی ترک کر دیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ جعفر لاؤ لشکر جمع ہے ان سب کے قیام کے لئے کوئی دوسری جگہ ملے گی نہیں اسلئے یہ کہیں اور جا کر بسیں گے اور ہم لوگ ان سے نجات پا جائیں گے یہ اسکیم بنا کر ان رقیبوں نے مکرمی مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم اور عم محترم جناب مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم کے اقارب میں نظر دوڑائی کہ کون ان میں سے ان کے لئے ”عقارب“ کا کام کر سکتا ہے چنانچہ تلاش کر ہی لیا اور پھر اس کے بعد جب رقیب اور اقارب کا گٹھ جوڑ ہو گیا تو وہی کھیل کھیلا گیا جو اہل باطل بالعموم اہل حق کے مقابلہ میں کھیلا کرتے ہیں یعنی گنام خط اور گنام پوسٹر کا سلسلہ شروع کیا گیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ حضرت کا قیام یہاں گورکھپور میں صرف مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب کے رحم و کرم پر ہے یہی لوگ انکا سہارا ہیں اور انھیں کا

مکان انکا آشیانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب حرکات سے ان دونوں حضرات یعنی مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا یہ دونوں حضرات اور ان کے قریبی اعزہ بالکل بے قصور اور اہل شر اور اہل شہر کی ان اسکیموں سے قطعی ناواقف تھے۔ بہر حال اسی سلسلہ کی ایک تحریر حضرت والا کی نظر سے گزری کھلی ہوئی بات ہے کہ اب ایسے موقع پر حضرت والا جیسے حساس اور غیر متذلل کیلئے اسکے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ اپنا ظاہری تعلق اس گھر اور اس گھرانہ سے منقطع کر لیں تاکہ معاندین اور تمام اہل شہر یہ سمجھ لیں کہ ان حضرات (یعنی گورکھپور کے رؤساء) پر حضرت کے قیام کا دار و مدار نہیں ہے ان سے اور ان کے مکان سے بے تعلق ہو کر بھی حضرت گورکھپور میں قیام فرما سکتے ہیں اس طور پر مخالفین کا خیال کیمر غلط ہو اور وہ لوگ اپنے خیال کی تردید کیوجہ سے نہایت درجہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ پس تبدیل مکان سے حضرت والا کا مقصد ان رقیب و قریب کو انکی اسکیم میں رسوا و ذلیل کرنا تھا نہ کہ معاذ اللہ اپنے ان دونوں محسنوں (مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب) کو رسوا کرنا۔

وہی فہم کا پھیر اور تعبیر کی غلطی یہاں بھی بعض حضرات سے واقع ہو گئی کہ انھوں نے اس واقعہ کو اس طرح سے بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا ان دونوں رؤساء گورکھپور (مولوی نثار اللہ و مولوی امجد اللہ صاحب) ہی سے ناراض ہو گئے اور گویا اس سلسلہ میں جو تکلیف حضرت کو پہنچی اسکا سبب ہی یہی لوگ تھے۔

حاشا وکلا ایسا نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنا بچہ باہر جا کر محلہ کے لڑکوں سے پیٹ کر آتا ہے تو شریف باپ اسی کو دو طمانچہ اور رسید کرتا ہے حالانکہ وہ مظلوم اور بقیصہ ہوتا ہے یہ محض اس کی اصلاح و تربیت کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ مجرمانہ سزا کے طور پر۔ یہی یہاں ہوا یعنی حضرت والا اس واقعہ کے پیش آنے پر اپنے ان ہر دو مخلص خدام پر کھلی خفا ہوئے یہ صحیح ہے لیکن وہ خفگی بطور تنبیہ کے تھی کہ تم لوگ یہاں اتنے دنوں گرتے ہو اپنے اور پرانے سبک مزاج سے واقف ہو تم نے حالات کا جائزہ کیوں نہیں لیا اور کیوں ایسے مغفل رہے۔

بہر حال اس تحریر کو ملاحظہ فرمانے کے بعد حضرت والا نے طے تو یہی فرمایا کہ مجھے اب اس گھر میں رہنا نہیں ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اتنے سارے لوگوں کو لیکر کہاں تشریف لیجاتے اسلئے احباب سے صلاح و مشورہ کرنے میں چند دن اور گزر گئے مشورہ میں مولوی نثار اللہ صاحب بھی ہوتے مولوی امجد اللہ صاحب بھی ہوتے ان کے علاوہ ماسٹر واجد علی صاحب، مولوی شکیل صاحب عباسی، مولوی عبدالحنان صاحب مولوی افتخار الحق صاحب مولوی وصی الدین صاحب، اور ذکی اللہ بھائی جوان دنوں وہاں موجود تھے اور ان کے علاوہ چند مخصوص حضرات سے مشورہ فرمایا۔ یہ بھی طے تھا کہ جلد سے جلد اس جگہ کو چھوڑنا ہے اور یہ بھی ذہن میں تھا کہ ایسی کوئی بھد سی شکل نہ ہونا چاہیے جس سے ان شرفاء گورکھپور کی اپنے عزیزوں یا دوسرے لوگوں میں کچھ رسوائی یا خفت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا چنانچہ حضرت کی خدمت میں آنے جانے والوں میں سے حکیم مولوی وصی احمد صاحب بھی تھے اور ان کے برادر بزرگ حاجی ولی محمد صاحب تو آپ کے مرید ہی تھے ان حضرات کا مکان اسی محلہ میں تھا اور بہت قریب تھا ان سے بھی صورت حال کا ذکر آیا لیکن ایک محتاج، عاجز، بے بس اور غریب الوطن ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مخلص دوست اور ایک مرید سعید ہونے کی حیثیت سے۔ یوں ہونے کو تو گورکھپور میں حضرت کے جاں نثار خدام بہت موجود تھے لیکن حضرت والا نے حکیم صاحب کے مکان کو اپنی منتقلی کے لئے اسلئے بھی تجویز کیا کہ وہ یہیں چند مکانوں کے بعد ہی تھا لوگ نہایت خاموشی کے ساتھ وہاں جاسکتے تھے نہ شہر میں کہیں شور ہوتا نہ تذکرہ اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حکیم صاحب موصوف گواہ اپنے گھر کے کھاتے پیتے آدمی تھے لیکن ظاہر حال یہی تھا کہ ان رؤسا گورکھپور کے مقابلہ میں ایسے ہی تھے جیسے ہاتھی کے مقابلہ میں چوہی (غالب گمان یہی ہے کہ حکیم صاحب کو بھی اسکا اعتراف ہو گا اور وہ اس تمثیل کو ناگوار نہ جانیں گے) تو حضرت اقدس اہل گورکھپور کو یہ بھی دکھلا دینا چاہئے تھے کہ ہم جیسے فقیروں کی نظر میں شاہ و گدا سب یکساں ہیں

تم لوگ جو یہ سمجھ رہے ہو کہ ہماری پیری ان افراد کی ممنون کر رہے ہو اور ہم بھی گویا ایک دنیا دار ہیں تو تمہارا یہ خیال صحیح نہیں دنیا داری کی یہ عینک خود تمہاری آنکھوں پر لگی ہوئی ہے جس سے تم بھی ہمیں ایسا ہی دیکھ رہے ہو، ہمارے قیام کے لئے مولوی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی اور حکیم وصی احمد کی جھونپڑی دونوں برابر ہیں پس تمہارا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔ حضرت اقدس کے ہر قول اور ہر فعل میں کیا کیا حکمتیں ہوتی تھیں اسکو تو حضرت ہی سمجھتے تھے یا پاس رہا ہوا کوئی خادم سبجہ سکتا تھا دوسروں کے لئے انکا سمجھنا واقعی دشوار ہوتا تھا

ذکی اللہ بھائی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں تو اس وقت گورکھپور ہی میں تھا جب حضرت والا حکیم وصی احمد صاحب کے مکان میں منتقل ہوئے ہیں اور اس گفتگو میں واسطہ رہا ہوں جو حضرت نے حکیم وصی احمد صاحب سے فرمائی، حکیم وصی احمد صاحب نے چونکہ ابتداء میں حضرت سے کچھ پڑھا بھی تھا اور بچپن میں جبکہ چھوٹے بچے تھے حضرت کے گھر میں بھی جایا کرتے تھے اس لئے ان سے قدیمی اور بے تکلفی کے تعلقات بھی تھے صاحبزادیاں بھی ان سے واقف تھیں اور انکا مکان مولوی نثار اللہ صاحب کے مکان سے بہت قریب بھی تھا اسلئے حضرت نے مجھے حکیم وصی احمد صاحب کے پاس بھیجا اور یہ فرمایا کہ ان سے جا کر کہو کہ اگر میں تمہارے مکان میں آجاؤں تو کیسا ہے؟ حکیم صاحب نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ حضرت اس سے بڑھکر ہمارے لئے کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ حضرت کے قدم میرے غریب خانہ پر پہنچ جائیں پھر حضرت خود بھی ان کے یہاں کسی وقت تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھے کہاں ٹھہراؤ گے انھوں نے اپنا مکان دکھلاتے ہوئے عرض کیا کہ یہاں اس کمرہ میں حضرت کا قیام رہے گا اور وہ کمرہ ہے اس میں مہمان حضرات ٹھہریں گے اور اندر کا حصہ خالی کر دوں گا اس میں بہنیں آجائیں گی میں اپنے بھائی صاحب کے مکان میں منتقل ہو جاؤں گا۔ حضرت والا نے اندازہ فرمایا کہ یہ جگہ کافی ہو جائیگی تو پھر میرے واسطہ سے حکیم صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ مجھے بلا تو رہے ہو لیکن اگر ان لوگوں نے اپنی مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی

امجد اللہ صاحب نے اس سلسلہ میں کچھ کہا سنا تو ان سے ڈر تو نہ جاؤ گے (یہ بات حضرت اقدس نے حکیم صاحب کے عزم کی پختگی اور بعض حالات کے پیش نظر فرمائی) کیونکہ یہ دونوں حضرات بڑے لوگ تھے حضرت کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دونوں حضرات حکیم صاحب سے کچھ کہیں اور ان پر زور ڈالیں تو کہیں ایسا تو نہیں کہ حکیم صاحب ان سے مرعوب ہو جائیں اور ہم لوگوں کو ٹھہرا لینے پر افسوس کریں اسلئے حضرت نے انکی پختگی معلوم کرنے کیلئے یہ سوال فرمایا۔ اس پر حکیم صاحب نے اپنی پختگی ظاہر کی اور کہا کہ حضرت کی خوشی کے مقابلہ میں کسی کی بھی پروا نہ کروں گا اور ادھر کی دنیا چاہئے اور ہر ہو جائے اس سے ہٹنے والا نہیں۔ حضرت والا نے فرمایا بس میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا اسکے بعد حضرت ایک دن شام کو خاموشی سے منتقل ہو گئے۔ یہ صورت ہوئی یہاں منتقلی کی اور خدا تعالیٰ کی جانب سے یہ شرف مقدر تھا حکیم صاحب موصوف کے لئے انکو ملا ورنہ حضرت کچھ بے بسی اور لا چاری کے طور پر یہاں نہیں تشریف لائے اگر کسی کا ایسا خیال ہے تو غلط ہے۔ باقی اس میں شک نہیں کہ مولوی نثار اللہ و مولوی امجد اللہ صاحب کی طرح حکیم دہی احمد صاحب کا بھی ہم سب خدام پر یہ احسان ہے کہ انھوں نے حضرت والا کے علاوہ ہم سب کیلئے بھی اپنے یہاں قیام کی جگہ نکالی خود تکلیف اٹھائی اور مہمانوں کو آرام سے رکھا لیکن حضرت اقدس کے متعلق تو یہی سمجھنا چاہیے کہ

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمیں کنی منت شناس ازو کہ بخدمت گزاشتت
شاہ کی کوئی خدمت کر کے اس پر احسان نہ رکھو بلکہ خود اس کے احسان مند رہو کہ اس نے تم سے یہ کام لے لیا۔ اور حضرت والا کے مزاج میں چونکہ تواضع حد درجہ کی تھی اسلئے وہ انہوں سے بھی اسی انداز کی گفتگو کرتے تھے یہ جابیکہ دوسروں کیساتھ۔ حضرت نے متعدد موقعوں پر اپنے کسی خادم سے فرمایا کہ میں یہاں تمھاری ہی وجہ سے آیا ہوں اب کام کرنا ہو گا ظاہر ہے کہ فی الواقع وہی صاحب سبب سفر نہ ہوتے لیکن محبت اور شفقت کا اظہار کبھی کسی سے یوں بھی فرماتے تو یہ اسکے لئے سبب انکسار و

ممنونیت ہوتا چاہیے نہ کہ سبب فخر و مہارت لیکن دنیا میں چونکہ ہر قسم کے لوگ رہتے اس لئے کسی کسی نے اس قسم کے عنوان سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا اور یہ اعلان کر دیا کہ میں حضرت کا مجاز ہوں حضرت نے میرے متعلق فلاں موقع پر ایسا ایسا فرمایا تھا اگرچہ ان صاحب کا یہ اعلان لوگوں کی نظروں میں کچھ زیادہ وقیع ہوا نہیں تاہم انکا نفس تو خوش ہو ہی گیا۔

بہر نوع حکیم وصی احمد صاحب نے بھی حضرت والا کو آرام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ان کے برادر معظم حاجی ولی محمد صاحب تو ہر وقت حضرت والا کے اشارہ چشم کے گویا منظر ہی رہتے تھے ان کے علاوہ حکیم صاحب کے اور دوسرے عزیزان گرامی نے بھی سب کے ساتھ قلبی تعاون کیا — اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو انکی کوششوں اور کادشوں کا صلہ مرحمت فرمائے۔

(حضرت مصلح الامۃ کی علالت اور سفر الہ آباد)

حضرت اقدس کو تحریک زلزلہ کی شکایت تو وطن میں بھی اکثر رہا کرتی تھی ایک بالشت لابی اور ایک ہی بالشت چوڑی مختلف رنگوں کی گور کپھوری تولیوں کو تو کبھی کبھی درجنوں انگنی پر لٹکا ہوا دیکھا ذرا ٹھنڈی ہوا نہر میں لگی یا ناک کے راستہ دماغ میں پہنچی کہ مسلسل چھینکیں آنی شروع ہو جاتیں پھر دو چار نہیں بلکہ دس بیس تک کی نوبت آ جاتی اور ناک سے ریزش شروع ہو جاتی پھر کیا یکے بعد دیگرے چار چھ کپڑے تر ہو جاتے ناک کا کنارہ پھل نہ جائے اس خیال سے کبھی کبھی حضرت والا اپنے بڑے رومال کے ایک گوشہ میں جھکوکا ندھے پر رکھنے کا معمول تھا ملل کا چھوٹا سا ٹکڑا باندھ لیتے تھے تاکہ بوقت ریزش اسی سے کام لے لیا جائے اور بڑا رومال ملوث نہ ہو ایک ٹکڑا آگندہ ہو جاتا تو اسکو بد لکھ دو سرا باندھ دیا جاتا اسی کو دیکھ کر غالباً کسی نے گور کپھور سے چھوٹی چھوٹی تولیہ درجنوں بھیج دی تھیں۔ اس زلزلہ کا سبب کیا تھا؟ عام طور سے اطباء وطن ظاہری اور عام زلزلہ کام کے سبب کی جانب جاتے تھے اور اسی کے مطابق دوا تجویز کرتے تھے

راقم نے خود دیکھا کہ واقعی جیسا کہ حکیم صاحبان کا قدح مشہور ہے حضرت والا مسلسل بنفشہ اور اطباء حاضر الوقت کا تجویز کردہ جوشاندہ برابر پیتے رہتے تھے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ اسی زمانہ میں ٹھنڈک کے اثر سے بچانے کے لئے حضرت کے بالکل خلاف مزاج مصلحین نے ٹھنڈا کیا ہوا تازہ پانی بھی روک دیا لکن پانی پلایا چنانچہ حضرت والا نے ہمینوں ٹھنڈا پانی پیا ہی نہیں۔ حضرت اقدس خود فرمایا کرتے تھے کہ میں بھی برابر سوچتا رہتا تھا کہ آخر اس نزلہ کا سبب کیا ہے کیونکہ ٹھنڈک ہی سے ایسا نہ ہوتا تھا بلکہ کبھی گرمی۔ سے بھی تحریک شروع ہو جاتی تھی خود فرماتے تھے کہ دیکھئے ذرا سا رومال کان اور سر سے اتارا تھا تو چھینک آنے لگی پھر گرم رومال سر پر لپیٹ لیا تو بند ہو گئی لیکن ایسا ہمیشہ نہ ہوتا تھا بلکہ ایسا بھی ہوتا کہ رومال گرم چادر سب لپیٹے ہوئے ہیں اور چھینکیں آنی شروع ہو گئیں ناک سے ریش اور آنکھ سے پانی جاری ہو گیا حتیٰ کہ آنکھ بالکل سرخ ہو جاتی اس حالت میں حضرت والا گھبرا کر چادر بھی جسم پر سے ہٹا دیتے اور رومال کو بھی سر پر سے کھول دیتے حتیٰ کہ کبھی کبھی گرم ٹوپی بھی اتار دیتے بس ایسا کرتے ہی چھینک آنی بند ہو جاتی تو فرماتے تھے کہ متفاد قسم کے اباب ہوتے ہیں کبھی سردی سبب بن جاتی ہے تحریک کا اور کبھی گرمی بھی محرک نزلہ بن جاتی ہے اب ایسے مریض کا علاج ہو تو کیونکر ہو۔ چنانچہ وطن میں حکیم بشیر الدین صاحب حکیم نثار احمد صاحب اور ان کے والد جناب حکیم محمد شفیع صاحب، حکیم رمضان صاحب حکیم حفیظ اللہ صاحب حکیم بدیع الزماں عطائی طبیب سو کے حکیم حبیب اللہ صاحب اور حکیم سعد اللہ صاحب اور باہر کے آنیوالے حضرات میں سے ڈاکٹر محمد غفران صاحب حکیم ظہیر الدین صاحب وغیرہ کس کس کا علاج حضرت نے نہیں کیا لیکن اس مرض سے کلی افادہ نہیں ہونا تھا نہ ہوا بالآخر الہ آباد کے لوگوں کی جب آمد و رفت شروع ہوئی تو کسی نے یہاں کے حاذق طبیب جناب حکیم مولانا شاہ فخر الدین صاحب جعفری کا تذکرہ کیا حضرت والا نے بطور تجربہ کے الہ آباد تشریف لانا اور ان سے علاج کرانا منظور فرمایا چنانچہ پہلا سفر الہ آباد کا حضرت والا نے اپنے وقت میں بسلسلہ علاج یہی فرمایا۔ یوں فرما

تھے کہ جب یہاں حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب انپکڑاٹ اسکول کی جگہ پر تھے تو وقت میں آباد ایک بار اور آچکا ہوں مگر وہ دوسرا دور تھا۔ غرض آباد تشریف لائے اور حاجی عبدالوہید صاحب کے مدرسہ قرآنیہ حسن منزل میں قیام فرمایا جسکی مفصل روداد تو حالات آباد میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ مختصر یہ کہ حکیم فخر صاحب کو نبض دکھلائی حکیم صاحب موصوف نے اس زمانہ کے لحاظ سے غالباً سور و پیہ کا ایک نسخہ تجویز فرمادیا جو حجریات پر مشتمل تھا اور مشک وزعفران وغیرہ کا بھی جزو اس میں شامل تھا دوا مختصر سی تھی لیکن نہایت خوشگوار لطیف خوشبودار اور مزیدار ہوتی تھی۔ چچہ میں لیکر اسکی پہلی خوراک جب حضرت کو کھلائی گئی اسی وقت حضرت اقدس نے فرمایا کہ بن طور پر محسوس کر رہا ہوں کہ اس دوا سے نفع ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ زبان پر رکھتے ہی جیسے دماغ کی گرہ سی کھل گئی۔ اسکے بعد غالباً حکیم بشیر الدین صاحب سے فرمایا کہ مولوی بشیر کو تو کھدوں میکر فرمایا کہ نہیں واقعی اگر تم برا نہ مانو تو تمکو طب کا ایک علم دیدوں وہ یہ کہ تم لوگوں کے پاس دیہاتی قسم کے لوگ آتے رہے اور تم انھیں پر اپنی طب کو مشتق کرتے رہے چنانچہ وہی نسخہ تم نے میرے لئے بھی تجویز کیا اور یہ حکیم صاحب بڑے لوگوں کا علاج کرتے ہیں راجہ اور نواب قسم کے لوگ انکو اپنے یہاں بلاتے ہیں انھوں نے میرا اصل مرض ضعف دماغ پکڑ لیا اور دماغ کو قوت پہونچانے والے اجزاء پر مشتمل نسخہ لکھ دیا جو گراں تو ضرور ہے لیکن مرض کے عین مطابق ہے اسلئے اسکے کھاتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے تیر نشانہ پر لگ گیا میں اگر خود ہی گھبرا کر یہاں بھاگ نہ آتا اور اللہ تعالیٰ ان حکیم صاحب سے علاج کرانا میرے قلب میں نہ ڈال دیتے تو تم لوگ تو مجھے جو شانہ پلا پلا کر مار ہی ڈالتے اور میرا کیا مرض تھا اور اسکا کیا علاج ہونا چاہیے یہ تمھاری سمجھ ہی میں نہ آتا تم تو جو شانہ پلاتے اور جب تحریک میں اضافہ دیکھتے تو کہتے کہ دن میں ایک دفعہ اور اسکا استعمال بڑھا دیا جائے پھر اور تحریک بڑھتی تو ایک بار اور بڑھا دیتے تمھاری پرواز فکری وہاں تک نہ جاتی جہاں اس شخص کی پہونچی۔ بڑے آدمی کی بڑی ہی بات ہوتی ہے

اور سنو میرا اصل مرض ضعف دماغ ہی تھا اس میں جس کی زیادتی ہو جانے کے سبب سے ذرا سی گرمی موثر ہو جاتی اور ذرا سی سردی موثر ہو جاتی تھی جو تمھارے جو شانہ سے جانے والا مرض نہیں تھا اسکے لئے تو اسی قسم کے قیمتی اجزاء اور ادویہ کے استعمال کی ضرورت تھی اور یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے یہ ضعف دماغ ہوا کہاں سے ؟ طالب علمی میں نے کی ۔ خانقاہ میں رہ کر ذکر و شغل میں نے کیا ۔ اس وقت تو کچھ نہ ہوا اب گھر آ گیا ہوں اور بظاہر کوئی دماغ اور محنت کا کام بھی نہیں ہے پھر یہ ضعف دماغ کیسا ؟ کہو تو اسکی وجہ بھی بتا دوں ؟ حکیم بشیر الدین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت فرمادیں ۔ فرمایا یہی جو آپ لوگوں پر خفا ہوتا ہوں اور آپ لوگوں کے کام پر نہ لگنے کی وجہ سے مجھے ایک ضیق سی جو ہوتی ہے ۔ لوگوں کی بد اخلاقیوں سے نالاں رہتا ہوں اسی غم نے بڑھتے بڑھتے بالآخر ضعف دماغ کی صورت اختیار کر لی ۔ بس یہی وجہ ہے اسکے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہے ۔ لہذا مجھے صحیح اور صحت مند دیکھنا چاہتے ہو تو لوگوں سے کہو کہ اپنی بد اخلاقیوں چھوڑیں ۔ نفقہ ترک کریں ۔ اخلاص سیکھیں اور کام پر لگیں بس میں اچھا ہی ہوں ۔

ترتیب واقعہ اور تاریخ وقوع کی رد سے تو حضرت اقدس کا یہ الہ آباد کا پہلا سفر قیام وطن ہی کے حالات میں بیان ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس وقت ذہن سے بالکل نکل گیا اب ذکر علالت گورکھپور کے موقع پر وطن کی علالت یاد آئی اور اسی کی وجہ سے الہ آباد کا سفر یاد آ گیا ۔ لیکن خیر اس وقت یہاں اسکا ذکر آ جانے سے یہ بات صاف ہو گئی کہ حضرت والا نے علاج کے لئے الہ آباد ہی کو کیوں تجویز فرمایا اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ الہ آباد کے لوگوں کا حضرت سے تعلق اور خود حضرت کا الہ آباد سے تعلق ہو چکا تھا وہی قلیل منجر بہ کثیر ہوا ۔ چنانچہ حکیم مولوی فخر الدین صاحب جعفری کی صداقت کا تجربہ ہو جانے پر حضرت والا نے اپنے خویش ثانی مولوی قمر الزماں سلمہ کو بھی علاج کے لئے الہ آباد ہی بھیجا ۔ اور خود حضرت والا کا قیام تو اس پہلی بار الہ آباد میں تھوڑا ہی رہا لیکن اہل الہ آباد کا تال زجا چونکہ مسلسل آنا جانا رہتا تھا اس لئے

مستقل طور پر حکیم صاحب موصوف ہی کے پاس حضرت والا کا حال اور یہاں سے
 فتحپور اتال زجا، ادویہ جاتی رہیں اس واسطے سے باہم سلام و پیام کا بھی سلسلہ قائم
 ہو گیا۔ حضرت والا ہی نے غالباً حاجی عبدالوحید یا حاجی شفیع اللہ صاحب سے فرمایا کہ
 حکیم صاحب اگر یہاں تشریف لاسکیں تو ایک مرتبہ لے آؤ۔ حکیم صاحب موصوف کو بھی
 حضرت والا سے ایک خاص تعلق ہو گیا تھا آنا منظور فرمایا چنانچہ حاجی صاحبان کے
 ہمراہ الہ آباد سے سوتک ریل سے اور وہاں سے کوپانگنچ تک کار سے اور کوپانگنچ سے
 فتحپور تک خام راستہ پانکی سے طے فرمایا اس طرح سے جگہ بجگہ قیام کا موقع ملتا
 اور حضرت والا کے متعلقین نیز حکیم صاحب موصوف کے تلمیذ وغیرہ کے بلجانے کی وجہ
 سے یہ سفر نہایت راحت اور آرام سے گزرا اور حکیم صاحب کے لئے سبب تفریح
 ہی رہا۔ حضرت نے گاؤں والوں کو گاؤں سے باہر استقبال کیلئے بھیجا اور خود بھی
 اپنے مکان سے کچھ آگے بڑھ کر حکیم صاحب کا استقبال کیا اور بوقت ملاقات غایت
 خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا حکیم صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ یہاں قیام شاید ایک ہی دن رہا
 دوسرے دن علی الصباح حضرت کی نبھن دیکھی قارورہ دیکھا اور صحت پر خوشی کا
 اظہار فرمایا۔ ناشتہ اور کھانے پر حضرت اقدسؒ نے حکیم صاحب کے مزاج کی رعایت
 فرماتے ہوئے معقول انتظام فرمایا حکیم صاحب کے ہمراہ ان کے تلمیذ خاص جناب
 مولوی سلیمان صاحب فخری بھی تھے ان سب امور میں ان سے بہت مدد ملی پھر کیا تھا
 دن بھر حکیم صاحب کے پاس بستی اور اطراف کے لوگوں کا تانتا بندھا رہا بہت سے
 لوگوں نے اپنے اپنے مرض کی تشخیص کرائی اور نسخہ تجویز کرایا۔ دوسرے ہی دن غالباً
 حکیم صاحب الہ آباد واپس ہو گئے چنانچہ جس طرح سے آرام و راحت کے ساتھ
 تشریف لائے تھے اسی طرح سے الہ آباد بھی تشریف لے گئے اور اب دل ہی دل
 میں گویا ان ہر دو طبیب جسمانی اور طبیب روحانی میں معاہدہ سا ہو گیا تھا کہ کبھی کبھی ملاقات
 کا یہ سلسلہ باقی رکھا جائیگا کبھی حکیم صاحب پھر جائیں اور کبھی حضرت الہ آباد تشریف
 لے جائیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ آخری ملاقات تھی اسلئے اسکے بعد باہم ملاقات نہ ہو سکی۔

چنانچہ واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حکیم فخر الدین صاحب جعفری نے سفر آخرت فرمایا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔ حضرت والا کو انکی فرقت اور جدائی کا بڑا قلق ہوا فرماتے تھے کہ افسوس اتنے زمانے کے بعد ایک ہی تو طبیب ایسا ملا تھا جسکی تشخیص اور تجویز پر اطمینان کیا جاسکتا تھا اللہ کو ان سے بس اسی قدر استفادہ منظور تھا تاہم حکیم صاحب کے علاج سے ایک کلی نفع حضرت اقدس کو یہ ہوا کہ پھر اور دوسرے اطباء کے لئے علاج کی راہ کھل گئی یعنی پھر اور حضرات نے بھی مقوی دماغ اور مقوی قلب دوائیں حضرت کو استعمال کرائیں۔ چنانچہ مانیکلاں کے حافظ حامد صاحب جو حضرت سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے غالباً حکیم بہار الدین صاحب ٹونکی کا ایک معجون مقوی دماغ جو اس وقت تقریباً ساڑھے تین سو میں تیار ہوتا تھا اہتمام کے ساتھ تیار کر کے خود حضرت کی خدمت میں پیش کیا حضرت نے حکیم بہار الدین صاحب کا نام سن کر کہ وہ بھی ایک حاذق اور مشہور طبیب تھے اسے استعمال فرمایا چنانچہ اپنے لئے اسکو نہایت مفید پایا اسلئے ان حافظ صاحب سے اسکا نسخہ ہی طلب فرمایا اور جب وہ معجون ختم ہو گیا تو خود حکیم بشیر الدین صاحب یا کبھی حکیم نثار احمد صاحب کے زیر اہتمام اسے تیار کر کے بہت دنوں تک استعمال فرماتے رہے (یہ نسخہ حضرت اقدس کی بیاض میں بھی درج ہے) اسی طرح سے جناب حکیم فخر الدین صاحب کے بھی متعدد نسخے درج بیاض میں، اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب کی جدائی کے بعد بھی انکے فیض کو جاری رکھا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ والفضل للمتقدم۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ درحقیقت حکیم صاحب کا یہاں الہ آباد کے لوگوں پر احسان عظیم ہوا کہ اس طبیب جسمانی نے اپنے علاج کے واسطے سے اہل الہ آباد کو ایک طبیب روحانی سے روشناس کرا دیا۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدنیا والآخرہ۔

الغرض الہ آباد کے حکیم صاحب جناب مولانا شاہ حکیم سید فخر الدین صاحب جعفری کے علاج سے حضرت والا کا ایک قدیمی مرض نزلہ کا ازالہ ہی ہو گیا۔ جناب حکیم صاحب موصوف عالم بھی تھے اور شیخ بھی اور سادات میں سے تھے، ایک واسطہ کے بعد انکا سلسلہ ہمارے حضرت حاجی صاحب ہاجر مکی قدس اللہ سرہ سے ملتا تھا یعنی حضرت حاجی صاحب

کے کوئی خلیفہ تھے مولانا بخاری حکیم صاحب موصوف انھیں کے خلیفہ اور مجاز تھے ہمارے ایک دوست بھائی انیس احمد پرفا صوی کہتے تھے کہ حکیم صاحب موصوف پہلے حضرت مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی خلیفہ حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ سے متعلق تھے ان کے وصال کے بعد حضرت بخاری سے بعد میں بیعت فرمائی اور ان کے مجاز ہوئے۔ الہ آباد و دوائر کا مجموعہ ہی ہے یہاں کے بارہ دائرے مشہور ہی تھے چنانچہ آپ کا دائرہ بجد اللہ نہایت معتدل اور حق پرست اور حق پسند دائرہ تھا اسی لئے بہت سے مسائل میں خصوصاً رمضان اور عید کے چاند کے مسئلہ میں حضرت حکیم صاحب موصوف کی بھی تقریباً وہی پوزیشن تھی جو آج ہماری خانقاہ شاہ وحی اللہی کی ہے۔ اسی لئے حضرت والا کو حکیم صاحب سے بہت محبت تھی اور حکیم صاحب کو حضرت اقدس سے بیحد عقیدت تھی۔ رسوم و بدعات کی تاریکی میں نہایت خاموشی اور گنہام مسلک کیساتھ حکیم صاحب الہ آباد میں اپنا کام کر رہے تھے حضرت اقدس کی ملاقات کے بعد ہم اہل الہ آباد کو معلوم ہوا کہ حکیم صاحب تو پورے طور سے ہمارے ہم مسلک ہی نہیں بلکہ ہمارے سلسلہ بھی ہیں اس سے بہت مسرت ہوئی اور حکیم صاحب کے بہت سے لوگوں نے حکیم صاحب کی وفات کے بعد حضرت اقدس سے عقیدت مندانہ تعلق باقی رکھا۔

صحت کے بعد حضرت والا وطن میں بدستور کام کرتے رہے یہاں تک کہ ہجرت کا واقعہ پیش آگیا چنانچہ وطن سے ہجرت فرما کر گورکھپور میں مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کی کوٹھی میں قیام فرمایا تو وہاں بھی صحت ہی رہی اور دینی اصلاح کا کام خوب شباب پر رہا۔ لیکن تاکہ اللہ تعالیٰ ہی کو منظور ہوا کہ خود حضرت ہی کا شباب شبیہ سے بدل جائے تو حضرت والا ایک بار پھر بیمار ہوئے اور ایسے بیمار ہوئے کہ میں نے تو حضرت اقدس کا دینا بیمار ہونا نہ اس سے قبل کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد کبھی ویسے بیمار ہوئے۔ زکام بخار تو عام مرض ہی ہے ابتداءً اسی کا حملہ ہوا پھر بخار کا سلسلہ طویل ہوا اور غالباً کچھ اسہال کی بھی تکلیف رہی، غذا بھی تقریباً بند سی ہو گئی۔ ادھر غذا بند ادھر اسہال اسکی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی اور طبیعت نہ فعال سی رہنے لگی۔ اسباق و مجلس بند ہو گئی

اوقات مجلس میں تو لوگ اسی طرح سے آتے اور کبھی طبیعت بناش ہوتی تو مضامین کر کے ورنہ باہر ہی سے خیریت مزاج دریافت کر کے چلے جاتے۔ ادمیریہ صنعت بڑھتا ہی گیا اور نقاہت تک کی نوبت آپہنچی۔ اسی وقت کے لئے حضرت علامہ محرمی مولانا عبد الوحید صاحب فتنوری کو (جو مدرسہ اسلامیہ فتنور (مہسودہ) کے صدر مدرس اور حضرت کے خادم تھے) بلوایا ان سے فرمایا کہ بچوں کے سبق کا میری علالت کی وجہ سے حرج ہو رہا ہے اسباق کا نظام آپ کے متعلق کرتا ہوں اور انشاء قیام میں کبھی کبھی راقم الحروف کے واسطے سے (کہ میری مولانا موصوف سے سابق بے تکلفی بھی تھی کیونکہ فتنور تال زجا کی حاضری سے قبل میں بھی فتنور (مہسودہ) ہی کے مدرسہ اسلامیہ میں مدرس تھا اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق مدظلہ کے مدرسہ اسلامیہ فتنور سے تعلیمی تعلق منقطع فرمالینے پر والد صاحب مرحوم سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر مولانا عبد الوحید صاحب فتنوری ہی نے مجھے سہارن پور سے یہاں مدرسہ کیلئے بلایا تھا اس لئے مولانا سے راقم کے بھی نیازمندانہ اور خادمانہ تعلقات پہلے سے تھے جسکی بنا پر باہم بے تکلفی تھی چنانچہ میرے واسطے سے) مولانا موصوف کے پاس کہلا بھیجا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ دنوں مستقل طور سے میرے پاس رہیں اس میں یہاں بچوں کا بھی نفع ہوگا کہ انکی تعلیم کے جاری رہنے کی ایک سبیل نکل آئیگی اور انشاء اللہ طویل قیام و صحبت کی وجہ سے آپکو بھی نفع ہوگا۔ رہا معاش کا مسئلہ تو جو خدمت آپکی مدرسہ کر رہا ہے وہ میں کر دیا کروں گا اگر آپ اپنی جگہ وہاں کیسکو تجویز فرما سکتے ہوں تو انتظام کر دیجئے اور یہاں آجائیے۔ لیکن مولوی صاحب موصوف اپنے بعض اعذار واقعہ کی بنا پر فتنور کے قیام کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوئے اس سے قبل وطن میں بھی حضرت نے اسی نوع کا خیال ظاہر فرمایا تھا تو مولوی صاحب موصوف نے اپنی والدہ کی تنہائی اور انکے ضعف کا عذر فرما دیا تھا۔

بیچ عرض کرتا ہوں مولانا موصوف کی اس قسمت پر رشک آتا تھا کہ یہاں طالب ہی مطلوب نظر آتا تھا لیکن کسی وجہ سے بھی سہی اسکا موقع نہ ہو سکے پر افسوس بھی ہوا اور افسوس بھی اس پر کم ہوا کہ مولوی صاحب کچھ ہو جاتے بلکہ اس سے زیادہ اسکا ہوا کہ حضرت اقدسؒ نے جو اہر پارے بکھیرے تھے جسکا کچھ نمونہ آپ کے رسالہ کی اٹھارہ سالہ خدمات

فدات میں ملاحظہ فرمایا ہے ان جواہرات کا شناسا اور قدر داں صبیح معنی میں مولانا موصوفت
 ہی ہو سکتے تھے ان کو جمع بھی فرما سکتے تھے اور تقسیم بھی فرما سکتے تھے، آخر علوم ظاہری میں حضرت
 مولانا علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی "تقریر بخاری شریف" آپ نے لکھی ہی اور وہ ہندو
 پاک ہر دو جگہ طبع ہوئی اور مقبول ہوئی۔ اسی طرح سے اگر حضرت مصلح الامۃ جیسے شیخ کامل
 کو بھی ایسا ہی کوئی شاگرد رشید مل جاتا تو شاید آپ حضرات اب سے زیادہ لطف اندوز
 ہوتے، پس اس افسوس میں ان کے نفع سے زیادہ اپنی خود غرضی شامل تھی۔ بہر حال
 خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا اب تو اسی پر راضی رہنا ہے اور قدر مقدور ہی پر قناعت کرنا ہے
 اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کامل اور جاہل اور ظلم و جہول کے لئے جس سے
 عمل اور مجاہدہ تو کچھ ہونے والا نہ تھا اللہ تعالیٰ نے یہ سبیل نکال دی کہ تو ہماری دعوت
 میں ہمارے جہانوں کو کھانا کھلا اور سن! کھانا یہیں کھا کر جانا دینی حضرت اقدس کے علوم و معارف
 کے ضبط کرنے اور لوگوں کے لئے ان سے مستفید ہونیکا واسطہ بنایا اور انشاء اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں
 راقم کو بھی اسکی وجہ سے سرخرو ہی فرمادیں گے، بہر حال یہ بھی تھا انکا کرم میں تو اس قابل نہ تھا۔

الغرض مولانا موصوفت نے کچھ دنوں کے لئے اسباق جاری کر دیے جہانک
 یاد پڑتا ہے کہ اسکے مستقل شرکار حضرت قاری محمد حسین صاحب مدظلہ - مولوی قمر الزمان
 صاحب مدظلہ، مولانا محمد حنیف صاحب، مولوی محمد یونس صاحب، مولوی منظور الوحید صاحب - مولوی
 انوار الغنی صاحب تھے - اور کبھی مولوی بشیر الدین صاحب یا مولانا عبد الحکیم صاحب وغیرہ
 بھی شریک جاتے تھے۔ یہ تو زمانہ علالت کے اسباق کا حال تھا اور مجلس کا سلسلہ بھی اس طرح
 چلتا رہا کہ زمانہ علالت میں بھی لوگ تو برابر آتے رہے اور کبھی کبھی یہ ہوتا کہ حضرت کی
 طبیعت کچھ شگفتہ ہوتی تو دریافت فرماتے کہ باہر مجلس میں لوگ آتے ہیں؟ عرض کیا جاتا
 جی ہاں لوگ برابر آ رہے ہیں اور خیریت مزاج والا دریافت کر کے چلے جاتے ہیں یہ سنکر
 کبھی تو یہ فرمادیتے کہ ہاں لوگوں سے کہو کہ میری صحت کیلئے دعا کریں - اور کبھی یہ فرماتے کہ
 جا کر لوگوں سے کہو کہ - تمہارا پیر بیمار ہوا اور تم ہی لوگوں کی وجہ سے بیمار ہو جائے
 یہ کیا ہے؟ مطلب یہ ہوتا تھا کہ میری اس علالت و ضعف و نقاہت کا اصل سبب

آپ ہی لوگ ہیں۔ آپ کی بد حالی کا مسلسل تجربہ کرتے کرتے اور مشاہدہ کرتے کرتے دل و دماغ معطل ہو گیا ہے جبکہ وجہ سے بیمار پڑ گیا ہوں کچھ آپ لوگوں کو بھی اسکی غیرت ہے یا نہیں؟ غرض اسی قسم کی باتیں فرماتے کہ جسکا ایک جملہ ایک مجلس کا کام کر جاتا اور حساس طبیعتوں پر ایک تازیانہ ہی تو لگ جاتا تھا۔

لیکن اسباق کا یہ نظم زیادہ دنوں نہ چل سکا مولوی صاحب موصوف چند مفتے بمشکل قیام کر سکے اور پھر اپنے مدرسہ نیز خانگی ضروریات سے مجبور ہو کر فقیہ (مہوہ) واپس ہو گئے اسکے بعد غالباً کچھ دنوں کے لئے یہ سعادت مولانا عبدالحلیم صاحب مظلہ کے حصہ میں آئی مگر انکا رشتہ بھی ایک دوسرے مدرسے سے جڑا ہوا تھا بالآخر وہ بھی تشریف لے گئے ادھر حضرت اقدس کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی یہاں تک کہ کبھی کبھی دیر دیر تک غشی اور ظاہری غفلت سی طاری رہنے لگی ایسی حالت میں اگر سبق ہوتا بھی تو لوگ اسکے لئے ذہناً مستعد نہ تھے۔ حضرت والا کے گھر کے لوگ پریشان، مولوی ثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب پریشان، اہل مجلس پریشان، طبیب ڈاکٹر سب حیران کہ کوئی دوا کام نہیں کر رہی ہے یہاں تک کہ ایک شب تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید یہ حضرت کی زندگی کی اب آخری شب ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ بدن میں پانی کا حصہ بالکل خشک اور ختم ہو چکا ہے اسلئے فوراً گلوکوز کے بوتل چڑھانے کی ضرورت ہے اسکے انتظام میں اندر باہر کچھ اس طرح سے بھاگ دوڑ ہوئی کہ عورتوں نے محسوس کیا کہ شاید حضرت والا کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے یا خدا نخواستہ حضرت پر نزع کا عالم طاری ہے کہ قاری صاحب وغیرہ اس قدر پریشان نظر آ رہے ہیں۔ یہ خیال کر کے انھوں نے تو رونا دھونا شروع کر دیا رونا سنکر رونا آتا ہی ہے انکو رونا دیکھ کر مولوی امجد اللہ صاحب کے گھرانے کے لوگ بھی شریک رنج ہو گئے غرض اندر ایک کمرام سا جمع کیا یہاں باہر کے لوگوں کو فرصت ہی نہیں تھی کہ اندر جا کر صحیح حال سے باخبر کریں اور کوئی جا کر کرتا بھی تو کیا کرتا۔ حضرت کے پاس ڈاکٹر گلوکوز چڑھانے کے لئے آیا اور سوئی چبھوئی تو رگ ہی نہ ملی ایک ہاتھ کو چھوڑ دوسرے میں چبھو یا وہاں بھی نہ مل سکی۔ اسی طرح سے دونوں پیروں میں چبھو یا وہاں بھی نہ مل سکی تو اس نے نروں (پریشان

اور ناامید سا، ہو کر اپنے ہاتھ کو اپنی پیشانی پر مار لیا جسکی وجہ سے دیکھنے والا ہر فرد بشر رو دیا لیکن شیخ سامنے بٹھا، بیہوش تھا تو کیا اسکا ادب اسکے سامنے سک سک کے رونے سے بھی مانع تھا۔ سب کے ہاتھ میں رومال اور آنکھ میں آنسو تھے۔ دل حق تعالیٰ کی جانب راجع اور زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ یا اللہ! رحم فرما۔ اے کریم! کرم فرما۔ یا اللہ! ہمارے شیخ کو صحت عطا فر۔ یا اللہ! میں اپنی جلدی روحانی تیم نہ بنا۔ یا اللہ! ہمارے حال پر رحم فرما۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادعونی مستجب حکم اور فمن یجیب المضطرّ اذا دعاه کے فرمانے والے نے لوگوں کی اس وقت کی دعا کو کیسا کچھ سنا ہوگا۔ دعا قبول ہو گئی اور ڈاکٹر کا ہاتھ ایک رگ پر پڑ گیا، اس میں سوئی لگائی ٹیوب سے کنکشن قائم کر کے اسٹینڈ پر بوتل لٹکانی اور رات بھر کے لئے ایک کمپاؤنڈ کو مقرر کر کے وہ تو چلا گیا۔ خدام والا نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ رات بھر چار چار آدمیوں کی جماعت کی جائے کی باری مقرر کی گئی اور صرف چار آدمیوں کی پہلی جماعت کمرہ میں باقی رہی اور بقیہ سب لوگ باہر جا کر دعا و تلاوت وغیرہ میں مشغول ہو گئے۔ اور چار کیا اندر باہر ملا کر تقریباً چالیس آدمی ساری رات جاگتے ہی رہے اور جہاں ایک بوتل ختم ہو گئی تو دوسری بوتل بدل دی گئی پھر دوسری کے بعد تیسری بدلی گئی، اور اب کسی کسی وقت حضرت والا سوتے سوتے درازور کی سانس لے لیتے یا کبھی جس ہاتھ یا پیر میں سوئی لگی تھی اسکو حرکت دینے کی کوشش فرماتے لیکن متعدد خدام متعین تھے کام بگڑنے نہیں دیا یہاں تک کہ فجر کی وقت خود حضرت والا نے بھی آنکھ کھول دی اور یہ سارا منظر ملاحظہ فرما کر پھر آنکھ بند کر کے خاموش لیٹے رہے اس طور پر گویا خود ہی احتیاط کرنے میں شریک ہو گئے

الحمد للہ حاضرین کا اطمینان اور زیادہ ہو گیا۔ فجر کی نماز میں بھی بڑے ہی عاجزانہ طور سے حضرت کی صحت کے لئے اہتمام کیا تھا دعا ہوئی۔ اندر صابن دلیوں کے پاس کھلا دیا گیا کہ الحمد للہ حضرت والا کی طبیعت اچھی ہے۔ ان سب نے بھی جس طرح آنسوؤں سے دعا کی تھی اسی طرح سے آنسوؤں ہی سے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا شکر ادا کیا فرق یہ تھا کہ پہلا آنسو گرم تھا اور یہ ٹھنڈا کہ وہ غم کے آنسو تھے اور یہ مسرت کے قطرات تھے جو آنکھوں سے نکل رہے تھے۔

حضرت مصلح الامۃ کی ایک عظیم الشان کرامت اور استقامت علی الدین کی حیرت انگیز مثال

دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے (غالباً یہ ڈاکٹر لہری تھے جو گورکھپور کے ایک مشہور اور مولوی امجد اللہ صاحب کے فیملی ڈاکٹر تھے) اور انھوں نے رات کی حالت کے برخلاف حضرت والا کو آنکھ کھولے ہوئے اور آہستہ آہستہ بات بھی کر ہوئے دیکھا تو مارے غوشی کے پھولے نہ سمائے اور اسی ترنگ میں آکر یہ جملہ کہا کہ کہیے مولانا صاحب کیسی طبیعت ہے؟ حضرت نے لطیف مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں اور اور ہاتھوں کے اشارہ سے فرمایا کہ الحمد للہ اچھی ہے اس پر بھلے مانس نے یہ کہہ دیا کہ — مولانا صاحب! آپ تو رات چل دیے ہوتے میں نے آپ کو بچالیا — اب چاہے اس نے ازراہ عجب یہ کہا ہو یا اپنی بد عقیدگی کے ماتحت ایسا کہہ دیا ہو یا یہ سمجھ کر کہا ہو کہ یہ اس سے بہت خوش ہوں گے اور شاید مجھے انعام ہی مل جائے۔ بہر حال جیسے ہی اسے منہ سے یہ الفاظ سنے حضرت پر تو جو گزرنی تھی گزر گئی، چہرہ کا رنگ فوراً بدل گیا اس کی جانب سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اسکے بعد ڈاکٹر تو ادھر نسخہ لکھ کر اور دوا کے استعمال کا طریقہ بتلا کر رخصت ہوا اور حضرت والا نے فوراً مولوی امجد اللہ صاحب کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ مولوی امجد اللہ! میں تمہارے اس ڈاکٹر کا علاج اب نہیں کروں گا سن لیا!۔ انھوں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا بس اب جاؤ کوئی اور انتظام علاج کا کرو ہم لوگوں نے ڈاکٹر کی وہ بات بھی سنی تھی اسلئے اس منع فرمانے کا منشاء تو سمجھ میں آ ہی گیا تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ اب کیا کیا جائے؟ اگر ممانعت کے بعد اس کا علاج جاری رکھا جاتا ہے تو علم ہونے پر ہم لوگوں کا حشر کیا ہوگا اور علم کا ہو جانا بعید نہ تھا بوقت استعمال دریافت ہی فرمائیے کہ کیسی دوا ہے؟ پھر کیا جواب ہوتا اگر کذب بیانی کی جاتی تو شیخ کے ساتھ معاملہ اور شیخ کی تعلیم نے اس کی اجازت نہیں دی، پھر دوسرے کسی طبیب

کا علاج ہو تو کس کا ہو بہر حال یہ وہ دشواریاں تھیں جو منطقی علاج کو اس وقت پیش آ رہی تھیں اور اسی نسخہ کو دوسرے ڈاکٹر کے ہاتھ سے کھو کر دوا لا کر پلانے میں علاوہ کذب کے خداع کی صورت بھی تھی اسلئے حضرت کے معاملہ میں کسی کی ہمت نہ پڑی۔ اگر کسی نے ان میں سے کسی بات کا مشورہ بھی دیا تو اور لوگ تیار نہ ہوئے۔ بہر حال اس مدعی ڈاکٹر کا علاج تو ترک ہی کر دیا گیا اور پھر کسی دوسرے کا علاج کیا گیا اور شاید التباس سے بچنے کے لئے حضرت والا نے نوعیت علاج ہی بدل دی یعنی بجائے ایلوپیتھک کے یونانی یا ہومیو پیتھک علاج ہونے لگا اور اللہ تعالیٰ نے شفا دی اور واذ امرضت فہو یشفین کا عقیدہ عین الیقین بن کر ہم سکے سامنے آ گیا کہ بیمار کرنا اور شفا دینا شافی مطلق ہی کے ہاتھ میں ہے دوا علاج تو واسطہ محض ہیں۔ حضرت اقدسؒ نے طے فرمالیا تھا کہ ایسے مدعی مشرک کا علاج کرنے سے مر جانا بہتر ہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا صلہ بصورت صحت عطا فرمایا۔ سچ ہے ۵

تو چنیں خواہی خدا خواہ چنیں می دہ یزداں مرا دستقیں
 (راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس نے اس موقع پر جس توکل اور تفویض اخلاص اور اپنی دینی غیرت کا ثبوت دیا وہ تو حضرت ہی کا حصہ تھا اللہ تعالیٰ حضرت کی برکت سے ہم خدام کے قلب کو بھی اپنی محبت سے بھر دے اور ہر کو صدق توکل کی دولت سے نوازے اور دینی و ایمانی غیرت سے ہمارے قلوب کو بھر دے بلاشبہ کسی بزرگ کے کمالات باطنی کے ظہور کے یہی مواقع ہوتے ہیں اور کسی اللہ والے کے دینی استقامت کے یہی نمونہ ہوا کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ جسے مشہور فرماتے ہیں اور جسکو اپنا مقرب خاص بناتے ہیں وہ یونہی نہیں بناتے بلکہ اسکی جانب سے بھی کوئی معاملہ دیکھتے ہیں تب اسے مقبول فرماتے ہیں)

حضرت والا نے ہر طرح قولاً فعلاً اور حالاً اپنے لوگوں کو نفاق سے بچا کر اخلاص تک پہنچانا چاہا اور رسم سے نکال کر حقیقت تک لیجانا چاہا۔ شہرت سے نکال کر کام پر لگانا چاہا لیکن جنہیں سیکھنا تھا انھوں نے سیکھا اور جنہیں نہ سیکھنا تھا نہ سیکھا۔

حضرت خود فرماتے تھے کہ صرف کسی کا مرید ہو جانا کافی نہیں ہوتا اور محض "پدرم سلطان بود" کا زبانی نعرہ معتبر نہیں ہے۔ آدمی کو کام کرنا چاہیے نہ تو کالمی سے کام لے اور نہ تمام کے پیچھے پڑے۔

اس سلسلہ کے چند واقعات خود میرے علم میں بھی ہیں ایک صاحب جو حضرت کے مخصوص احباب میں سے تھے جب وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تو دو چار حضرات کے ساتھ آتے اور اپنے وطن میں ان سب کو دین اور طریقی کی باتیں بتاتے اور رکھاتے تھے ایک مرتبہ ایسی ہی ایک جماعت کے ہمراہ وہ صاحب آئے۔ چند یوم قیام کیا اور واپسی سے ایک دو دن قبل سب لوگوں نے حضرت اقدسؒ کو اپنے اپنے حالات کا خط لکھا اور دعا، وغیرہ کی درخواست کی ان میں سے ایک صاحب نے حضرت اقدسؒ کو یہ لکھا کہ "اپنے وطن میں بھی حضرت کی مجلس میں بیٹھتا ہوں اور حضرت نے فلاں فلاں چیزیں پڑھنے کے لئے بتلائی ہیں۔ جب دو چار دفعہ انھوں نے حضرت حضرت لکھا تو تو ہمارے حضرت نے ایک جگہ خط کھینچ کر سوال فرمایا کہ "یہ حضرت کون؟" خطوط کی واپسی پر ان صاحب نے خود بھی جواب کے اس سوال کو پڑھا اور جن بزرگ کے ہمراہ آیا کرتے انکو بھی دکھلایا۔ خود وہ کاتب صاحب تو کچھ سمجھے نہیں لیکن یہ صاحب سمجھ گئے اور گھبرا گئے۔ اور انکی گھبراہٹ بھی بجا تھی کیونکہ اس تحریر سے حضرت اقدسؒ نے دراصل انھیں صاحب کو تنبیہ فرمانا چاہا تھا کہ اتنے دنوں سے آتے جاتے ہو اور ابھی تک یہاں کا مزاج نہیں بنا اپنے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو اتنا بھی نہیں سمجھا سکے ہو کہ وہ مجھ ہی کو مخاطب کر کے تمہیں حضرت سے تعبیر کرتے ہیں آخر طریقی میں بھی کچھ ادب وغیرہ کی رعایت ہے یا نہیں؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کو خود کو حضرت کہلوانے کا شوق ہے یہ بات وہ سمجھے اور اس مواخذہ کا رخ اپنی جانب سمجھ کر گھبرا گئے۔ یہ تھا حضرت مصلح الائمہ کا قال جس سے طالبین میں اخلاص پیدا فرماتے تھے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ایک صاحب کا یاد آیا ان کے پاس بھی لوگ آتے جاتے تھے حضرت والا کی جانب سے اجازت رہی ہوگی۔ ایک مرتبہ ان آنے جانے والوں

میں سے ایک شخص نے ہمارے حضرت اقدس کو کھاکہ کبھی کبھی تعطیل میں فلاں جگہ چلا جاتا ہوں خانقاہ میں قیام رہتا ہے الحمد للہ بہت نفع ہوتا ہے۔ حضرت مصلح الامۃ نے خط میں لفظ خانقاہ پر خط کھینچ کر حاشیہ میں تحریر فرمایا کہ خانقاہ کیسی ہے اور راقم سے ان بڑے صاحب کے پاس خط لکھو ایا کہ فلاں صاحب کو لکھو کہ — کسی کا پیر زندہ ہو اور وہ اسکی زندگی ہی میں خانقاہ بنوالے یہ کیسا ہے ؟ اس خط کے پہنچنے ہی ان صاحب کے پر تلے کی تو زمین نکل گئی، بہت کچھ عذر معذرت کی اور صفائی دی کہ حضرت میں نے کوئی خانقاہ نہیں بنوائی ہے لیکن حضرت اقدس کو اطمینان نہیں ہوا۔ فرماتے تھے کہ یہ ناممکن ہے کہ لوگ پہلے سے اس جگہ کو خانقاہ نہ کہتے ہوں اور بس اسی ایک شخص نے سب سے پہلی بار مجھے ایسا لکھ دیا ہوا ایسا سمجھ میں نہیں آتا یہ مانا خود انھوں نے اسکی ترغیب نہ دی ہوگی لیکن لوگوں سے سنکر اسکو نا پسند بھی نہ کیا ہوگا بلکہ خوش ہوئے ہوں گے کہ ہم صاحب خانقاہ ہو گئے۔ تم لوگوں سے پوچھتا ہوں بتلاؤ یہ کیسا ہے ؟ کیا یہ پر بننے کا شوق نہیں ہے ؟ حضرت مولانا تھانویؒ کے سامنے تو کوئی ہم لوگوں کو کسی خصوصی القاب سے پکار لیتا تھا تو پانی پانی ہو جاتے تھے۔ یہ بھی اس زمانہ کا مرض ہے کہ پیر ہونے سے پہلے لوگ پیر بن جانا چاہتے ہیں۔ بس اب یہی حال ہو گیا ہے۔

اسی کو میں نے عرض کیا کہ سبحان اللہ حضرت اقدسؒ کا کیا کہنا روز و شب اسی دھن میں گزرتے کہ لوگوں میں کس طرح سے اخلاص پیدا کیا جائے اور کیونکر انھیں اخلاص کا مطلب سمجھایا جائے۔ غرض کسی اللہ والے کے حالات میں اسکے اسی نوع کے احوال اور اقوال و افعال اور تعلیمات قابل دید اور لائق داد ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اخلاص، توکل اور تفویض کا ایک نمونہ آپ نے علالت کے اس واقعہ میں ملاحظہ فرمایا اللہ تعالیٰ ہمکو بھی اس دولت کا ایک شتمہ عطا فرمادے

جب اس طویل علالت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدسؒ کو شفا عطا فرمائی تو اس کے بعد کبھی کچھ مدت تک حضرت والا مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے مکان

ہی پر قیام فرما رہے اور اسکے بعد وہ ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا جس کی وجہ سے حضرت والا حکیم دسی احمد صاحب کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلہ میں راقم یہ عرض کر چکا ہے کہ مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب نے حضرت والا کے اصل میزبان تھے وہ اس واقعہ میں بالکل بے قصور تھے لیکن تھوڑی سی غفلت ہو جانے کی وجہ سے مورد عتاب بھی تھے۔ جب حضرت والا حکیم صاحب کے یہاں تشریف لے گئے اور سب طلبہ اور طالبین بھی یہاں سے روانہ ہو گئے اور اب مدرسہ وفانقاہ ہر دو حکیم صاحب موصوف کے مکان پر قائم ہو گیا تو ان مولوی صاحبان کو بھی اپنا مکان کاٹنے لگا۔ جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی کہ ایک طرف اگر قال اللہ و قال الرسول کی آواز سنائی پڑتی تھی تو دوسری جانب اللہ ہو اللہ ہو کی صدا سے ہاں گونجتا رہتا تھا وہاں اب ہو کا عالم ہو گیا تھا اسلئے یہ دونوں حضرات بھی اپنا اپنا بستر لیکر حکیم صاحب کے مکان پر پہنچ گئے کہ جب شیخ ہی نے ناراض ہو کر ایک جگہ کو چھوڑ دیا ہے تو پھر اب ہم وہاں کیسے رہ سکتے ہیں لیکن جب حضرت والا کو اسکی اطلاع ہوئی تو مولوی نثار اللہ صاحب کو بلوایا کہ میں تو آپ کے یہاں سے چلا آیا جو ان حالات میں میرے لئے ضروری تھا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ شہر میں آپ لوگوں کی رسوائی اور بدنامی ہو آپ لوگ یہاں کیوں چلے آئے آپ کے گھر کے لوگ پریشان ہوں گے ایسا نہ کیجئے بلکہ آپ لوگ اپنے اپنے مکان جائیے اور وہاں ہی رہیے اس پر مولوی نثار اللہ صاحب ابدیدہ ہو گئے اور تاثر کے ساتھ حضرت سے معافی مانگی کہ حضرت اقدس کے قلب مبارک میں ہم لوگوں کی طرف سے ادنیٰ تکدر بھی ہماری دینی تباہی کے مراد ہے۔ حضرت نے انکی تسلی فرمائی اور ان کے ان جذبات کی قدر فرمائی اسکے بعد وہ حضرات اپنے اپنے گھر واپس ہو گئے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ اس دنیا میں واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں حوادث کا وقوع بھی ناگزیر ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات ایسے مواقع پر کیا ہوتے ہیں اور کون اپنا کیسا کردار پیش کرتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ بڑا صبر آزما واقعہ تھا۔ اس موقع پر ان ہر دو صاحبان نے اپنے انتہائی اخلاص، انقیاد، محبت و تعلق شیخ اور کامل

دینداری کا ثبوت پیش کیا۔ ۱۔ ایسے مواقع پر کسی کو اپنے انتقامی جذبات کی تسلی دینی مقصود ہو یا اسکے رذیلہ حسد کو اپنے ابھار کا ایک اچھا موقع ہاتھ آجائے تو اسکے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے ورنہ انسان اگر اپنے قلب پر ہاتھ رکھ کر اس واقعہ کو سوچے تو اسکی سمجھ میں حقیقت آجائے کہ شہر کے ایک باعزت گھرانے کے لوگ جو ثروت میں شہرت میں جاہ و منصب میں ایک عالی مقام رکھتے ہوں ان کے ساتھ ایسے زبردست معاملہ کا پیش آجانا جو ایک ضعیف القلب کے لئے اسکے ہارٹ تک کے فیل ہو جانے کا سبب بن سکتا ہو اسکو اس خندہ پیشانی سے گوارا کر لینا اور خود ہی کو باوجود بقیہ صورتوں کے مجرم کے خانہ میں رکھ کر شیخ سے معذرت طلب کرنا اس میں شک کہ فنافی الشیخ کا انتہائی ثبوت تھا۔ یوں کہنے کو آپ جو چاہیے کہہ لیجئے اور قائم کرنے کو جو رائے چاہیے قائم کر لیجئے مگر بہ نظر انصاف اگر دیکھئے گا تو اس میں ان دونوں مریدین کو آداب طریق اور تادب شیخ میں اگر فقید المثال نہیں تو قلیل النظیر ہی پائیے گا کیونکہ آج کی دنیا میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر مرید کی منشا کے خلاف شیخ کا کوئی ادنیٰ معاملہ بھی ہوتا ہے تو مرید ہی اس شیخ کو طلاق دیکر اور بزبان حال یہ کہہ کر چل دیتا ہے کہ پائے مرا لنگ نیت ملک خدا تنگ نیت یعنی دنیا میں بہت سے پیر میں آپ نہ سہی کوئی دوسرا سہی۔ اب اہل زمانہ کا یہ انداز ملاحظہ ہوا اور ان دو حضرات کا ایسا نیاز و انقیاد ان دونوں کا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان حضرات نے واقعی اپنے تعلق بالشیخ کا ثبوت دیا تھا یا نہیں؟ پھر جب چند دن کے بعد معاملہ ہلکا ہوا اور ان حضرات سے جو چوک یا غفلت ہو گئی تھی اس پر تنبیہ ہو چکی تو حضرت کو خود یہ خیال ہوا کہ یہ لوگ امیر۔ رئیس۔ شریف زادے ہیں اور گورکھپور میں ممتاز ترین شخصیت کے مالک ہیں ان کی انکے شہر میں رسوائی بھی ٹھیک نہیں تو حضرت والا نے اپنی فراست و حکمت اور خداداد سلیقہ اصلاح سے اسکی تلافی کی صورت تجویز فرمائی کہ ایک دن مجلس میں آنے والے سب لوگوں سے مواخذہ اور اخلاص کا مطالبہ فرمایا (سب ناظرین کو شاید نہ معلوم ہو کہ حضرت والا مجلس فرماتے تھے اور اس میں امور اصلاحی امراض نفسانیہ اور ان کے معالجات ذکر فرماتے تھے اس کے

ساتھ ساتھ یہ بھی کرتے تھے کہ مہینہ در مہینہ (یا کم بیش) کے بعد کبھی کبھی سب لوگوں سے یہ سوال موتا تھا کہ آپ لوگ اتنے دنوں سے آرہے ہیں مجھ سے آپ نے کیا سیکھا آنا جانا اخلاص سے ہے یا محض رسمی؟ ہر شخص الگ الگ ایک ایک کر کے آدے اور مجھے مطمئن کرے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب شیخ ایسا امتحان لے لے تو طالبین کیلئے یہ کس قدر دشوار گزار گھائی ہوتی تھی ہر شخص اپنی جگہ کانپ اٹھتا تھا لیکن حضرت کا حکم ہوتا تھا اسلئے سب لوگ باری باری پیش ہوتے اور حضرت ہر ایک سے اسکے احوال کے مناسب معاملہ فرماتے تھے کسی سے یہ فرماتے کہ آپ کو تو میں جانتا ہوں کام پر لگے ہیں جانیے کام کیجئے۔ کسی سے اسکے عرض معروض کے بعد فرماتے کہ ہاں بھائی کام کرو۔ یونہی بلا فائدہ آنا جانا نہ رکھو۔ کسی کے عرض مدعا پر فرماتے کہ اب آپ یہ فرما رہے ہیں آج تک آپ نے اپنا کچھ حال نکھکر نہیں دیا کبھی کبھی از خود اپنے حالات سے مطلع کیجئے۔ جانیے۔ کسی سے فرماتے سچ کہہ رہے ہونا بات تو نہیں بنا رہے ہو کہ مڑاک مڑاک پیر کے سامنے بول کر نکل جاؤ یہ کیسا ہے؟ کسی سے فرماتے کہ آئیے اور ہم ہی لوگوں سے نفاق برتیئے اچھی بات ہے میں بھی اب تیار ہوں فرمائیے کیا فرماتے ہیں لیکن جو کچھ کیجئے گا سمجھ کر کیجئے گا اور یہ سمجھ لیجئے گا کہ اپنا جو حال جس طرح اب بیان کیجئے گا دیا ہی آپ کے لئے لازم حال ہو جائے گا یعنی اگر جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیجئے گا تو جھوٹ اور نفاق ہی آپ کو یہاں سے مل بھی جائے گا۔ ان تمام ضمیمہ لدنیا تر ضوا۔ (اگر تم ہمارے سامنے اپنا (جھوٹا) بیانا ہونا ظاہر کر دے تو واقعی میں بیمار ہو جاؤ گے) کوئی صاحب حال اور محب تنہائی پا کر رودتیا حضرت والا اسکے صدق حال کی تصدیق فرماتے۔ غرضیکہ اسی طرح سے ہر شخص کا حال فی الجملہ شیخ کے سامنے سے گزر جاتا اور ہر مجمع کا یہ حال ہوتا کہ طریق کے متعلق عہد اندریں رہ می تراش و می خراش کا منظر سامنے آ جاتا تھا۔ یہ اس سوال و جواب کی عکاسی تھی جو حضرت کبھی کبھی اہل مجلس سے فرمایا کرتے تھے۔

چنانچہ اسی طرح سے حکیم صاحب کے یہاں بھی لوگوں سے یہ سوال ہو گیا اور حضرت کا مواخذہ اور عتاب اس امر پر ختم ہوا کہ فرمایا کہ یہ میری مجلس خصوصی مجلس ہے اس میں

ہر شخص شریک نہیں ہو سکتا بلکہ جو مخلص ہو اور حکو ابینی اصلاح منظور ہو جو کچھ کام کرنا چاہے وہی آئے اور غیر طالبین اور غیر مخلص دوسرے اوقات میں مجھ سے ملیں مجلس میں بیٹھیں۔ اسکے بعد فرمایا کہ اب کون شخص طالب ہے اور کون نہیں اسکے لئے مولوی نثار اللہ صاحب کو مقرر کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ ان سے ملیے وہ جس کے متعلق اطمینان دلادیں گے اور سفارش کر دیں گے وہ شخص مجلس میں آ سکتا ہے۔ اس اعلان کے سننے کے بعد ہر شخص کو یہ فکر ہو گئی کہ وہ کس طرح سے مولوی صاحب موصوف کو مطمئن کرے تاکہ مولوی صاحب حضرت والا سے اسکے لئے مجلس میں شرکت کی اجازت دلوادیں۔ اس معاملہ سے ایک طرف تو یہ نفع ہوا کہ تمام آنے جانے والوں کی نظر میں مولوی نثار اللہ صاحب کی ایک عظمت قائم ہو گئی کہ یہ حضرت والا کے ایسے مستند علیہ ہیں اور سابقہ مواخذہ کی وجہ سے کسی بد فہم کو خود انھیں حضرات سے اگر کسی قسم کی سوچنی ہو گئی ہو تو وہ ختم ہو جائے اور دوسری طرف آنے جانے والوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کام کی جگہ ہے یہاں آتے ہیں تو کچھ کام کرنا چاہیے ورنہ کسی وقت بھی ہماری گرفت اور پکڑ ہو سکتی ہے سبحان اللہ یہ بھی حضرت مصلح الامۃ کی اصلاح کہ کیسے کیسے اور کتنے نازک موقعوں پر بھی آپ کا ذہن رسا کیسا طریقہ کار سوچ لیتا تھا کہ جس میں سب ہی کے نفع کا سامان ہوتا اور کسی کو ضرر نہ پہنچتا۔

بہر حال چند ہی دنوں کے بعد حضرت والا ان حضرات سے منشرح ہو گئے اور انکا سارا غم غلط ہو گیا لوگ بھی سب بھول گئے کہ کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا۔ اب حضرت اقدس کی مجلس حکیم صاحب کے ہال میں ہونے لگی۔ چونکہ مولوی نثار اللہ صاحب کے ہال سے بہت چھوٹا کمرہ تھا اس لئے حاضرین سے کچھ کھینچ بھر جاتا بلکہ کچھ بعد میں آنے والوں کو دلان بھی نہیں بیٹھنا پڑتا۔ یہیں حضرت والا کا قیام تھا کہ ایک بار حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ حضرت کی عیادت کے لئے حاضر ہوئے تھے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ طلبہ اور طالبین کے لئے بھی جگہ بن گئی حکیم صاحب نے اور ان کے برادر معظم قبلہ جناب حاجی ولی محمد صاحب نے پاس پڑوس کے دو ایک مکانات بھی خالی کرادیے، حکیم صاحب خود جس گھر

میں رہتے تھے اس میں حضرت والا کے متعلقین قیام پذیر ہوئے۔ حضرت والا کی قیام گاہ کا ایک دروازہ اندر کی جانب بھی کھلتا تھا اسلئے صاحبزادیوں کیلئے بھی ملاقات کرنے اور آنے جانے میں آسانی تھی۔

وطن میں حضرت والا نے مسجد کی توسیع فرمائی تھی لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ حضرت گورکھپور جائیں چنانچہ تشریف لے گئے اسی طرح سے یہاں حکیم وصی صاحب کی مسجد بھی مختصر سی تھی حضرت اقدس کے پہنچنے کے بعد اسکی توسیع بھی وجود میں آئی اور پھر وہ نہایت عمدہ اور شاندار مسجد بن گئی۔

حضرت والا نے اب یہاں کچھ طلبہ اور طالبین کے انتشار قیام کے باعث اور کچھ سابقہ واقعہ سے عبرت فرما کر یہ چاہا کہ جب رہنا ہے تو پھر خود اپنا کوئی مکان ذاتی اور مستقل طور پر یہاں ہو جائے تو بہتر ہے اسکا تذکرہ بھی اجاب سے فرمایا چنانچہ ہم لوگ دیکھتے تھے کہ کبھی مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ کبھی حکیم ابوالکلام صاحب کے ہمراہ اور کبھی حکیم وصی احمد صاحب کی معیت میں رکشے پر کہیں تشریف لیجاتے تھے واپسی پر معلوم ہوتا تھا کہ فلاں محلہ میں ایک مکان فروخت ہونے والا ہے اسی کو دیکھنے تشریف لے گئے تھے اور کبھی یہ معلوم ہوتا کہ فلاں جگہ ایک زمین تھی اسکو ملاحظہ فرماتے تشریف لے گئے تھے ایسا متعدد بار پیش آیا لیکن خدا تعالیٰ کے علم میں تو الہ آباد کو آپکا نقل وطن ہونا مقدر ہو چکا تھا اسلئے خدا کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ نہ تو کوئی مکان ہی پسند آیا نہ کوئی زمین ہی ملے ہوئی۔

گورکھپور کے زمانہ قیام میں جبکی مدت کم و بیش ڈیڑھ سال رہی تقریباً ایک سال مولوی نثار اللہ صاحب کے یہاں اور ۶ ماہ کے قریب حکیم صاحب کے یہاں۔ اس مدت میں حسب ذیل حضرات ہمارے حضرت اقدسؒ سے زیادہ قریب ہوئے یعنی ان حضرات نے وقتاً فوقتاً آمد و رفت رکھی اور ان میں سے بعضوں کو تو حضرتؒ سے خاص تعلق ہوا وہ حضرات یہ ہیں: ————— مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم۔ مولوی امجد اللہ صاحب مرحوم۔ مولوی محمد شکیل صاحب عباسی مرحوم۔ ماسٹر واجد علی صاحب مرحوم۔ مولوی عبدالکھان صاحب۔ مولوی حکیم عبدالحق صاحب۔ مولوی وصی الدین صاحب مرحوم۔ مولانا افتخار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حکیم مولوی دہشی احمد صاحب - حاجی دلی محمد صاحب - حاجی مطیع اللہ صاحب مرحوم
 حاجی محمد عمر صاحب - قاضی عظیم الحق صاحب اور ان کے صاحبزادے قاضی علیم الحق صاحب
 عبدالغفار خاں صاحب - مولوی غیاث الدین صاحب - بھائی لیاقت حسین صاحب اور
 ان کے بھائی صاحبان - حکیم ابوالکلام صاحب - مولوی امجد اللہ صاحب کے صاحبزادگان
 مولوی نثار اللہ صاحب کے بڑے داماد بھائی مسعود علی صاحب، عزیزیم حافظ عبدالعزیز مسعودی
 قاضی دہاب اشرف صاحب - داروغہ آزاد حسین صاحب مرحوم - حافظ نثار اللہ صاحب
 کاری ساتھوی - مولوی جنید صاحب - مولوی ابراہیم صاحب کوریا پاری - بھائی محمد
 معروف صاحب - محمد ادریس صاحب سارڑ - تحصیلدار محمد ضیف صاحب - پروفیسر عبدالحمید
 صاحب - تحصیلدار عاشق احمد صاحب -

مذکورہ بالا حضرات تو مقامی تھے ان کے علاوہ باہر سے بھی لوگ برابر آتے
 رہتے اور جو بہار اور چل پھل اب سے پہلے مولوی نثار اللہ صاحب کی کوکھی کو نصیب
 تھی وہ اب اس غریب کی جھونپڑی کے حصہ میں آگئی، بہر حال کوئی محل ہو یا جھونپڑی
 اہل اللہ کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔ جس طرح سے دین کا کام وہاں سے ہو رہا تھا
 اسی طرح سے معرفت کی نہر اب یہاں سے بہنے لگی اور الحمد للہ اہل گورکھپور اس سے
 سیراب اور فیض یاب ہونے لگے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ لوگ اس نکر میں کبھی رہنے لگے کہ حضرت والا کے لئے
 کوئی مستقل مکان کہیں مل جاتا تو حضرت کا قیام یہیں گورکھپور میں مستقل ہو جاتا اس لئے
 ہر شخص اس کوشش میں رہنے لگا کہ کہیں کوئی مکان مل جائے لیکن خدا کے علم میں تو اور
 ہی کچھ تھا اس لئے فاطر خواہ اور مناسب حال کوئی مکان نہ ملنا تھا نہ ملا۔ چنانچہ چند ہی
 (یعنی ۶، ۷، ۸) ماہ یہاں قیام کے گزرے تھے کہ سفر الہ آباد کے اسباب پیدا ہونے شروع
 ہو گئے یعنی حضرت والا ایک بار پھر سخت بیمار پڑے علاج کس کس کا نہیں ہوا گورکھپور
 کے سب ہی حکیم و ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا لیکن ہوا یہ کہ صر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بالآخر مرض میں اضافہ اور شدت اس امر نے بھی پیدا کر دی کہ حضرت والا کو ہچکیاں آنی شروع ہو گئیں۔ ہر ہر منٹ پر دو چار بار مسلسل ہچکی آنے لگی جس کو دن میں نو لوگوں سے بات وغیرہ کر کے کسی طرح گزاریا گیا مگر رات میں بھی وہ بند نہ ہوئی جسکی وجہ سے حضرت کو نیند آنی مشکل ہو گئی معلوم ہوتا کہ شاید اب نیند آجائیگی کہ اتنے میں دوسری بار ہچکی آکر جگا دیتی۔ اور ہر علاج معالجہ میں مزید اہتمام کیا گیا، بار بار دوا تبدیل کی جانے لگی اور داخلی خارجی جو جو تدابیر سمجھ میں آئیں کی گئیں اور تجربہ میں جو چیز اسکے روکنے کی آچکی تھی ایک ایک کر کے سب کو آزما گیا مگر کوئی نفع نہ ہوا۔ جب وہاں کے سب حکیم ڈاکٹروں کا نمبر ختم ہو گیا اور اگلا دن آیا اور ہچکی پھر بھلی نہ بند ہوئی تو خدام بھی پریشان ہو گئے اور حضرت والا پر تو جو تکلیف مسلسل ہچکی کے سبب سے نیزہ ۴ گھنٹے سے نہ سونے کی وجہ سے گذر رہی تھی وہ حضرت ہی جانتے تھے۔

خدام کی دوڑ دھوپ کو بے اثر دیکھ کر نیز معالجین کی مایوسی ملاحظہ فرما کر اور ان سب سے زیادہ خود اپنی تکلیف اور ضیق کو محسوس فرما کر حضرت والا نے دوسرے یا تیسرے دن مولوی امجد اللہ سے فرمایا کہ مولوی امجد اللہ کچھ تدبیر کر دے گا یا اسی طرح میرے تڑپنے کا تماشہ دیکھو گے۔ جاؤ مشورہ کرو لوگوں سے کہ کیا ہونا چاہیئے؟ حضرت والا کا اس سے نشانہ یہ تھا کہ قاری مبین صاحب اور دوسرے خاص لوگوں سے مشورہ کر کے مجھے بتاؤ کہ کیا اب ہونا چاہیئے۔ مولوی صاحب موصوف نے چند حضرات کو لیکر مشورہ کیا اور حاضر ہو کر حضرت سے عرض کیا کہ حضرت سب لوگوں کا مشورہ یہ ہے کہ علاج کے لئے کسی اور جگہ چلنا چاہیئے۔ حضرت بھی چاہتے یہی تھے لیکن خود اپنی زبان سے فرمانا نہیں چاہتے تھے اس لئے جیسے ہی انھوں نے یہ کہا حضرت نے فرمایا ہاں ٹھیک رائے تو ہے۔ پھر کہاں چلو گے مولوی صاحب نے فرمایا حضرت اس مسئلہ پر بھی گفتگو ہو چکی ہے وہ یکے بعد دیگرے حضرات کا خیال ہے کہ کھنؤ چلا جائے وہاں متعدد اطباء موجود ہیں اور کچھ لوگ الہ آباد کے متعلق رائے دے رہے ہیں حضرت والا نے فرمایا کہ سب کو بلا لیجئے اور میرے سامنے گفتگو کیجئے اور بتائیے کہ کھنؤ کو کس بنا پر ترجیح ہے اور الہ آباد جانے میں کیا نفع ہے؟

تاکہ میں بھی سنوں اور پھر کوئی فیصلہ کر سکوں۔ سب لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ الہ آباد میں قیام کی سہولت تھی کہ خدام خاص موجود تھے اور کھنؤ میں اطباء کی کثرت تھی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ الہ آباد میں بھی تو آخر طبیب ہوں گے لوگوں نے عرض کیا جی ہاں ہیں، حکیم احمد عثمانی صاحب ایک اچھے اور حاذق طبیبوں میں سے ہیں فرمایا کہ مولوی حکیم فخر صاحب مرحوم گواب نہیں میں مگر ان کے کوئی شاگرد تو آخر ہوں گے ہی، بس اس سے حاضرین نے سمجھا کہ حضرت کا منشاء بھی الہ آباد ہی تشریف لیجانے کا ہو رہا ہے اس لئے کسی نے اسکے خلاف پر کچھ اصرار نہیں کیا اور سب نے الہ آباد ہی تشریف لیچنے کی رائے دی۔

الغرض جب یہ طے ہو گیا کہ علاج یونانی ہو گا اور الہ آباد چلنا ہے تو حضرت والا نے مولوی امجد اللہ صاحب ہی سے فرمایا کہ جاسیے آپ موٹر کا انتظام کیجئے۔ کچھ دیر کے بعد مولوی صاحب نے واپس آکر عرض کیا کہ حضرت ایک نہایت ہی بڑی اور آرام دہ گاڑی کا انتظام ہو گیا ہے وہ کل صبح نو بجے یہاں آجائیگی۔ حضرت والا اس پر بآسانی لیٹ کر سفر فرما سکیں گے حضرت نے فرمایا جزاک اللہ۔ اور فرمایا کہ میرے ہمراہ آپ چلیئے گا اور یہ مولوی حکیم بشیر الدین بھی چلیں گے۔ مولوی جامی کو لے لیجئے گا اور اپنے ملازم مشرف کو بس اتنے ہی آدمی ہمراہ چلیں گے۔ اور الہ آباد کے کوئی صاحب ہوں تو انکو بھیجکر یا ٹیلیفون سے حاجی عبدالوحید اور حاجی شفیع اللہ صاحب کو اطلاع کر دیجئے کہ میں الہ آباد کل موٹر سے آ رہا ہوں وہاں خاص خاص اجاب کو بھی مطلع کر دیں چنانچہ الہ آباد فون کر دیا گیا۔ حاجی عبدالوحید صاحب نے حاجی عبدالحکیم صاحب اور ان کے برادر خور و مولوی عبدالمجید صاحب کو بھی حضرت والا کی تشریف آوری کی اطلاع کر دی۔

اب اہل الہ آباد کی مسرت کا اندازہ کرنا مشکل تھا کہ انھیں حضرت کے تشریف لانے کی خبر سے کس درجہ خوشی تھی۔ مولوی عبدالمجید صاحب وغیرہ کے

پاس اندنوں کا موجود تھی اسلئے ان حضرات نے باہم یہ مشورہ کیا کہ ہم دونوں بھائی اور وہ دونوں حاجی یہ چاروں آدمی گورکھپور سے آنے والی سڑک پر دس بیس میل آگے پہنچ کر حضرت والا کا استقبال کریں گے۔

یہاں گورکھپور کے لوگوں میں اس خبر سے صفت ماتم بچ گئی تھی اور یہ خبر سارے شہر میں گونج اٹھی کہ حضرت والا تو بسلسلہ علاج الہ آباد تشریف لیجا رہے ہیں یہ سکر لوگ جوق در جوق آنا شروع ہوئے حضرت والا نے بھی اپنے اخلاق کریمانہ سے سب کو نوازا یعنی سب سے ملاقات فرمائی اور سب سے اپنے لئے دعا کی درخواست فرمائی اور لڑکیوں اور گھر کے لوگوں کی تسلی فرمائی اور تقریباً اچھے دن کو گورکھپور سے الہ آباد کے لئے روانہ ہو گئے اجاب کا خاصا مجمع موٹر کے پاس کھڑا تھا ادھر موٹر چل پڑی ادھر سب لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کہ دیکھئے اب حضرت تشریف لاتے بھی ہیں یا نہیں؟

موٹر اس قسم کا تھا کہ جس میں وزیر اور وغیرہ بالعموم چلا کرتے ہیں نہایت ہی کشادہ اور آرام دہ سیٹ کہ جس میں حضرت والا باسانی لیٹ سکتے تھے۔ حضرت اقدس کے پانٹی ایک گوشہ میں یہ راقم (جامی ۲) بیٹھا ڈرائیور کے پاس آگے مولوی امجد اللہ صاحب حکیم بشیر الدین صاحب بیٹھے اور پیچھے سامان رکھنے کا جو حصہ ہوتا ہے وہ کھول دیا گیا تو اچھا خاصا ایک مختصر سا حجرہ نکل آیا تین میاں مشرف صاحب مع سامان بٹھلائے گئے گاڑی بچ بٹھکر باوجود اسکی تیز رفتاری کے ہچکولے بھی بہت معمولی لگتے تھے۔ ابھی شہر سے باہر ہوئی ہی تھی کہ حضرت نے کہا مجھے اٹھا کر بٹھا دو باہر کا سبزہ زار اچھا معلوم ہوتا ہے طبیعت کو اسے دیکھ کر فرحت حاصل ہوتی ہے۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ یا تو حضرت پر ایسی نقابت تھی کہ لیٹنا بھی دو بھر کھایا اب ماشاء اللہ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ کر باہر کی سیر فرمانے لگے اور بار بار سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے کہ الحمد للہ خوب فرحت حاصل ہو رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ حکیم صاحب کا کمرہ جس میں حضرت والا کا قیام تھا زرا بند بند سا تھا اور حضرت اقدس ہمیشہ کھلی جگہ اور کھلی ہی فضا کے

رہنے کے عادی تھے طبع والا پر ایسی بند اور تنگ جگہ کا قیام بھی اب تک سبب
 ضیق ہی بنا ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت والا کا معمول تھا کہ صبح و شام کو باہر تفریح کے لئے
 تشریف لے جاتے تھے اور چند دنوں علالت کے سبب باہر جانا ہی نہیں ہو رہا تھا
 اس لئے اندر کمرے میں بند بند طبیعت گھبرا بھی گئی تھی چنانچہ آج سفر کے سلسلہ میں
 کھلی فضا جو ملی تو اسکی وجہ سے بڑا نشاط محسوس ہوا اور کہنا چاہیے کہ گویا آدھا مرض ہی
 جاتا رہا لیکن ہچکی برابر چلی آ رہی تھی اس تفریح اور سفر نے گویا اسکی جانب سے توجہ کم ضرور
 کر دی تھی مگر وہ ختم نہ ہو سکی۔ یہ سفر گورکھپور سے چلکر بڑھل گنج پھر وہاں سے گھاگھرا
 دریا پار کر کے دوہری گھاٹ وہاں سے اعظم گڑھ جو پور۔ پچھلی شہر۔ بادشاہ پور
 پھوپور ہوتے ہوئے الہ آباد آنے کا تھا۔ چنانچہ بڑھل گنج ہی میں ہچکی کی تکلیف
 پھر زرا شدت پکڑ گئی ایسی کہ حضرت والا کو اکبھن ہونے لگی جو کچھ دوائیں ہمراہ تھیں
 استعمال کرائی جا رہی تھیں لیکن ان سے نفع نہیں ہو رہا تھا بالآخر خود حضرت والا ہی نے
 فرمایا کہ شاید تھانہ بھون میں ایک بار کسی کو اسی نوع کی تکلیف ہو گئی تھی تو کسی
 حکیم صاحب نے گرم گرم دودھ پلایا تھا جس سے افادہ ہو گیا تھا فوراً اسکا بھی انتظام
 کیا گیا لیکن اس سے بھی کوئی خاص افادہ نہ ہوا۔ پھر دوہری گھاٹ میں پہنچ کر خود
 حضرت ہی نے فرمایا کسی موقع پر ہچکی کے مرض میں کسی طبیب نے اہلی کے بیج اچیاں
 کو پیکر تالو پر رکھوایا تھا اگر اسکا انتظام ہو سکے تو کرو۔ اب سفر میں چیاں دستیاب ہونے
 سے زیادہ دشوار اسکا کوٹنا اور پینا تھا اس موقع پر اس شعر کی بالکل تصدیق ہو گئی کہ
 در دوسرے واسطے صندل بتاتے ہیں طبیب اسکا گھٹنا اور اگانا در دوسرے بھی تو ہے

بہر حال دوہری گھاٹ کی آبادی بڑی تھی پیاریوں کے یہاں چیاں تلاش کیا گیا تو
 مل گیا پھر کسی مسلمان کا گھر تلاش کیا گیا جہاں اسے کوٹنے پینے کا بھی انتظام ہو گیا
 چنانچہ تیار کر کے حضرت والا کے تالو پر اسکو رکھ دیا گیا مشہور ہی ہے کہ حرکت میں خدا
 برکت رکھی ہے اس اتنی دوا دوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی منٹ کے بعد حضرت والا کی
 تین دن سے مسلسل آنے والی ہچکی بند ہو گئی اور موڑ کی معتدل حرکت اور ٹھنڈی

ہوا کے برابر نکلے رہنے کی وجہ سے حضرت والا کو نیند آگئی چنانچہ اعظم گڑھ گزرا اسکے بعد جون پور گزرا مگر حضرت والا چونکہ کئی شب کے جاگے ہوئے تھے سوتے ہی رہے بالآخر مچھلی شہر کے قریب آنکھ کھلی۔ نماز ظہر کا وقت تو ہو چکا تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں حرکت وغیرہ کی وجہ سے ہچکی کا دورہ دوبارہ نہ پڑ جائے یہی مناسب سمجھا گیا کہ جس قدر زیادہ راستہ طے ہو جائے اچھا ہے حضرت سے بھی عرض کر دیا گیا کہ نماز آگے چل کر پڑھی جائے گی۔ ماشاء اللہ موٹر بھی تیز رفتار تھی بات کی بات میں مچھلی شہر سے بادشاہ پور آیا اور ذرا ہی دیر کے بعد پھولپور گزرا۔ راستہ کے لوگ موٹر کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے تھے دُور سے اسکو آتا ہوا دیکھ کر خیال کرتے تھے کہ شاید کوئی وزیر صاحب کہیں تشریف لے جا رہے ہیں لیکن مسافرین کی ریش دیکھ کر متحیر ہوتے تھے کہ ان لوگوں کو ایسی کاریں سوار ہونے کا حق کیسے ملا یہ کون لوگ ہیں ؟ انھیں کیا خبر تھی کہ اس میں وزیر ہی نہیں سلطنت دین محمدی کا ایک شاہ سفر فرما رہے۔ بہر حال ادھر کا یہ سفر بہت جلد طے ہوا اور تقریباً دو ڈھائی بجے ار آباد سے بارہ پندرہ کیلومیٹر قبل ایک میدان میں جہاں سڑک کے کنارے ایک پختہ کنواں تھا موٹر روکی گئی تاکہ نماز ظہر سے فراغت حاصل کر لی جائے۔ حضرت والا کو موٹر کے اندر ہی ایک سلیچی میں وضو کرادیا گیا۔ حضرت نے تنہا موٹر ہی میں بیٹھے بیٹھے نماز ادا فرمائی اور ہم لوگ استنجے اور وضو سے فارغ ہو کر سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ الہ آباد کا وہ استقبالیہ قافلہ موٹر پر حضرت والا کی آمد آمد کا انتظار کرتے کرتے یہاں تک آ پہونچا۔ ہم لوگوں کو دور سے دیکھ کر پہچان لیا اور سب لوگ اتر کر حضرت والا سے ملے۔ ان آنے والوں میں حسن منزل کے حاجی عبدالوحید صاحب اور حاجی شفیع اللہ صاحب - اور حاجی عبدالجکیم صاحب مالک اسرار کریمی پریس اور ان کے برادران خورد مولوی عبدالمجید صاحب اور عبدالحمید صاحب بھی تھے۔ مولوی عبدالمجید صاحب سے تو آپ حضرات رسالہ کے واسطے سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ان لوگوں سے ملکر حضرت والا کو بھی بہت ہی

مسرت ہوئی۔ ان میں سے پہلے کے دو حضرات ہی دراصل اس وقت حضرت والا کے میزبان تھے۔

نماز سے فراغت کے بعد پھر بقیہ سفر شروع ہوا ان حضرات نے حضرت والا سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو ہم لوگ آگے چلے جائیں اور وہاں کا انتظام کریں لوگوں کو اطمینان بھی دلا دیں کہ حضرت تشریف لارہے ہیں۔ حسن منزل میں بہت سے لوگ دیر سے جمع ہیں۔ وہ لوگ تو اجازت لیکر آگے چل دیے اور اب تنگ راستہ کی رہبری مولوی امجد اللہ صاحب کر رہے تھے نیز یہ کہ ہر موٹر اور چوراہوں پر بورڈ بھی لگے ہوتے ہیں اس سے ڈرائیور خود بھی سمجھ لیتا ہے کہ الہ آباد جانے کے لئے کس طرف چلنا ہے لیکن اب یہاں سے کچھ ہی دور چل کر گنگا کا پل (بھا بھامو) پار کر کے شہر آ رہا تھا اسلئے یہاں سے حسن منزل تک پہنچنے کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے اسکی رہبری کے لئے صرقرعہ فال بنام من دیوانہ زوند۔ چنانچہ واقعی اس شہر کی تمام سڑکوں اور گلیوں میں بارہا آنے جانے کے باوجود تیز رفتار موٹر پر راستہ طے کرتے وقت میں سیج میں بالکل بھوچکا ہی ہو رہا تھا۔ میر بھا بھامو سے کڑھ آیا وہاں سے ٹرافک کی کثرت کی زحمت سے بچنے کے لئے میں نے بجائے چوک آنے کے بڑی سڑک سے آئند بھون کی طرف سے عید گاہ ہوتے ہوئے مسٹھی گنج کی جانب سے شہر کے جنوبی جانب کی بڑی سڑک پکڑ لی اور گول پارک ہوتے ہوئے اسلامیہ کالج کے پاس پہنچا یہیں سے داہنی جانب حسن منزل کو ایک گلی گئی تھی جس میں سے کہ موٹر بدقت ہی گذر سکتی تھی مگر موٹر کی تیز رفتاری اور پیچھے وہ بھی دوسری جانب بیٹھے ہونے کی وجہ سے گلی گذر گئی اور میں ڈائیورس موٹر نے کے لئے کہہ نہ سکا۔ مجھے خود بھی اکبھن تھی مگر دو منٹ میں موٹر بڑھے تعزیرے کے چوارہے پر تھی، تب میں بولا کہ ہم لوگ آگے آگے ہیں موٹر پیچھے لوٹا لیئے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت کو تغیر ہوا اور میری تو گویا جان ہی نکھل گئی واقعی اس قدر دور دراز کے سفر کا تکان پھر ایسی علالت میں بجائے جلدی کے اگر دیر ہو جائے تو کس قدر تکلیف

کی بات ہے بہر حال موٹر بدقت تمام اس بڑک پر موڑا گیا اور حضرت نے خفا ہو کر مولوی امجد اللہ صاحب سے منسوب کیا کہ تم پوچھو جی لوگوں سے کہ حسن منزل کا راستہ کون سا ہے۔ انھوں نے دوکانداروں سے دریافت کیا لوگ پہلے سے موٹر اور موٹر والوں کی جانب متوجہ تھے، میں اسی شہر بلکہ اسی محلہ کا باشندہ ہی تھا لوگ مجھے بھی پہچانتے ہی تھے غضب یہ ہوا کہ مولوی صاحب کے راستہ دریافت کرنے پر ایک صاحب کہتے ہیں کہ وہ کیا موٹر میں حسن منزل والے بیٹھے ہیں، ظالم نے یہ کہہ حضرت والا کی ناراضگی میں مزید اضافہ کر دیا جو بالکل بجا بھی تھا کہ **وَاصَلَّهِ اللہُ عَلٰی عَلَمِ کَوْحِ تَعَالٰی** نے موقع عتاب میں ذکر فرمایا ہے عالم سے جہالت کا صدور بلاشبہ شدید جرم ہے۔ بہر حال گلی سے مڑ کر حسن منزل پہنچے یہاں لوگ بچپنی کے ساتھ حضرت والا کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ ہمارے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی کچھ تو طویل راستہ اختیار کرنے کے سبب اور کچھ راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے۔ بہر حال یہ آخری تھوڑی سی تکلیف تو حضرت والا کو ضرور ہو گئی باقی اسکے علاوہ یوں سفر نہایت آرام سے طے ہوا، حضرت اقدس کے نشاط میں بھی اضافہ تھا اور مچکی بھی احمد شہر بند ہی ہو چکی تھی۔

اس دفعہ حضرت اقدس کا قیام حسن منزل ہی میں حاجی شفیع اللہ صاحب (لیبر مرچنٹ) کے مکان پر ہوا اور چند ہی دنوں کے بعد حضرت نے گورکھپور سے سب متعلقین کو بھی بلوایا یہاں کے علاج سے نفع ہوا اور قلیل ہی عرصہ میں حضرت بالکل صحت مند ہو گئے۔ متعلقین کا قیام حاجی شفیع اللہ صاحب کے مکان کے متصل ہی حاجی عبدالوحید صاحب (ڈیری والے) کے مکان کے اوپری حصہ میں ہوا۔ طالبین کے لئے دو ایک کمرے قریب ہی خالی کرا دیئے گئے۔ اور طلبہ کے قیام کا انتظام ذرا فاصلہ پر ایک دوسرے مکان میں کر دیا گیا۔ اس طور پر خانقاہ اور مدرسہ بھی حضرت والا کے ساتھ ہی ساتھ اب الہ آباد ہی منتقل ہو گیا تھا۔

اس بار کے قیام میں چونکہ حضرت والا اپنے سارے ہی متعلقین کے

ہمراہ تشریف لائے تھے اس لئے تمام مصارف کا تعلق خود حضرت والا ہی کا رہا تاہم اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حاجی صاحبان نے حضرت والا کو آرام پہنچانے میں بڑے ایتار سے کام لیا ہر وقت خدمت میں حاضر رہتے اور ہر ضرورت کے پورا کرنے میں ہر ایک دوسرے سے سبقت کرتا۔ من منزل میں چونکہ حضرت والا کے خدام بھی بکثرت تھے اسلئے حضرت اقدس کو یہاں بہت آرام ملا۔ راقم کے والد ماجد مولانا سراج الحق صاحب۔ استاذی حافظ محمد یسین صاحب مدظلہ۔ ڈاکٹر محمد ادریس صاحب۔ برادر عبد اللطیف صاحب اور خود دونوں حاجی صاحبان اور ان کے خاندان والے سب خدمت کے لئے حاضر ہی رہتے۔ علاوہ اسکے مولوی عبد المجید صاحب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب اور دور و نزدیک کے سبھی حضرات برابر حضرت والا کی راحت رسانی کی فکر رکھتے تھے۔

مولوی عبد المجید صاحب شیخ اسرار کریمی پریس کے پاس ان دنوں کا رہتھی روزانہ دو صبح و شام تشریف داتے اور حضرت کو حسب معمول تفریح کے لئے شہر سے باہر کھلی جگہ کسی طرف لے جاتے۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے والد داروغہ نجم الدین احمد صاحب حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت تھے اور حضرت تھانوی کے بعد ان کا ہمارے حضرت سے تعلق تھا انکے ہمراہ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب گورکھپور ہی میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے اسلئے حضرت والا ان سے متعارف تھے اور حضرت والا کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا کہ اپنے ساتھ کسی طبیب کو ضرور رکھتے تھے دطن میں حکیم مولوی بشیر الدین صاحب تھے، گورکھپور میں پہلے حکیم ابوالکلام صاحب اور بعد میں حکیم وصی احمد صاحب رہے الہ آباد میں یہ منصب ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کو حاصل ہوا جو کہ طبیہ کالج الہ آباد سے فارغ ہونے کی وجہ سے یونانی طب سے بھی واقف تھے اور چونکہ طبی علاج ہی حضرت کے مزاج کے موافق پڑتا تھا اس لئے حضرت کو وہی پسند تھا چنانچہ تفریح میں جاتے وقت مولوی عبد المجید صاحب بھی ہوتے اور ڈاکٹر صلاح الدین رہتے، عبد المجید صاحب کے بھتیجے موٹر چلاتے تھے

جب طبیعت میں مزید قوت آگئی تو مجلس بھی شروع ہو گئی اور اسباق بھی جاری ہو گئے۔ گرمی کے زمانے میں ۱۰۱۹ ہجے کے بعد کم از کم الہ آباد میں تو باہر چلنا پھرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ اکبر الہ آبادی نے یہاں کی گرمی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ پڑ جائیں گے اکبر کے بدن میں ابھی چھلے پڑھ کر جو کوئی پھونکے اپریل مئی جون تو ایسے وقت میں بھلا درس و تدریس بھی کیسے کیجا سکتی ہے اسلئے حضرت یہ کرتے کہ فجر کی نماز کے بعد ہی کبھی دریائے گنگا کی جانب اور کبھی دریائے جمن کی طرف اور کبھی دونوں کے سنگم اور قلعہ اکبری کی جانب میدان میں مکان سے سیر و تفریح کے لئے تشریف لیجاتے۔ چنانچہ قلعہ کے نزدیک جہنا کے کنارے ایک خوشنما پارک بھتا جو جو منٹو پارک کے نام سے موسوم تھا اس میں پھولوں کی روشوں اور سبزہ زار لان کے وسط میں ایک سنگ مرمر کا چبوترہ بنا ہوا تھا حضرت والا موٹر سے اتر کر کچھ اسی باغ میں مٹی فرماتے اور پھر اسی چبوترہ پر آکر بیٹھ جاتے گرمی کی صبح میں سنگ مرمر کا ٹھنڈا چبوترہ بھی ایک پر لطف جائے نشست ہوتا ہے وہیں مولوی عبد المجید صاحب حضرت کو ایک بسکٹ کے ہمراہ ایک فنجان چائے کا ناشتہ کراتے اور طلبہ کو حکم تھا کہ یہ لوگ اسی جگہ پر پہنچ جائیں اور یہیں آکر سبق پڑھیں۔ چنانچہ ہم لوگ بھی نماز فجر کے بعد ہی فتح الباری وغیرہ بغل میں دبائے ہوئے تیز قدم سے وہاں جاتے جب بھی تقریباً آدھ گھنٹہ میں وہاں پہنچتے تھے۔ اسی چبوترہ پر بیٹھ کر مفتوں حدیث کا سبق ہوا جس میں مخدوم محترم قاری محمد مبین صاحب ہوتے۔ مولوی قمر الزماں صاحب سلمہ ہوتے۔ مولانا محمد حنیف صاحب جو پوری رہتے۔ راقم الحروف ہوتا۔ اور یاد پڑتا کہ کوپا گنج کے مولوی منظور الوحید صاحب اور مولوی انوار عنی صاحب بھی شریک درس تھے۔ سبق کے بعد چچی ہوئی آدھی آدھی فنجان چائے کبھی کبھی ہم سب کو بھی ملجائی جو الحمد للہ ہم سب کے لئے اسکا مصداق بنتی کہ وہ

مستی کے لئے بوائے مئے تندہ سے کافی میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے
آہ آج یاد آ رہا ہے کہ اس مشقت میں بھی کیا لطف تھا اور دیکھا جا رہا ہے کہ جو طلبہ

حضرت کے اس درس میں شریک تھے سب ہی نے ایک سے ایک بڑھکر راحت اور عزت کی زندگی پائی اور ہر ایک کو اپنے اپنے حلقہ میں خاص مرتبہ ملا اور بقدر نصیب شہرت حاصل ہوئی فلشدا محمد علی ذلک ۔

تفریح سے واپسی کے بعد مجلس کا وقت ہو جاتا بلکہ حضرت والا کی واپسی سے پہلے ہی سے لوگ آنا شروع ہو جاتے اور حاجی شفیع اللہ صاحب ہی کے مکان کی دوسری منزل کے وسیع صحن میں مجلس ہوتی ۔ یوں تو مجلس میں کافی لوگ شرکت کرتے تھے لیکن الہ آباد کے خاص خاص حضرات حسب ذیل تھے جو برابر ہی شریک ہوتے تھے :-

مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی ۔ قاری حبیب احمد صاحب مظاہر کٹرہ ۔ جناب سید حسین صاحب کمشنر (جب الہ آباد میں موجود ہوتے) ۔ جناب شاکر حسین خاں صاحب مرحوم ۔ جناب حافظ محمد لیٹن صاحب مدظلہ ۔ والدی جناب مولانا سراج الحق صاحب ۔ حاجی شفیع اللہ صاحب ۔ حاجی عبدالوحید صاحب ۔ ڈاکٹر محمد ادریس صاحب ۔ محمد طاہر صاحب مرحوم ۔ مولوی سید محمد ابراہیم صاحب ابن حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ ۔ پروفیسر محمد احمد صاحب مدنی مرحوم پروفیسر طفیل احمد صاحب ۔ محمد احمد صاحب ٹیلر ماسٹر مرحوم ۔ مولانا عبدالقدوس رومی شاہ عبدالباقی صاحب ۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب مدنی ۔ مولوی عبدالمجید صاحب مدیر رسالہ ۔ حاجی عبدالحکیم صاحب مرحوم ۔ حاجی عبدالحمید صاحب برادر مغلطہ مولوی عبدالحمید صاحب ۔ مولانا عجید الرحمن صاحب مرحوم الہ آبادی ۔ پروفیسر غلام ترضی صاحب ۔ فخر الاسلام صاحب وکیل ۔ انعام الحق صاحب ایڈوکیٹ ۔ محمد الیاس صاحب وکیل ۔ محمد قمر صاحب انصاری ۔ نثار احمد صاحب ۔ ڈاکٹر صاحب برہین صاحب حاجی عبدالصمد صاحب ۔ حاجی ستار صاحب ۔ حافظ شمس الحق صاحب ۔ بھائی احمد سعید صاحب ۔ منیر احمد صاحب مدنی ۔ بھائی اشرف علی صاحب ۔ حاجی عبدالاحد صاحب رنگ والے ۔ بھائی عبداللطیف صاحب حسن منزل ۔ حاجی فاروق صاحب

قاری عبداللطیف صاحب مرحوم۔ ڈاکٹر محمد فاروق صاحب۔ حکیم سعید صاحب۔ بھائی
محمد خلیل صاحب اہلہ۔ قاری کبیر صاحب۔ حاجی وکیل احمد صاحب (حضرت کے آخری
مرید)۔ مولوی محمد رفیع صاحب بن حاجی محمد شفیع صاحب۔ ذکی اللہ خاں صاحب۔ داروغہ
نجم الدین صاحب والد ماجد ڈاکٹر صلاح الدین صاحب۔ داروغہ نظامت اللہ صاحب۔
داروغہ مشتاق احمد صاحب اعظمی۔ شاہ عبید اللہ صاحب۔ شاہ عبدالمعبود صاحب۔

اور اطراف الہ آباد سے کبھی کبھی یہ حضرات تشریف لاتے :-

مولانا محمد فاروق صاحب اترائوں۔ حکیم محمد شفیع اللہ صاحب محی الدین پور۔ بھائی
حاجی محمد شفیع صاحب چائل۔ چودھری حبیب الرحمن صاحب بمرولی۔ مولوی مقبول احمد
صاحب اسرولی۔ حکیم حبیب اللہ صاحب اترائوں۔ عبدالقدوس صاحب سندھ۔
بھائی مسرور اللہ صاحب۔ حکیم محمد الشکور صاحب۔ ڈاکٹر نواب صاحب سندھ۔
پھر جب حضرت والا اپنے ذاتی مکان بخشی بازار میں آگئے تو حسب بل حضرات
بھی حضرت والا سے قریب ہوئے :-

بھائی مستود احمد صاحب۔ بھائی شعیب احمد صاحب۔ بھائی عبدالشکور
صاحب جاوید۔ حافظ عبدالمجیب صاحب۔ بھائی عتی الرزاق صاحب۔ بھائی
شریف حسن صاحب۔ بابا منصور صاحب وغیرہ۔

الہ آباد تشریف لانے کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں حضرت والا کی آمد آمد
کا ہر طرف شور ہو گیا اور طالبین کی کافی تعداد مجلس میں ہونے لگی۔ یہاں یہ بات بھی
سمجھ لیجئے کہ حضرت والا نے لکھنؤ یا الہ آباد تشریف لانے کے لئے بوقت مشورہ الہ آباد
کو جو ترجیح دی تھی تو خود اسکی وجہ بھی حضرت ہی نے کسی موقع پر یہ بیان منبر مائی کہ
لکھنؤ میں علما کرام موجود ہیں اور اشار اللہ سب کام پر لگے ہوئے ہیں انکی جانب
عوام کا مرجوعہ بھی ہے اور لوگوں کو دینی نفع بھی ہو رہا ہے ایسی صورت میں میں بھی
اگر وہاں پہنچ جاؤں گا پیر بنکو تو بیٹھوں گا نہیں کچھ بولوں گا ضرور اور لوگ بھی میرے
پاس آویں گے اور میرا کام عام علما کے کام سے ذرا مختلف سا بھی ہے تو میں اسکو

پسند نہیں کرتا کہ کسی جگہ کے سکون کے ساتھ ہوتے ہوئے کام میں میری وجہ سے کوئی رخنہ پڑے اور انتشار پیدا ہو جائے یہ میرے مذاق کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس مذاق کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والاؒ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں مولانا عبدالباقی صاحب ندویؒ کو صاف صاف تحریر فرمادیا کہ ————— ”وہاں یعنی لکھنؤ نیکو جو فرمایا ہے تو وہاں تو آپ حضرات موجود ہی ہیں اور بھی بہت سے اہل کمال حضرات موجود ہیں، کام کر سکتے ہیں ایسی جگہ جانے سے اور وہ بھی کام کرنے سے میرا ذوق ابار کرتا ہے“ — پھر ایسی صورت میں ممکن ہے کسی کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ یہ اقلیم تو پُر تھی یہاں یہ کیوں آگئے یہاں انکی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو لیکن میں مسلمانوں کے باہم اختلاف کے شائبہ سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ میں حضرت تھانویؒ کے بعد تھانہ بھون اور اسکے اطراف میں بھی کہیں سفر کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا کہ بلا ضرورت تھانہ وہاں حضرت (تھانویؒ) کے بہت سے خلفا موجود ہیں اور کام کر رہے لوگ ان سے نفع اٹھائیں میری وہاں کیا ضرورت ہے؟ باقی یہ خیال کرنا کہ اہل حق میں بھلا یہ سب باتیں کہاں ہوتی ہیں، حالات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ میں نے تھانہ بھون میں ریکر دیکھا ہے اور حضرت کے پاس ریکر سیکھا ہے اسلئے اہل زمانہ کے حالات سے کچھ کچھ واقفیت ہو گئی ہے ورنہ میں بھی یہی سمجھتا اور مغالطہ میں پڑا رہتا اور نقصان اٹھاتا۔ تاریخ کے واقعات دیکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ حضرت زکریاؑ ملتان جب شروع شروع ملتان تشریف لائے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ ملتان کے تمام علماء و مشائخ نے متفقہ طور پر باہم مشورہ کر کے حضرت کی خدمت میں دودھ سے لبریز ایک پیالہ بھیجا حضرت زکریاؑ ملتان نے اس پر ایک پھول رکھ دیا اور لانے والے خادم کے ہاتھ ہی اسے واپس فرما دیا اور حاضرین سے فرمایا کہ یہاں کے مشائخ نے سان اشارت میں مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ یہ اقلیم مشائخ سے اسی طرح پُر ہے جیسے یہ پیالہ دودھ سے پُر ہے اسلئے یہاں آپکی گنجائش نہیں ہے کہیں اور تشریف لیجائیے

تو میں نے اس پر پھول رکھ کر جو واپس کر دیا تو اسکا مطلب یہ تھا کہ ابھی اس پیالہ میں
 باوجود بھرے ہونے کے بھی پھول کی گنجائش ہے، بس میں بھی انشاء اللہ تعالیٰ
 آپ حضرات کے درمیان اس اقلیم میں مانند پھول ہی کے رہوں گا یعنی آپ کے لئے
 یارِ شاطر ہی رہوں گا بارِ خاطر نہ بنوں گا۔ حضرت کے اس جواب کو مشائخ نے بہت
 پسند کیا اور حضرت کے قیام فرمانے پر راضی ہو گئے۔

اب نہ تو ہر شخص زکریا ملتانی ہے کہ سب کو مطمئن کر سکے اور نہ اُس زمانہ کے
 علماء و مشائخ سب کے سب علماء سواد و مشائخ زور ہی رہے ہونگے مگر بات یہ ہے کہ
 نفس سب ہی کے اندر ہوتا ہے اور کبھی اختلافِ مزاج اور کبھی کبھی مذاق بھی
 کسی کی تائید سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے میں شبہ کا کام بھی کیوں کروں؟
 رہا الہ آباد تو اول تو یہاں اپنے لوگوں میں سے ایسا کوئی عالم ہی نہیں ہے جس کا کوئی
 نمایاں کام ہو اسلئے یہاں کام کی بھی ضرورت ہے اور بوجہ یکسوئی کے نفع کی بھی
 امید ہے۔

یوں الہ آباد میں مشائخ کے دوائر بہت تھکے چنانچہ بارہ دائروں کا یہ شہر کہلاتا
 تھا لیکن حقیقی اصلاح اور سنت کے مطابق دین کی تعلیم شاید ہی کہیں جاری رہی ہو
 تمام جگہیں رسوم کا گڑھ اور بدعات کا گہوارہ بن کر رہ گئی تھیں الا ماشاء اللہ۔ اسلئے
 حضرت اقدس کو یہ احساس تھا کہ گو یہاں اپنے لوگوں کی جانب سے اختلاف کئے جانیکا
 تو کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا کام بھی چونکہ پیری مریدی کی لائن کا
 ہے (گو الحمد للہ سنت اور شریعت کے مطابق ہے اور اپنے پیش نظر ایک مقصد
 رکھتا ہے یعنی لوگوں کی اصلاح کرنا، رزائل سے انھیں نکالنا اور فضائل کے ساتھ
 انھیں متصف کرنا) اسلئے اہلِ خوائف پر شاید میرا قیام شاق گذرے۔ اس لئے
 محسنِ منزل میں جب مجلس شروع فرمائی تو مسلسل کئی ماہ تک روزانہ کسی نہ کسی موقع
 سے حضرت زکریا ملتانی کا یہی واقعہ ضرور بیان فرماتے اور مقتضائے حال کے مطابق
 ہونے کی وجہ سے اور کچھ حضرت اقدس کا انداز بیان ایسا شیریں ہوتا کہ یہ تکرار طبیعتوں

پر شاق نہ گذرتی بلکہ ہر روز ایک نیا لطف آتا بس یہ معلوم ہوتا کہ سورہ رحمن کی تلاوت

ہے اور قیامتی الآخرة تیکمات تکذبات کی حلاوت ہے۔

یہ سبہ زلزلہ
کھلکے
رہا

باقی ہر کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اسے جس جگہ کام کرنا ہے

پہلے وہاں کی زمین ہموار کرے اور فضا کو سازگار بنائے مخالفین کو دوست بنائے

بغیر اس طریقہ کے کہیں کام کرنا دشوار ہوا کرتا ہے حضرت والا کے اس کام میں یہی تعلیم پوشیدہ تھی بلکہ اہل نظر کے لئے بالکل عیاں تھی اور اس میں شک نہیں کہ

یہی مسنون طریقہ بھی ہے کہ تبلیغ دین کا جن لوگوں میں کام کرنا ہے ان میں اولاً

قبول دعوت کی صلاحیت پیدا کرے۔ چنانچہ حضرت والا نے یہاں ایک کام تو یہ کیا

اپنی تقریر میں روزانہ حضرت زکریا ملتانی کا واقعہ بیان فرمایا جس کا اثر یہ ہوا کہ حاضرین

بھی اس سے متاثر ہوئے اور ان حاضرین نے غائبین سے جا کر اسکو بیان کیا تو شدہ

شدہ جملہ ارباب خواتق تک یہ بات پہونچی کہ حضرت مولانا نے آج یہ بیان فرمایا ہے

اور دوسرا کام یہ کیا کہ سب آنے والوں کے ساتھ نہایت ہی خوش اخلاقی سے پیش

آئے اور ہر شخص کے ساتھ اسکی حیثیت کے مطابق معاملہ فرمایا یعنی کسی دائرہ سے

اگر کوئی صاحب سجادہ تشریف لے آئے تو خاطر مدارات کے علاوہ سبج، رومال

اور نقد وغیرہ کا کچھ نہ کچھ ہدیہ انکی خدمت میں ضرور پیش فرمایا۔ حضرت والا کے اس

خلق کا چرچا بہت جلد پورے شہر میں ہو گیا اور لوگوں نے جو اہنیت محسوس کی تھی

وہ بہت جلد تبدیل بہ انس و محبت ہو گئی۔ ہر شخص نے سمجھ لیا کہ نہایت خلیق انسان

ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ موافقین نے تو یہ کہنا شروع کیا کہ بہت بزرگ شخص ہیں

اور مخالفین بھی اتنا کہنے پر مجبور ہو گئے کہ یہ ویسے وہابی نہیں ہیں جیسے اور دیوبندی

ہوا کرتے ہیں۔ حضرت والا یہ سنکر ہنستے تھے اور فرماتے تھے کہ بھائی میرا عقیدہ

اور مسلک وہی ہے جو حضرت مولانا تھانویؒ کا تھا اور میں اپنے طریقہ میں کچا

نہیں ہوں بہت مضبوط ہوں ہاں چونکہ اخلاق کی تعلیم ہی کرتا ہوں۔ حسن خلق کو

پسند کرتا ہوں اسلئے خود بھی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو میری ذات سے کسی قسم

کی تکلیف نہ پہونچے اور سناتے تھے کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ کوئی کام ایسا نہیں ہے جو درشتی اور سختی سے نکلتا ہو مگر یہ کہ اسکے لئے کوئی ایسا طریقہ بھی ضرور موجود ہوتا ہے جو نرم اور سہل ہو تو انسان کو چاہیے کہ نرم ہی طریقہ کیوں نہ اختیار کرے۔ اور فرماتے تھے کہ تبلیغ و تعلیم کے لئے نرمی ہی کو متعین سمجھتا ہوں۔ بڑے ہی نفسانیت کا زمانہ ہے انسانیت اور نکیر اپنے شباب پر ہے لہذا اس دور میں اگر مفید ہو سکتی ہے تو نرمی ہی۔ نرم اخلاق سے پتھر جیسے قلب بھی موم ہو جاتے ہیں اسلئے میں بھی باب اصلاح میں اپنے لوگوں کے ساتھ کچھ سختی کا معاملہ کیوں نہ کر لوں لیکن دوسرے لوگوں کے ساتھ تو بہت نرمی ہی برتتا ہوں۔ چنانچہ یہاں الہ آباد میں بھی اس طرز کا کھلا ہوا فائدہ نظر آیا کہ سوا چند غالی اور متشدد اہل بدعت کے اور سب ہی حضرات ہمارے حضرات سے ملے اور ملکر خوش ہوئے۔ حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ دیکھو میری اس نرمی کا اثر یہ بھی ہوا کہ ہر شیخ اور ہر مقتدا جسکا یہاں ایک مخصوص حلقہ تھا وہ بھی اپنے لوگوں میں میری برائی نہیں کرتا ورنہ اگر ان سب لوگوں کو میں اپنا مخالف بنا لیتا تو یہی سب اور دوسرے لوگوں کو میرے خلاف بہکاتے اور پھر میرے لئے کام کرنا دشوار ہو جاتا۔

غرض ان دونوں طریقوں سے حضرت اقدس نے یہاں کی عام فضا میں بہت کچھ سکون کا سامان پیدا فرما دیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ دین کا سب کام ہونے لگا مجلسیں بھی ہونے لگیں اور مدرسہ کا بھی کام شروع ہو گیا جب اہل علم کا مجمع ہو گیا تو لوگ فتوے اور مسائل بھی دریافت کرنے لگے باہر سے بھی جو علماء کرام اور واعظین عظام الہ آباد آتے وہ حضرت کے در و دولت پر ملاقات کے لئے اور کبھی قیام کے لئے تشریف لانے لگے۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ اب باہر سے لوگوں کی آمد و رفت بکثرت ہونے لگی الہ آباد کا جائے وقوع ہر لحاظ سے بہت مناسب تھا۔ سب طرف سے گاڑیاں براہ آتی ہیں اسلئے آنے والوں کو سفر میں جو سہولت ملی وہ اس سے قبل حضرت کے وطن یا گورکھپور میں حاصل نہ تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی مدظلہ اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ تو متعدد بار تشریف لائے کبھی کسی دینی جلسہ یا اجتماع میں شرکت

کے لئے الہ آباد آنا ہوا تب بھی حضرت والا سے ضرور ملاقات فرمائی۔ حضرت علامہ مولانا محمد آبراہیم صاحب بلیاوی بھی یہیں تشریف لائے اور حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کا تعلق بھی حضرت والا سے یہیں سے شروع ہوا۔ مولانا عبدالمصاحب صاحب دریا آبادی کا بھی آنا یہیں ہوا۔ اور مولانا عبدالباقی صاحب ندوی کو تو اپنے اپنے بار بار کے آنے میں بہت ہی سہولت ہو گئی۔ حضرت مولانا فتاری محطیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بھی یہیں حضرت والا سے ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی جسے حضرت مہتمم صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان میں یوں فرمایا کہ بچپن کے بعد اب بچپن میں حضرت سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ سفر میں آتے جاتے یہاں ہی امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی پھلواری شریف والے بھی تشریف لائے۔ ایک ایک یار مولانا حفظ الرحمن صاحب سیواری اور مولانا سعد مدنی صاحب کو بھی الہ آباد میں حضرت والا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ حضرت والا کا یہ طریقہ بطور ایک عادت مستمرہ کے تھا کہ ذی الشرف والمنزلہ حضرات کا بہت احترام فرماتے تھے خواہ حضرات علماء ہوں یا مشائخ یا کسی بزرگ کی اولاد ہوں حضرت والا کچھ نہ کچھ مدیہ ان حضرات کی خدمت میں ضرور پیش فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب بھی جب رخصت ہونے لگے تو حضرت نے انھیں بھی کچھ مدیہ پیش فرمایا اور معانقہ فرمایا حالات ہند کے اس زمانہ میں کچھ تشویشناک تھے مسلمانوں پر مظالم ہو رہے تھے ضمناً اسکا ذکر آگیا تو مولانا سید ہاروی نے رخصت ہوتے وقت دعا کی درخواست کی اور یہ عرض کیا کہ حضرت ان حالات کا ہمیں شدت سے احساس ہے بس حضرت دعا فرماویں اور ہمارے حال پر توجہ ضرور فرمائیں انشاء اللہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم لوگ آپ کے سپاہی ثابت ہوں گے۔

مولانا سیواری کے اس جملہ میں جیسا کچھ تاوب۔ انقیاد۔ تسلی اور اور منصب کی شناخت اور تواضع کا اظہار ہے یہی سب امور ایک عالم کی حقیقی صفات تھیں مگر افسوس اب یہ سب باتیں کہاں ؟

اسی طرح مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی اور مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی کا بھی آنا ہوا۔ ایک دفعہ مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری اور ایک بار مولانا ظریف احمد صاحب سہارن پوری بھی تشریف لائے اور جماعت اسلامی کے صدر مولانا ابواللیث صاحب نے یہاں بھی حضرت سے ملاقات کی۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پر تا بگڑھی بھی اب کبھی کبھی یہاں مجلس میں تشریف لانے لگے اور اور بابا نجم احسن صاحب پر تا بگڑھی نے بھی یہیں حضرت کو مسند ارشاد پر بیٹھا ہوا پہلی بار دیکھا تو فرط مسرت سے یہ اشعار موزوں فرمائے:

دیکھ دیوانے دیکھ اے احسن یہ بھی گلشن ہے اشرفی گلشن

مجلس حضرت وصی الشہدے نمود بہار تھکانہ بھون

بابا نجم احسن صاحب کے اس فرمانے پر کہ:

مجلس حضرت وصی الشہدے نمود بہار تھکانہ بھون

راقم کو بے ساختہ ایک بات یاد آگئی کہ وہ یہ کہ ہمارے حضرت یہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح سے یورپی میں اللہ تعالیٰ نے مولانا تھکانوی کو پیدا فرمایا کہ ان سے دین و اصلاح کا اتنا بڑا کام لیا اسی طرح سے ہماریں حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری کا یہی مقام تھا اور یہ فرماتے کہ اگر اسی طرح کے دو چار بزرگ اور ہندوستان میں پیدا ہو جاتے تو سارا ہندوستان ہی دین کے رنگ میں رنگ جاتا اسی طرح کی ایک بات ایک اور بزرگ فرماتے تھے کہ حضرت تھکانوی کے خلفاء تو بہت ہوئے ہیں اور سب ہی سے اللہ تعالیٰ نے دین کا کام لیا لیکن ان میں سے دو حضرات ایک مولانا محمد حسن صاحب امرتسری اور دوسرے ہمارے حضرت مصلح الامۃ نور اللہ مرقدہ ان میں ایک نے پاکستان کو رنگ دیا دوسرے کا فیض ہند میں عام ہوا۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بابا نجم احسن صاحب حضرت والا کی مجلس کو "نمود بہار تھکانہ بھون" فرماتے ہیں۔ آخر کچھ تو دیکھا ہوگا؟ بات یہ ہے کہ حضرت تھکانوی کے مجاز تھے، بہار تھکانہ بھون دیکھ چکے تھے۔ ہمارے حضرت کی مجلس کو

اسکا آئینہ دیکھ کر اصل کی یاد تازہ ہو گئی جو قلب سے زبان پر آ گیا۔ ایک پیر بھائی کا اپنے پیر بھائی کی اس طرح سے تعریف کرنا یا تو پہلے زمانہ کے ساتھ مخصوص تھا یا اہل اخلاص ہی کا شیوہ ہوا کرتا ہے جو اس زمانہ میں اگر نایاب نہیں تو نادر اور کمیاب تو ضرور ہی ہو گیا ہے۔ یہ تو آپ نے چمن تھانہ بھون کے ایک گل کی تعریف سنی اب ذرا دوسرے گل کی تعریف بھی سنیے۔ مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کتنے بڑے شخص ہوئے ہیں، حضرت تھانویؒ کے اہل خلفاء میں سے تھے ایک مرتبہ انکو حضرت مولانا محمد حسن صاحب امرتسری کی مجلس امرتسری شرکت کا اتفاق ہوا اس کا تاثر خود انکی زبان سے سنیے اور لطف حاصل کیجئے۔ فرماتے ہیں کہ سہ

یہ اعجو بہ فیض و فضل مولانا حسن دیکھا کہ امرتسری میں ہم نے آج اک تھانہ بھون دیکھا
سنا وہ درس قرآن دل کی آنکھیں کھول دیں جسے معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا
شرعیات میں طریقت کو طریقت میں حقیقت کو کھلی آنکھوں سے ہر حاضر نے گویا ہمقرن دیکھا
ہمارے مفید مطلب تو بس یہی اشعار تھے لیکن ناظرین کی تہنیت طبع کے لئے
بقیہ تین اشعار جو مجھے مل سکے وہ بھی درج کرتا ہوں سہ

منادی حرم کی پھر سنی آواز مستانہ پھر ان آنکھوں نے گویا وہ مدینہ کا چمن دیکھا
جزا کہ شد کہ چشم باز کردی یاد حق دادی مسلمان را بطرز نو تو دیرینہ سبق دادی
الہی پھر مسلمانوں میں پیدا ذوق قرآن ہو

اسی میں انکا جنیا ہوا اسی میں اُن کا مرنا ہو

سبحان اللہ! کیا خوب ہے یہ کلام حضرت مفتی صاحب کا صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی تال سے دونوں ٹکڑے ہوئے ہیں جس حال سے متاثر ہو کر بابا بخم احسن صاحب کو الہ آباد میں تھانہ بھون یاد آیا تھا اسی نوع کے مناظر پیش نظر ہو کر حضرت مفتی صاحب کو بھی امرتسری میں اپنے محبوب شیخ کا مسکن یعنی تھانہ بھون یاد آ گیا۔ ماشاء اللہ کیسے پیر تھے اور کیسے مرید تھے۔ کیسی سب کی محبت تھی اور کیسی انکی مناسبت تھی۔ اور اس نوع کا کلام وہ بھی ایسے باکمال حضرات کی زبان سے نکلنے نے ان بزرگ کے ارشاد کی تائید

کر دی کہ حضرت تھانویؒ کے یہ دونوں خدام واقعی یک جان دو قالب ہی تھے۔
 اسی طرح یہیں الہ آباد میں مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی بھی اپنے اپنے پٹنہ
 کے سفر سے واپسی میں ملے اور بیعت بھی ہو گئے۔ یہیں مولوی محمد رفیع صاحب
 بن حاجی محمد رفیع صاحب حضرت والاؒ سے ملے اکثر مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ نیز
 الہ آباد کے رؤسا میں سے شیخ ذوالفقار اللہ صاحب۔ مصطفیٰ رشید شروانی صاحب
 نے بھی حضرت والاؒ سے بار بار ملاقات کی۔ اسی طرح سے بشیر احمد صاحب
 ایڈوکیٹ جو ایک زمانہ میں اسمبلی کے ممبر بھی رہے وہ نیز نفیس احمد کاظمی صاحب
 ایڈوکیٹ بھی اکثر حضرت والاؒ سے ملتے رہے۔ اسی طرح سے الہ آباد ہی کے قیام
 کے زمانہ میں سید محمود صاحب مرحوم کو بھی حاضری کا موقع ملا چنانچہ وہ بھی چند بار
 تشریف لائے اور حضرت اقدسؒ سے بیعت بھی ہوئے۔ انکا ایک ابتدائی خط ملاحظہ
 فرمائیے۔ حضرت والا کو لکھا

الردمبر اللہ۔ ۲ تعلق کرینٹ۔ نئی دہلی ممبر آف لوک سمجھا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضور والا۔ السلام علیکم۔ حالانکہ جناب والا کا وطن مالوت اعظم گڑھ ہے
 لیکن اس ناچیز کو اب تک جناب سے واقفیت نہ تھی کل کھنؤ میں عزیزی سید حسن
 صاحب سے ملاقات ہوئی اور کچھ دیر تک بزرگوں کا ذکر رہا اسی دوران میں انھوں نے
 جناب والا کا ذکر کیا سید حسین صاحب میرے محترم دیرینہ دوست سید سلیمان ندوی صاحب
 کے داماد ہیں اسلئے مجھ کو ان سے ربط ہے انکی گفتگو نے اس فقیر کے دل
 میں جناب عالی سے ملنے کا شوق پیدا کر دیا اور میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ جلد از جلد
 جناب کی زیارت سے مشرف ہوں۔ چنانچہ ۲۵ یا ۲۶ دسمبر کو یہ ناچیز الہ آباد جناب کی
 قدیم بوسی کے لئے حاضر ہو گا مصطفیٰ رشید شروانی کے یہاں قیام کروں گا اور انجے
 تک انشاء اللہ آستانہ بوسی کروں گا۔

سید حسین صاحب نے آپ کا ایک مختصر سا رسالہ جو قرآن کی تلاوت کی

اہمیت کے متعلق ہے دیا تھا جسے میں نے پڑھ لیا طبیعت کو بیدار لذت حاصل ہوئی۔ مجھے یہی عرصہ سے علماء کرام سے شکایت رہی ہے کہ قرآن پر زور نہیں دیا جاتا اور نہ مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم عام کی جاتی اور نہ قرآن سے وعظ و نصیحت حاصل کی جاتی ہے۔ میں عربی نہیں جانتا اور نہ قرآن سمجھتا ہوں لیکن ترجمہ کی اعانت سے جہاں اسکے معنی و مطالب سمجھ میں آ جاتے ہیں بدن میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے ہیں۔

مولانا کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کر رہا ہوں کچھ عرصہ ہوا میں نے مولانا مرحوم کو خواب میں زور زور سے قرآن کھڑے ہو کر پڑھتے ہوئے دیکھا انہی ڈاڑھی بڑھتی ہوئی تھی ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور وہ پھر مشغول ہو گئے۔ اسکی تعبیر میں نے یہ نکالی کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ بس اب قرآن ہی کی تعلیم و تلقین مسلمانوں کا بڑا کام ہے۔ اس رسالہ میں جناب کی یہی تعلیم و تلقین دیکھ کر طبیعت بہت حیرت یاب ہوئی۔ سچی تو چاہتا تھا کہ چند دن جناب کی صحبت باہر میں گزاروں مگر سہر دست بہت سی پریشانیوں میں مبتلا ہوں اسلئے صرف ایک دن کھڑکوں گا۔ حضرت مولانا راہپوری اور مولانا۔۔۔ سے بھی شرف نیاز حاصل کر چکا ہوں۔ اگر جواب کی عزت بخشی جائے تو خوشی کا باعث ہوگا۔

تحقیق : — مکر می بندہ زیدت مکارمکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ باوجودیکہ یہ آپکا پہلا خط ہے تاہم آپ سے اجنبیت بالکل نہیں محسوس ہوئی غالباً اسکی وجہ یہی ہے جو آپ نے تحریر فرمائی ہے کہ ”سید حسین صاحب میرے محترم دیرینہ دوست سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم کے داماد ہیں اس لئے مجھ سے ان سے ربط ہے“ — یعنی آپ کو سید سلیمان صاحب سے ربط ہے اور انکو مجھ سے ربط ہے اس طرح آپ گویا میرے دوست کے دوست ہوئے پس بظاہر آپ کو مجھ سے واقفیت نہ تھی لیکن باطناً ایک دیرینہ ربط باہم تھا گویا بالواسطہ تھا اور طریق میں باطن ہی کا اعتبار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی وجہ ہوا اجنبیت نہ محسوس ہونے کی

تشریف آوری کی خبر نے مجھے بھی جناب کی ملاقات کا مشتاق بنا دیا اللہ تعالیٰ
 باحسن وجہ موقع نصیب فرمادیں۔ اجازت ہے۔ شوق سے تشریف لائیے۔
 انشاء اللہ تعالیٰ ان تاریخوں میں الہ آباد ہی میں رہوں گا۔ آپ کو وقت کم تھا اسلئے
 جی تو یہی چاہتا تھا کہ خانقاہ ہی میں جناب کا قیام ہوتا تاکہ اس کم وقت میں زیادہ سے
 زیادہ صحبت کا موقع مل جاتا مگر شاید آپ کو وہاں جیسا آرام یہاں نہ مل سکے یا آپ کی
 دوسری مصالح بھی ہوں اسلئے آپ ہی کو اختیار دیتا ہوں جہاں سہولت ہو قیام
 فرمایا جائے۔ قرآن شریف کے متعلق اپنے سے آپ کے مذاق کو متحد پا کر ایک خاص قسم
 کی مسرت ہوئی اور اس سلسلہ میں مزید کچھ کام کرنے کا شوق تازہ ہو گیا۔ اس
 قحط الرجال کے دور میں جب کسی اہل فہم سے کام کی کچھ تاہید مل جاتی ہے تو
 بڑی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ میری مراد اس سے آپ کے خط کا یہ مضمون ہے
 کہ مجھے بھی عرصہ سے یہ شکایت رہی ہے کہ قرآن پر زور نہیں دیا جاتا ہے اور نہ
 مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم عام کی جاتی ہے اور نہ قرآن سے وعظ و نصیحت کی جاتی
 ہے میرا بھی یہی خیال ہے۔ باقی میں علاوہ اسکے اتنی بات اور کہتا ہوں کہ آج
 ہم لوگوں نے قرآن سے بھی غفلت برتی اور ساتھ ہی ساتھ سنت سے بھی اعتنائی
 برتے ہوئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ بھی قرآن ہی سے غفلت کا نتیجہ اور اسی کی
 فرع ہے کیونکہ کتاب و سنت دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں اسلئے کہ جس شخص کے
 پیش نظر کتاب اللہ کی یہ نصوص ہونگی (۱) مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ
 فَانْتَهُوا (جو کچھ تم کو رسول دیں اسکو لے لو اور جس بات سے منع کریں اس سے بچو)
 (۲) مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ (۳) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
 محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ تمہارے لئے رسول اللہ کے اندر ایک اچھا اسوہ ہے)
 آخر اسکو اوامر و منا ہی رسول۔ رسالات نبی اور اسوہ پیغمبر کے علم سے کس طرح مبرا
 اور ظاہر ہے کہ ان امور کی تفصیل سنت ہی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح
 کتاب اللہ کے احکام معلوم کئے بغیر وہ شخص بھی نہیں رہ سکتا جس کے قلب میں اسکی

قدر و عظمت کو ان احادیث نے راسخ کر دیا ہو۔ سینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

(۱) اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الہدی ہدی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وشر الامور محدثاتہا وکل بدعة ضلالة (الابداع شیخ علی محفوظؒ)
(۱) اما بعد پس بہترین قول اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ اور بدترین شے دین میں بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

(۲) ابن مسعودؓ سے موقوفاً و مرفوعاً دو طرح مروی ہے قال انما هما اثنتان الکلام والہدی فاحسن الکلام کلام اللہ واحسن الہدی ہدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم الا ایاکم ومحدثات الامور فان شر الامور محدثاتہا ان کل محدثۃ بدعة (وہ دو ہیں ایک کلام اور ایک طریقہ پس بہترین کلام کلام اللہ ہے اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور سنو! اپنے کوئی نئی چیزوں سے بچاؤ اسلئے کہ نئی باتیں ہی سب سے بُری چیز ہیں اور ہلا شبہ (دین میں) نئی چیز جو ہو وہ بدعت ہے۔

(۳) نیز حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قال ان احببت ان لا توقف علی صراط طرفۃ عین حتی تدخل الجنة فلا تحدث فی دین اللہ حدیثا برائداً۔

(اگر تم چاہتے ہو کہ دخول جنت کے راستہ میں دم بھر کے لئے بھی روکاؤٹ نہ ہو اللہ تعالیٰ کے دین میں کوئی نئی بات نہ نکالو)

اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ کے دین میں احداث سے بچنا کتاب و سنت دونوں کے کامل علم کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور لوگ آج ان دونوں ہی سے غافل ہیں چنانچہ اسی غفلت کا یہ نتیجہ ہے جو موجودہ بد حالی کی صورت میں ہمارے اور آپ کے سامنے ہے کہ آج معاصی کی کثرت کا یہ حالی ہو رہا ہے کہ دور بھالت کا نقشہ ہمارے سامنے

پیش کر دیا ہے اور معصیت کی شدت نے کفر کی سرحد تک عوام کو گویا پہنچا دیا ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی کتاب الایمان میں یکے بعد دیگرے دو ابواب قائم فرمائے ہیں۔ چنانچہ ایک میں تو یہ فرمایا ہے کہ باب کفران العشر و کفر دون کفر۔ اسکی شرح فرماتے ہوئے صاحب فتح الباری نے قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کا قول نقل فرمایا ہے کہ مراد اس سے بخاریؒ کی یہ ہے کہ یہ بتائیں کہ جس طرح سے طاعت کو ایمان کہا جاتا ہے اسی طرح سے معاصی پر بھی کفر کا اطلاق بھی کر دیا جاتا ہو اس کفر مراد وہ کفر نہیں جسکی وجہ سے آدمی ملت ہی سے خارج ہو جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ (پس کفر کے بھی درجے ہوئے بعض کفر بعض سے اشد ہوتا ہے) اور دوسرے باب میں فرماتے ہیں کہ ”باب المعاصی من امر الجاہلیۃ“ یعنی جس قدر کبھی معاصی ہیں وہ سب جاہلیۃ کے زمانہ کی چیزیں ہیں۔ اسلام سے انکا کچھ جوڑ نہیں ہے۔ یہ ایک بات درمیان میں آگئی تھی اس خیال سے ذرا تفصیل سے عرض کر دیا کہ بہت ممکن ہے کہ آپ کبھی اس سے محفوظ ہوں۔

خط میں آپ نے کلام اللہ کے معانی کے طور سے جس کیفیت کا طاری ہونا لکھا ہے یہ تو عین تقاضائے ایمان و ایقان اللہم زد فردا اور خواب کی جو تعبیر تحریر فرمائی ہے صحیح ہے اللہ تعالیٰ اس کام سے ہم کو بھی اور آپ کو بھی حصہ وافر نصیب فرمائیں۔ آمین۔

میرے مکان کا پتہ تو وہی ہے جو آپ نے لفافہ پر تحریر فرمایا ہے یعنی ۲۳ بخشی بازار۔ الہ آباد۔ یہ جگہ الہ آباد اسٹیشن سے بالکل قریب بھی ہے تقریباً ۱/۲ یا ۳ فرلانگ کا فاصلہ ہوگا بخشی بازار کے ڈھال والے چوراہے کے متصل ہی غریب خانہ ہے ہمارے کرم فرماؤ اگر صلاح الدین صاحب کو پکڑ لینے کیلئے اسٹیشن جائیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔ باقی عند التلاقی۔

والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ

اسی طرح سے یہاں الہ آباد میں حضرت اقدسؒ کی خدمت میں

حضرت مولانا ابراہیم صاحب مدظلہ بھی متعدد بار تشریف لائے یوں آپ حضرت والا کے یہاں حضرت کے فقیہوں کے زمانہ قیام میں بھی تشریف لیجا چکے تھے اور یاد آتا ہے کہ گورکھپور بھی تشریف لے گئے تھے۔ لیکن الہ آباد میں آجائے کے بعد حضرت اقدس سے کسی بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا نہ بھون کے بعض حالات کے سلسلے میں حضرت مولانا پھولپوریؒ نے ہمارے حضرت سے جو کچھ فرمایا چاہا تو اس میں حضرت مولانا ہردوئی مدظلہ واسطہ بنتے رہے۔

”حضرت مولانا ابراہیم صاحب مدظلہ بھی حضرت اقدس مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہ کے خلفاء میں سے ہیں اور مجاز بیعت میں اسکے باوجود مولانا مدظلہ نے اپنا یہ طریقہ رکھا کہ حضرت تھانویؒ کے بعد حضرت اقدس کے کسی نہ کسی خلیفہ سے اپنا خصوصی تعلق برابر قائم رکھا چنانچہ حضرت تھانویؒ کے بعد حضرت کے حلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری سے مولانا موصوف کا خاص تعلق رہا۔ یعنی آمد و رفت بھی وہاں رہتی اور اپنے خصوصی معاملات میں استفسار بھی حضرت ہی سے فرماتے۔ ادھر اپنے حضرت اقدس کی خدمت میں چند بار جانا ہوا تو تعلق اور محبت میں اضافہ ناگزیر تھا۔ حضرت اقدس بھی مولانا ہردوئی کی تشریف آوری پر خوش ہوتے اور کبھی کبھی فرماتے کہ آج مجلس میں کچھ آپ بیان کر دیجئے چنانچہ مولانا الامام فوق الادب پر عمل فرماتے ہوتے کچھ بیان فرما دیتے اس قرب و مناسبت کا اثر یہ ہوا کہ حضرت مولانا پھولپوریؒ کے وصال کے بعد پھر مولانا ہردوئی نے حضرت اقدس کا انتخاب فرمایا یعنی آمد و رفت میں ایک تسلسل قائم ہو گیا۔ چنانچہ الہ آباد کے علاوہ بمبئی بھی تشریف لے گئے اور ہمارے حضرت کو مولانا کی جانب توجہ پیش از ہو گئی یہاں تک کہ بمبئی کے زمانہ قیام میں مولانا ابراہیم صاحب مدظلہ کا خط آیا کہ کوئی آپریشن ہونا ہے حضرت اقدس اس خبر کو سن کر بے چین ہو گئے اور یہ فرمایا کہ اپنی جماعت میں اب یہی ایک نوجوان شخص تھے امید تھی کہ کچھ کام کریں گے یہ بھی بیمار ہو گئے، تم سب لوگ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو صحت کامل عطا فرمائے۔“

چنانچہ اکثر و بیشتر علماء کرام کے اسماء آپ نے ملاحظہ فرمائے اب ان اطباء عظام کے نام بھی سینے جو سلسلہ معالجہ یا صرف برائے ملاقات حضرت اقدسؒ سے الہ آباد میں لے۔

حکیم سید فخر الدینؒ جعفری پہلے سفر علاج میں حضرت سے پہلے اس کے بعد تو انکا انتقال ہی ہو چکا تھا۔ ان کے خلف رشید جناب محمد سلیمان صاحب برابر مجلس میں آتے رہے۔ شفا الملک جناب حکیم شمس الدین صاحب لکھنوی حضرت کے خاص معالج ہی تھے لکھنؤ سے برابر تشریف لاتے رہے۔ حکیم نثار احمد کلکتہ والے بھی تشریف لائے۔ الہ آباد کے حکیم محمد سعید صاحب بھی برابر آتے رہے اور حکیم مولانا محمد میاں صاحب فاروقی کا تو حضرت والا سے تعلق ہی تھا اکثر مجلسیں اور علاوہ مجلس کے اکثر دوسرے اوقات میں تشریف لاتے تھے۔ علی گڑھ سے جناب حکیم افہام اللہ صاحب متعدد بار تشریف لائے۔ اسی طرح سے لکھنؤ کے حکیم افتخار احمد صاحب بھی کئی مرتبہ آئے۔ تراؤں کے حکیم حبیب اللہ صاحب بھی حاضر خدمت ہوتے رہے۔ میرٹھ کے حکیم بنیاد علی صاحب (داماد حکیم محمد مصطفیٰ میرٹھی) بھی الہ آباد میں آئے۔ جون پور کے حکیم منظور احمد صاحب اور مختار احمد صاحب بھی آئے۔ حکیم ظہیر الدین صاحب بھی برابر تشریف لاتے رہے اور کبھی کبھی بہت بہت دنوں تک قیام فرماتے۔ بمبئی کے حکیم مستور صاحب معروف حکیم اجیری صاحب تشریف لائے۔ حکیم احمد عثمانی صاحب الہ آباد میں اکثر و بیشتر تشریف لاتے۔ حکیم محمد شفیع اللہ صاحب جو حضرت سے بیعت تھے برابر آتے تھے۔ دیوبند سے حکیم محمد عمر صاحب اور حکیم عزیز الرحمن صاحب اس قبل وطن میں حضرت سے ملاقات یا علاج بھی ان حضرات اطباء

نے فرمایا تھا:-

حکیم الہی بخش صاحب اعظم گڑھ والے۔ حکیم محمد حسن صاحب پورہ معروف والے۔ حکیم محمد شفیع صاحب۔ حکیم حفیظ اللہ صاحب۔ حکیم بشیر الدین صاحب۔

حکیم بشیر الدین صاحب - ۲۲ حکیم نثار احمد صاحب - ۲۳ محمدی کے حکیم رمضان الحق صاحب - ۲۴ حکیم حبیب اللہ صاحب و حکیم حبیب اللہ صاحب و حکیم محمد منظور احمد صاحب - ۲۵ گورکھپور کے حکیم ابوالکلام و حکیم وصی احمد صاحب - ۲۶ حکیم فضل اللہ صاحب - ۲۷ حکیم عبد الحق صاحب - ۲۸ حکیم وجیہ اللہ صاحب اور بعد میں لکھنؤ میں حکیم عبد اللطیف صاحب معروف بہ حکیم فلسفی - ۲۹ حکیم عبد الحمید صاحب وغیرہ سے ملاقات کے علاوہ اکثر حضرات مختلف اوقات میں حضرت کے معارج رہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں ان اطباء انگریزی یعنی ڈاکٹر صاحبان کو بھی شمار کر دیا جائے جو بصورت تجویز نسخہ یا مشورہ خصوصی حضرت اقدس کے علاج معالجہ میں شریک رہے اور بطور خود بھی حضرت کے فیض سے مستفیض ہوتے رہے۔ یہاں الہ آباد کے علاوہ دوسرے مقامات کے بھی حضرات کا نام اس فہرست میں شامل ہے۔

- ۱۔ جناب ڈاکٹر غفران صاحب مانی کلاں جون پور - ۲۔ جناب ڈاکٹر محمد شمیم صاحب جون پور - ۳۔ ڈاکٹر محمد ظفر صاحب (ہومیو) کوریا پارمی مقیم حال بنارس۔ حضرت والا کے خاص معارج رہے - ۴۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب صدیقی الہ آباد - ۵۔ ڈاکٹر صابر حسین صاحب (ہومیو) الہ آباد - ۶۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب الہ آباد - ۷۔ ڈاکٹر محمد ابرار صاحب الہ آباد - ۸۔ ڈاکٹر حماد صاحب ابن حکیم عثمانی صاحب - ۹۔ ڈاکٹر ایتھان صاحب (ہومیو) الہ آباد - ۱۰۔ ڈاکٹر حفیظ اللہ خاں صاحب گورکھپور - ۱۱۔ ڈاکٹر عبد الجلیل صاحب فریدی لکھنؤ - ۱۲۔ ڈاکٹر انصاری صاحب علی گڑھ - ۱۳۔ ڈاکٹر اسحاق صاحب ممبئی - اسکے علاوہ ممبئی میں چند اور مسلم ڈاکٹروں سے بھی ربط ہو گیا تھا۔

راقم نے یہاں ناظرین کے سامنے اطباء کرام اور ڈاکٹر صاحبان کی یہ طویل فہرست جو بیان کر دی ہے وہ یونہی بلا وجہ نہیں کی ہے بلکہ اس سے آپ حضرات

کے سامنے حق تعالیٰ کے ایک عجیب و غریب معاملہ کا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت والاؒ کے ساتھ مقدر فرمایا تھا اسکا اظہار مقصود تھا وہ یہ ہے کہ

حضرت اقدس نے ماہ اپریل ۱۳۵۶ء کی کسی تاریخ میں وطن کو خیر باد فرمایا تھا پھر گورکھپور سے ۲۲ نومبر ۱۳۵۶ء کو الہ آباد تشریف لائے اور پھر یہاں سے علی گڑھ لکھنؤ اور جون پور اور بمبئی وغیرہ تشریف لے گئے تو ان مقامات پر تشریف لیجانے کی وجہ سے جہاں عوام کو اہل علم کو نفع ہوا وہ تو ہوا ہی ان کے منجملہ ایک خاص طبقہ یعنی اطباء و ڈاکٹر صاحبان کی بھی ایک خاص جماعت حضرت والا کے فیض سے مستفیض ہوئی اور اکثر جگہوں پر اس فیض کا سبب خود حضرت اقدسؒ کا علیل ہو جانا بنا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی قدرت کی نرالی ہی شان دکھائی کہ ان حضرات کو روحانی صحت عطا فرمانے کے لئے اپنے ولی ہی کو بیمار فرما دیا تاکہ ان کے لئے اپنے مشاغل کثیرہ کا عذر باقی نہ رہے اور علاج و معالجہ ہی کو ان کے لئے سبب فلاح و اصلاح بنا دیا۔ عجب نہیں کہ ان حضرات کی بے لوث خدمت خلق کو دیکھ کر خالق کائنات نے باطن کے اس چشمہ شیریں کو خود انھیں کے پاس پہنچا دیا بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی فضل و کرم ہے جس بندہ پر ہو جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے ان سب ہی حضرات کو حضرت مصلح الاممؒ سے بقدر نصیب فیض ہوا۔ البتہ حکیم مولانا سید فخر الدین صاحب جعفریؒ کا تعلق حضرت اقدس سے مساویانہ رہا اسلئے کہ حکیم صاحب موصوف زیادہ عمر کے بھی تھے اور خود ایک مستقل صاحب اجازت شیخ بھی تھے اور الحمد للہ خاص اپنے ہی سلسلہ کے لوگوں میں سے تھے چنانچہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

” فراغت تعلیم کے بعد پہلی بیعت حضرت مولانا مولوی حکیم حافظ صوفی محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ کی جنکا وصال اخیر شریف میں حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے اس شعر

گفت قدوسے فقیری در فنا و در بقا خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

پر ہوا۔ مولانا آبادی قطب عالم آیۃ من آیات اللہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہاجر مکی کے اجل خلفا میں تھے حضرت مولانا آبادیؒ کے وصال کے بعد ہمارے حضرت (حکیم مولوی سید فخر الدین صاحب جعفری زینی آبادی) نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو خط لکھا کہ ہماری تعلیم باقی رہ گئی ہے تکمیل کے لئے آپ کی خدمت میں آنا چاہتا ہوں مولانا گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا کہ چونکہ بھائی مولانا آبادیؒ اور مجھ میں کچھ اختلافات ہیں اسکی وجہ سے تم کو کچھ تکلیف ہو۔ ہمارے حضرت (حکیم موصوفؒ) نے لکھا کہ جن باتوں میں آپ کا اور انکا اختلاف ہے وہ فقہی مسائل ہیں اسکو میں مکمل حاصل کر چکا ہوں اور مطمئن ہوں اسکے لئے نہیں آنا چاہتا۔ جن مسائل میں آپ دونوں ایک ہیں اور آپ کا اتفاق ہے یعنی تعلیم تصوف علمی و عملی اسکو سیکھنا اور حاصل کرنا ہے۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے دعائیں لکھیں اور لکھا کہ تم نے صحیح لکھا ہم دونوں میں فقہی مسائل میں تھوڑا اختلاف تھا ورنہ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ تم جب چاہو آ جاؤ۔

ہمارے حضرت (حکیم صاحب موصوفؒ) مولانا گنگوہیؒ کے یہاں جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ کا وصال ہو گیا حضرت (حکیم صاحب) کو اسکا بیحد رنج اور صدمہ تھا اور بہت ہی متفکر تھے کہ مولانا آبادیؒ کو خواب میں دیکھا کہ فرما رہے ہیں کہ بخاری صاحب سے بیعت کرو تعلیم مکمل ہو جائیگی۔ حضرت مولانا آبادیؒ کی تہا کے مطابق حضرت مولانا حکیم فخر الدین صاحبؒ نے حضرت بخاری صاحبؒ سے بیعت کی اور مکمل تعلیم حاصل کی۔

حضرت بخاری صاحبؒ کا اسم گرامی سید محمد افضل ہے آپ

نخارا کے رہنے والے تھے عنفوان شباب میں دارومندستان ہوئے
اور یہیں سے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حج و زیارت سے فراغت
کے بعد اعلیٰ حضرت قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب
مہاجر مکیؒ سے بیعت کی اور حضرت کی خدمت میں عرصہ دراز تک رہ کر
تکمیل تعلیم کی اور خلافت سے بہرہ ور ہو کر بحکم اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ
آگرہ میں مقیم ہو گئے آپ کا مزار پُر انوار چھم چھم گلی آگرہ میں (ایک
مکان کے اندر واقع) ہے

المصباح السالکین صا طبع ہمام
راقم عرض کرتا ہے کہ حکیم فخر الدین صاحبؒ کا حضرت اقدس مصلح الائمہ
سے اس قدر الفت اور محبت کا تعلق اس امر کا تو پتہ دیتا تھا کہ حکیم صاحب
موصوف اپنے سلسلہ سے بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں لیکن مذکورہ بالا تفصیل
کا علم ہم لوگوں کو آج تک نہ ہوا تھا۔ ہمارے ایک محترم دوست بھائی انیس احمد
صاحب پُر غاصوی نے چند دن ہوئے کتاب مصباح السالکین مطبوعہ پاکستان
دکھلائی اس میں مذکورہ بالا تفصیل دیکھ کر بہت مسرت ہوئی اور اسلاف کے
نزدیک فردعی اختلافات کی حیثیت بھی معلوم ہوئی کہ سبحان اللہ کیسے بے نفس
لوگ تھے اور حضرت گنگوہی کی صفائی معاملات اور طالب خدا کی و تدرائی کا
جو علم ہوا وہ تو واقعی حضرت ہی کا حصہ تھا۔ اس تمام تفصیل کے جاننے سے
معلوم ہوا کہ مولانا محمد حسین صاحب آبادی۔ حضرت گنگوہی۔ حکیم الائمہ مولانا تھانوی
حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حکیم سید فخر الدین صاحب جعفری ایک ہی سلسلہ
کے حضرات تھے اور الحمد للہ باہم خوب شیر و شکر تھے۔

پہلے زمانہ کے لوگ اسی طرح سے بے نفس ہوتے تھے ان میں جزئی
اختلافات بھی ہوتے تھے تو اسکو اپنی حد پر رکھتے تھے چنانچہ جسکا طریقہ سنت اور
شرعییت سے قریب تر ہوتا تھا تو دوسرا اسکا لحاظ کرتا تھا میں نے بعض معتبر حضرات

سے سنا کہ حضرت تھانویؒ جب الہ آباد تشریف لاتے تھے مولانا محمد حسینؒ الہ آبادیؒ بھی کبھی
حضرت کی دعوت فرماتے، اور مولانا الہ آبادی کو قوالی کا ذوق تھا چنانچہ کھانے سے
فارغ ہوتے ہی متینہ قوال آجاتے تھے اور قوالی شروع کر دیتے ایک مرتبہ حضرت
تھانویؒ بھی مولانا کے ساتھ دسترخوان پر موجود تھے کھانے سے فراغت کے بعد
حسب معمول قوال آئے اور انھوں نے چاہا کہ اپنا کام شروع کریں مگر حضرت
الہ آبادی نے انکو اشارہ سے منع کر دیا اور یہ فرمایا کہ بھائی آج یہ مولوی صاحب
تشریف لائے ہوئے ہیں جو اس سے پرہیز کرتے ہیں اسلئے آج حذف۔

سبحان اللہ! اختلاف مشرب کے باوجود کیسی رعایت صاحب شریعت عالم
کی تھی، آج کا زمانہ ہوتا تو کوشش کیجاتی کہ انکو کسی نہ کسی طرح قوالی ضرور سنا کر
چھوڑو۔

حاصل یہ کہ جس مسلک کو دیوبندیت کہا جاتا ہے وہ اسوقت بھی موجود تھا
اہل زمانہ کی رسوم و بدعات بھی موجود تھیں لیکن دونوں جماعتوں میں عناد اور
مخالفت کا یہ حال نہ تھا جو آج مشاہدہ میں آرہا ہے۔ ہاں جب سے بریلویت
کا فتنہ شروع ہوا تو اسوقت سے یہ لوگ علماء حقانی و ربانی کے درپے آزار ہو گئے
خلوص کی جگہ نفسانیت آگئی اسلئے مؤدت و محبت کی جگہ عناد و فساد نے لے لی
انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گزشتہ زمانہ میں ہمیشہ ہی علماء ظاہر اور ارباب خوائف کے
طریقہ کار اور مشرب میں کچھ اختلاف ہی رہا ہے لیکن یہ باہم کفر اکفری کا جو
انداز ہمارے بدقسمتی سے آج نظر آرہا ہے یہ کبھی نہیں رہا مشائخ برابر یہ کہتے رہے
کہ ان علماء کے پاس علم دین و شریعت ہے یہ لوگ امانت سنت کے حامل ہیں
لہذا ہمارے ذمہ انکا احترام ضروری ہے اور علماء یہ کہتے تھے کہ ان صلحا کی بعض
رسوم اگرچہ شریعت سے مؤید نہیں ہے تاہم انکو حق تعالیٰ سے جو نسبت اور تعلق
حاصل ہے وہ کم دولت نہیں ہے اور ہمارے پاس گو علم ظاہر ہے لیکن علم باطن اور
احوال باطن میں ان سے ہم کہیں کم ہیں لہذا ہمیں ان سے ملنا چاہیئے اور اپنے لئے

ان سے دعا کرانی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل خواف نے علماء دیوبند سے برابر
 ربط رکھا اور ان سے بعض امور میں اختلاف کے باوجود انکو بنظر تحقیر کبھی نہیں دیکھا
 خود حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے والد صاحب
 الہ آباد کسی مقدمہ میں آئے میں بھی ساتھ تھا طالب علم تھا اور عمر بھی کم تھی۔ چنانچہ
 والد صاحب نے ملا محمدی شاہ صاحب سے ملاقات فرمائی اور اپنے مقدمہ کیلئے
 ان سے دعا کی درخواست کی ہمراہ ہونے کی وجہ سے میرا بھی تعارف ہوا کہ یہ میرا
 بچہ ہے مدرسہ دیوبند میں پڑھتا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اس کے بعد ملا صاحبؒ
 نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کہو مولوی کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟ میں نے جلالین
 شریف وغیرہ کا نام لیا اس پر فرمایا ووجدك ضالاً فقدی کا ترجمہ کرو
 میں نے فوراً عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ نے آپ کو (اے نبی)
 ناواقف پایا پس واقف کر دیا۔ ترجمہ سنکر شاہ صاحبؒ بہت خوش ہوئے
 اور بہت دعائیں دیں یہ موقع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضلالت کا
 ترجمہ نثار امتحان تھا حضرت اقدسؒ نے کامل ادب کی رعایت فرمائی کہ ضلالت کا
 ترجمہ گمراہ نہ کر کے ناواقف کیا اس پر شاہ صاحبؒ بہت خوش ہوئے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کے بزرگوں سے ملنے کا واقعہ تو آپ نے دیکھا
 اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہیؒ کی صفائی معاملہ اور ضلالت کوئی بھی آپ نے ملاحظہ فرمائی
 کہ حکیم صاحبؒ کے شیخ اول سے جزئی اختلاف کی بنا پر اپنے ساتھ وابستگی
 سے انکار فرمایا لیکن پھر انکو فہیم و طالب صادق پا کر اپنے ساتھ متعلق فرمانا منظور بھی
 کر لیا اور فرمایا ہاں سچ کہتے ہو ہم میں اور ان میں چند مسائل میں جزئی اختلاف تھا
 ورنہ تو وہ اور ہم ایک ہی ہیں۔

اسی طرح سے بانی مدرسہ دیوبند حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ
 کی بے نفسی کا ایک واقعہ سینے حضرت کی بستی میں کوئی صاحب مولوی فضل رسول
 نامی رہتے تھے جو مسلکاً حضرتؒ کے خلاف تھے حضرتؒ کے کسی شاگرد نے ایک بار

حضرت کے سامنے انکو اس طرح سے یاد کیا کہ وہ مولوی فصل رسول (یعنی فضیل کی جگہ انھوں نے فصل کہہ دیا اور اپنے طور پر اپنی اس بلاغت پر خوش تھے یہ سمجھتے تھے کہ حضرت سے اسکی داد ملیگی لیکن) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے جب ان کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو ان پر بہت ناراض ہوئے اور یہی بار بار فرماتے رہے کہ ان کا یہی نام ہے جو تم نے لیا ہے، ان کا یہی نام ہے جو تم نے کہا ہے، پھر تم نے انکے نام کو کیوں بگاڑا؟ اور کیا یہ ولاتنا بزوا بالانقلاب (کسی کا نام بگاڑ کر اور بدل کر اسکو نہ پکارو) کی وعید میں داخل نہیں ہے۔ بالآخر جب تک انھوں نے معافی نہ مانگ لی حضرت مولانا ان سے ناراض ہی رہے۔

اہل حق کے انصاف اور اخلاق کا یہ حال ہوتا ہے۔ آج لوگ اپنے کسی مخالف کا نام کس کس طرح بگاڑ کر اور اس سلسلہ میں کیسی کیسی طبع آزمائی فرماتے ہیں اور پھر اس پر خوش ہوتے ہیں ہمارے لئے اپنے اسلاف کے ان واقعات میں عبرت ہے اور دوسروں سے ہم اسکو سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ

اولئک آباءئ فحشئ بمثلہم

اذا جمعنا باجریر المجمع

یہ ہیں ہمارے اسلاف ان کے جیسے اے جریر تم بھی لے آؤ جبکہ ہمکو اور تمکو کوئی مجمع جمع کرے۔

حاصل کلام یہ کہ علماء ظاہر میں اور اہل خوائف متقدمین میں راہ و رسم اور میل و ملاقات برابر جاری تھی یہ آج کا جو انداز آپ کے سامنے ہے یہ بعد کی خواست ہے من سن سنة سیئة فله وزرہا ووزر من عمل بہا یعنی جس شخص نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا تو اسپر اسکا بھی وبال اور جس شخص نے بعد میں اسکے طریقہ پر عمل کیا ان سب کا وبال ہوگا۔ اللہم احفظنا منہ۔

سابق بیان سے معلوم ہو گیا کہ حضرت مصلح الائمہ کا ورود با مسعود الہ آباد میں ہو چکا ہے اور جائے وقوع کے مناسب ہونے اور سفر کی سہولتوں کی بنا پر ہر جگہ سے اور ہر طبقہ کے لوگوں کا آنا جانا آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے اکابر تک کی آمد و رفت جاری ہے۔

تصنیفی مشق اور تالیفی سلیقہ نہ ہونے نیز کسی بھی جگہ کے تمام ہی واقعات مسلسل اور مرتب طور پر ذہن میں نہ ہونے کی وجہ سے قدم قدم پر رکاوٹ پیش آ جاتی ہے کہ اب آگے کیا لکھوں چنانچہ اسی دشواری سے بچنے کے لئے راقم نے گورکھپور کے حالات کے بیان کرنے کے سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہاں کے جو معزز حضرات تھے حضرت مصلح الائمہ کے ساتھ انکی وابستگی کا ذکر کر کے بہت کچھ واقعات پیش نظر کر لئے تھے اسلئے یہاں الہ آباد کے حالات بیان کرنے میں بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے چند مخصوص لوگوں کے حالات جو حضرت اقدس سے متعلق رہے بیان کروں تاکہ انقول بالقول یذکر کے طور پر بات سے بات یاد آتی چلی جائے۔

۱۔ فخر الاطبار جناب مولانا حکیم شاہ سید فخر الدین جعفری صاحب کے حالات عرض کرنے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد کے ایک اور عظیم المرتبہ طبیب حاذق کا ذکر کروں یعنی

۲۔ رئیس الحکماء جناب حکیم احمد صاحب عثمانیؒ الہ آباد کے مشہور طبیب جناب حکیم احمد حسین صاحب عثمانیؒ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ آپ کے دوسرے چھوٹے بھائی محمد حسین صاحب بھی طبیب تھے یعنی والد طبیب اور ان کے یہ دونوں صاحبزادے بھی طبیب تھے گویا اس خانہ ہمہ آفتاب است کا مصداق تھے۔ چنانچہ حکیم عثمانی صاحب نے طبیب کے گھر آنکھ کھولی تو بچپن ہی سے طب کا ذوق پیدا ہو گیا اسلئے اپنے وقت پر خود بھی زبردست طبیب ہوئے۔ وضع قطع عالمانہ کھی ہمیشہ سر پر عمامہ بندھا رہتا تھا نہایت ہی وجیہ اور بارعب شخص تھے۔

حکیم فخر صاحب مرحوم کے موجود ہونے کے سبب سے ابتدا ہم لوگوں کا انکی جانب کچھ زیادہ رجوع نہ تھا لیکن حکیم جعفری صاحب کے وصال کے بعد جب حضرت والا دوبارہ آباد تشریف لائے تو ایک موقع پر کسی کے توسط سے حکیم عثمانی صاحب بھی حضرت اقدس کے معاہدہ کے لئے بلائے گئے۔ حکیم صاحب تشریف لائے نسخہ لکھا، حضرت سے ملاقات فرمائی آدمی دیدار تھے دیدار گھر کے تھے اسلئے جتنا نفع حضرت والا کو ان سے پہنچا اس سے کہیں زیادہ فائدہ حکیم عثمانی صاحب کو حضرت اقدس سے ہوا۔ حضرت والا سے ملتے ہی حکیم صاحب حال بس اس کا مصداق ہو گیا تھا کہ

آہن کہ بیمار س آشنا شد فی الحال بصورت طلاء شد
حکیم صاحب چونکہ خود بھی اپنے فن کے کامل اور ماہر تھے اسلئے ان کے اندر ایک شان استغناء بھی پائی جاتی تھی لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ کیسے کیسے بڑے علماء اور مشائخ آئے لیکن حکیم صاحب نے کسی کی جانب رخ تک نہیں کیا چنانچہ مقامی علماء و مشائخ کو تو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن آخر میں آکر قابل ہوئے تو حضرت کے اور جھکے تو حضرت کے آگے جھکے۔ چنانچہ کھلی آنکھوں دیکھا گیا کہ حضرت اقدس کی ملاقات کا انکے قلب پر گہرا اثر ہوا اول ہی دن سے بڑی محبت بڑی عقیدت، بڑے ہی تادب کے ساتھ حضرت سے ملے اور ان کا ادب روز افزوں ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ حضرت والا کبھی کبھی خود بھی ان کے مکان پر صرف ملاقات کے لئے تشریف لیجاتے اور حکیم صاحب بڑی ہی نیاز مندی کے ساتھ ملتے چنانچہ حکیم صاحب موصوف جب حج بیت اللہ کو جانے لگے تو تاریخ روانگی کے دن حضرت والا نے اس خادم ہی کو رکشہ پر اپنے ہمراہ لیا اور فجر کے بعد ہی حکیم صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے حکیم صاحب اندر سے تشریف لائے اور درخواست کی حضرت کمرہ میں تشریف لے چلیں حضرت نے فرمایا کہ نہیں آج آپ کے سفر کا دن ہے سفر کی ضروریات اور مشغولیات زیادہ ہوتی ہیں میں بیٹھوں گا نہیں بس صرف آپ سے ملنے ہی آیا تھا اسلئے کہ اسٹیشن پر

کثرت ہجوم کے باعث ٹھیک سے ملاقات بھی مشکل ہو جاتی ہے بس آئیے مصافحہ کیجئے اور میرے واسطے دعا فرمائیے گا۔ حکیم صاحب نے بھی بڑی ہی لجاجت مصافحہ کیا اور دعا کی درخواست کی حضرت کا ہاتھ چوما۔ اور حضرت والا فی امان اللہ کہکروہاں سے مکان واپس ہو گئے۔ میں تو اس موقع پر موجود تھا ہی حکیم صاحب کے والد مولوی حکیم احمد حسین صاحب کے بارے میں ایسا ہی کچھ مشہور تھا اسی لئے حکیم صاحب کو ہم بھی اب تک خشک ہی سمجھتے تھے لیکن حضرت کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت اور بزرگوں جیسی محبت دیکھ کر معلوم ہوا کہ اجی کچھ نہیں بزرگوں کا تعلق چونکہ اللہ تعالیٰ سے صحیح ہوتا ہے اس لئے ساری ہی مخلوق کو ان سے انس ہو جاتا ہے اس میں مقلد غیر مقلد بدعتی حتیٰ کہ غیر مسلم کی بھی تخصیص نہیں اور اپنے حضرت اقدس کے ساتھ تو ہم نے ہی معاملہ مخلوق کا دیکھا کہ ایسی شان محبوبیت تھی کہ جو شخص بھی ایک بار زیارت کر لیتا تھا وہ دیکھتا ہی رہ جاتا تھا اسفار کے موقعوں پر اسٹیشن پر دیکھا جاتا تھا کہ ہر شخص خواہ وہ اپنا ہو یا پرانا ہو، مسلم ہو یا غیر مسلم ہو پبلک کا عامی آدمی ہو یا ریلوے کا کوئی ملازم سب کے سب جب حضرت کو دیکھ لیتے تھے تو دیر دیر تک دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔

حکیم صاحب موصوف کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوا کہ یا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکو کسی عالم اور بزرگ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یا تعلق ہوا تو ایسا کہ حکیم صاحب بالکل بدل ہی گئے۔ سچ ہے اللہ والوں کی ظرفیت اثر میں ایسی ہی تاثیر ہوتی ہے اور انکی صحبت میں ایسا ہی اثر ہوتا ہے بقول حضرت خواجہ صاحبؒ
دلے کو از دل او بستہ گردد اگر خارے بود گلستہ گردد

(جو دل کہ اس دل کے ساتھ بندھ جائے اگر گھاس و کانٹا بھی ہو تو ملکہ گلستہ ہو جائے گا) چنانچہ الحمد للہ حکیم صاحب بھی اس باب میں بہت ہی خوش نصیب ثابت ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ حکیم صاحب کا یہ سفر حج سفر آخرت بھی ثابت ہوا دیار محبوب میں جا کر وہاں سے واپس نہ آ سکے وہیں انتقال فرما گئے اور وہیں دفن ہوئے

اللہ تعالیٰ نے خاتمہ ایسا حسین فرما دیا جس کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہو ا کرتی ہے
 چورسی بکوائے دلبر بپار جان مضطر کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا
 یعنی جب محبوب کی گلی میں تم پہنچ جاؤ تو اپنی اس بیکار جان کو وہیں سپرد کر دو کیونکہ
 ہو سکتا ہے کہ شاید اب دوبارہ تم کو ایسا زریں موقع نہ میسر آ سکے۔ سنا گیا ہے کہ
 حکیم صاحب مرحوم اپنے اس سفر میں جانے سے پہلے یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ یا اللہ
 اب آپ نے اپنے در پر حاضری کی توفیق دی ہے تو ہند میں واپس نہ لانا اور اس
 ستھرے ماحول سے اس دنیوی ماحول میں ملوث نہ فرمانا۔ اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب
 کی یہ دعا سن لی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جا کر پھر واپس نہ آ سکے۔ حج سے فراغت کے
 بعد غالباً رمی جمار کے موقع پر گر پڑے چوٹ آگئی اور وہی بہانہ بن گئی دنیا سے
 روانگی کا۔ ع۔ خدا یہ موت دے سب کو ہم اس مرنے پر مرتے ہیں۔

حکیم عثمانی صاحب باوجود متعدد بار آنے جانے کے کبھی حضرت اقدس کے
 سامنے بالکل خاموش ہی رہتے تھے طبی ضروریات سے کوئی بات دریافت کرنی ہوئی
 تو کر لیا بس اسکے بعد کچھ نہیں بھیا کہ اس زمانہ کا دستور ہو گیا ہے کہ بزرگوں کے پاس
 لوگ جائیں گے تو مقصد یہ ہو گا کہ ان سے ذرا تبادلہ خیالات کیا جائے گا۔ یہی
 بے ادبی لوگوں میں آگئی ہے جس کی وجہ سے بزرگوں کے فیض سے محروم رہتے
 ہیں ورنہ ۵

اسکے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا
 لیکن حکیم صاحب نے اپنی خاموشی میں پالا مار لیا۔ اپنے اس معمول کے خلاف
 البتہ ایک بار حکیم صاحب موصوف حضرت والا سے بولے اور دو بد و گفتگو فرمائی
 وہ کبھی سینے، ہوا یہ کہ حضرت کو رعاف کا دورہ پڑا۔ بڑا خون نکلا اور برابر نکلتا ہی رہا
 ایک دن میں متعدد بار دورہ پڑنے لگا جسکی وجہ سے متعلقین گھبرا گئے حتیٰ کہ خود حضرت
 بھی تردد میں پڑ گئے کہ خون اتنا اتنا نکل رہا ہے انجام کیا ہو گا۔ اسلئے نزدیک و دور
 ہر جگہ کے مخصوص اطباء جمع ہو گئے چنانچہ ایک موقع پر بمبئی سے حکیم جمیری صاحب

لکھنؤ سے حکیم خواجہ شمس الدین صاحب - جون پور سے حکیم منظور احمد صاحب - دیوبند سے حکیم محمد عمر صاحب - علی گڑھ سے حکیم افہام اللہ صاحب اور ان کے علاوہ اور بہت سے حکما جمع ہو گئے۔ سارے اطباء تشخص مرض اور تجویز نسخہ میں ہمہ تن مصروف تھے باہم مشورہ بھی ہو رہا تھا اور حضرت والا کے حکم سے طب کی کتابیں بھی دیکھی جا رہی تھیں کیونکہ حضرت کا علاج عام طبیب کے بس کی بات نہ تھی۔ دریافت فرماتے تھے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اسکو کسی طب کی کتاب سے مبرا ہن بیان کرو اور مجھے بھی وہ موقع دکھلاؤ۔

اب جن حضرات نے وہ منظر دیکھا ہے وہی جان سکتے ہیں کہ کیا منظر ہوتا تھا۔ حضرت کی علالت بھی بڑے بڑے اطباء کے لئے مستقل ایک طبی امتحان ثابت ہو جاتا تھا۔ اسباب و علل کی تقریر اور اس کے علاج کو مدلل طریقہ پر حضرت کو سمجھانا اور مطمئن کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ کتب طب کا مطالعہ جاری تھا کہ اسی اثناء میں کسی مسلم طبیب کی یہ عبارت ملی کہ "مرض رعاف کے سلسلے میں کبھی مریض کی ناک سے خون کا فوارہ نکلتا ہے اور اتنا زیادہ اور اس قدر نکلتا ہے جیسے کوئی بکرا ذبح کر دیا گیا چنانچہ اسکی وجہ سے مریض بھی گھبرا جاتا ہے اور لوگ بھی ہراساں ہو جاتے ہیں" لوگوں نے حضرت کو عبارت دکھلائی تو مرض کی جانب سے اطمینان ہوا۔ اسکے بعد علاج کے لئے اطباء کیا کہتے ہیں تلاش کرو اسکا مطالبہ شروع ہوا۔

بہر حال رعاف سے الحمد للہ سکون ہوا تو ہچکی کے مرض نے اسکی جگہ لے لی۔ اب اطباء کے لئے تحقیق کا یہ موضوع بن گیا۔ الحمد للہ اسکی طرف سے بھی اطمینان ہوا تو باہر کے اطباء اجازت لیکر اپنے اپنے وطن تشریف لے گئے اور یہاں یہ طے ہوا کہ حضرت اقدس کو ضعف بہت ہے اور اندیشہ ہے کہ رعاف یا ہچکی کا مرض عود کر آئے اسلئے حضرت والا بغرض علاج کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ تشریف لیجائیں اور وہاں شمس الاطباء جناب شمس الدین صاحب کے نگرانی

آپ کا علاج ہو۔ اطباء کی بھی رائے ہوئی اور گھر کے لوگ کبھی اس پر تیار ہو گئے اور حضرت والا سے رضامندی بھی حاصل کر لی گئی مگر اس تجویز کی اطلاع حکیم عثمانی کو نہیں ہوئی حکیم صاحب کو اُس دن معلوم ہوا جس دن کہ حضرت والا کی لکھنؤ کو روانگی تھی۔ چنانچہ اس دن صبح حکیم صاحب تشریف لائے حضرت سے ملے اور حضرت کی شدید علالت اور قصد سفر پر رنج و انوس ظاہر کرتے ہوئے حضرت والا سے اتنا کہا کہ — حضرت بنا ہے کہ لکھنؤ جانے کا قصد فرمایا ہے مجھے پہلے سے اطلاع ہوتی تو اصرار کر کے روکتا۔ اب تو آپ بالکل پابہ رکاب ہیں کیا عرض کر سکتا ہوں ہاں مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ نے جب ارادہ ہی فرمایا ہے تو جیسے خدا حافظ لیکن حضرت لکھنؤ میں کوئی دوسرا خدا نہیں ہے اور اطباء میں احمد عثمانی سے زیادہ لائق کوئی طبیب بھی نہیں ہے۔ طبیب کی خدمت درکار ہو تو خادم حاضر ہی ہے اور جو خدا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے اسلئے ضرورت سفر فرمانے کی تو نہ کبھی آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ اس قدر توحید میں ڈوبا ہوا جملہ شیخ و متبع نے جب سنا ہوگا تو قلب پر کیا گزر گئی ہوگی، حضرت بالکل خاموش تھے اور حکیم صاحب بھی اتنا کہہ کر قطعی خاموش ہو گئے۔

باقی اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ کی آب و ہوا میں بھی کچھ خاصیت رکھی ہے اتنے دنوں الہ آباد کا تجربہ کرنے کے بعد خیال گذرا ہوگا کہ شاید وہیں سے صحت مقدر ہو اس لئے حضرت اقدس نے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور الحمد للہ کہ صحت یاب ہو کر تشریف لائے۔

۳ — اوپر کہیں ذکر حکیم جمیری صاحب کا آیا ہے آپ بھی پہلی بار حضرت سے ملنے الہ آباد ہی تشریف لائے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ میں حضرت تھانویؒ کا معتقد کیا بلکہ عاشق تو تھا ہی مگر حضرت کے خلفائے میں سے حضرت شاہ وصی اللہ صاحب سے واقف نہ تھا بمبئی میں میرے پاس بھائی ظہیر احمد صاحب کا تب اعظمی تشریف لایا کرتے تھے ایک دن انھوں نے چن دکتا بچے مجھے دے دیے کہ ہمارے حضرت کے یہ رسالے ہیں انھیں ملاحظہ فرمائیے میں نے اخلاقاً اُن سے

لے تو لے لیکن دل میں یہی کہا کہ ایسے ایسے بہت سے رسالے دیکھ چکا ہوں اور اخلاق و تصوف پر اب ہمارے حضرت تھانوی کے بعد کیا کوئی لکھے گا۔ پھر ان کے جانے کے بعد سوتے وقت میں نے کہا کہ لاؤ دیکھوں تو سہی شاہ صاحب نے ان میں کیا لکھا ہے اور انکو دیکھنے لگا سب سے پہلے جو رسالہ اٹھایا تو اس میں یہ مضمون ملا کہ انسان جب عاجز ہو کر کسی انسان ہی سے کچھ طلب کرنا چاہے تو کیوں اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرے ایسا کر کے تو دیکھے کہ اللہ تعالیٰ اسکی دعا قبول فرماتے ہیں یا نہیں۔ میں ان دنوں اپنی ایک پریشانی میں مبتلا تھا وہ یہ کہ جس مکان میں اب ہوں وہ مکان فروخت ہو رہا تھا اسکے خریدنے کیلئے پاس پیسہ نہیں تھا اس لئے سوچ رہا تھا کہ آخر کس طرح کامیابی ہو اور کس سے مانگوں اور کس سے نہ مانگوں۔ اس حیرانی و پریشانی کے وقت شاہ صاحب کے ان الفاظ نے کیا کام کیا اسکو میں ہی جانتا ہوں میں نے ارادہ کر لیا کہ بس اب کسی مخلوق سے عرض دعا نہیں کروں گا اور جو کچھ مجھے کہنا ہے اپنے اللہ تعالیٰ ہی سے کہوں گا۔ چنانچہ دعا کرنی شروع کر دی سچ جانیئے کہ بس چند ہی یوم میں اللہ تعالیٰ نے روپیہ کا بندوبست فرمادیا اور مجھے کسی سے ایک لفظ نہیں کہنا پڑا اس سے مجھے حضرت شاہ صاحب کی قدر ہوئی اور میں نے سمجھا کہ ہاں یہ واقعی بزرگ شخص میں اور انھوں نے حضرت تھانویؒ سے کچھ سیکھا ہے اس طرح سے حضرت سے تعلق غائبانہ ہوا اور پھر میں نے حضرت کو خط لکھا۔

اسی طرح سے ایک دفعہ یہ ہوا کہ یہی بھائی ظہیر احمد صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ ہم چند لوگ کل الہ آباد جا رہے ہیں کہیے تو آپ کے لئے بھی ٹکٹ لے لوں۔ میں نے کہا کہ جی تو میرا بھی حضرت سے ملنے کو چاہتا ہے مگر اتنی جلد کیسے تیاری ہو سکتی ہے؟ انھوں نے کہا ٹکٹ لئے لیتا ہوں نہ تیار ہو سکے گا تو آپس ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے تیاری کر لی اور الہ آباد حاضر ہو گیا۔ حضرت مجھ سے واقف ہوئے تھے اسلئے الگ کمرہ میں ٹھہرنے کا بندوبست فرمادیا اور اپنے ایک داماد کو میرے اوپر

مستقلاً مقرر فرمادیا کہ دیکھو حکیم صاحب کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اوقات مجلس میں یا جب حضرت طلب فرماتے حضرت کے پاس حاضر ہو جاتا اور بقیہ اوقات اسی کمرہ میں رہتا جس میں ہر قسم کی راحت کا سامان حضرت نے مہیا فرمادیا تھا۔

پھر اسکے بعد تو حضرت سے خاصا تعلق ہو گیا جس کے سبب الہ آباد کی بارہا ضروری ہوئی اور آخر میں تو حضرت بمبئی بھی تشریف لے گئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یا تو حکیم صاحب ایسے مستغنی واقع ہوئے تھے کہ انکا کسی کی جانب رجوع ہونا مشکل معلوم ہوتا تھا اور یا جب سے تعلق ہوا تو اپنے کو اس طرح پیش کر دیا کہ تمام اہل بمبئی انگشت بندھاں تھے کہ یہ حکیم صاحب اس قدر کیسے بدل گئے حضرت والا بھی اپنے زمانہ قیام بمبئی میں تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن ان سے ملنے ان کے مکان تشریف لے جاتے ایک مرتبہ حضرت والا کو اچانک کچھ تکلیف ہو گئی وہ یہ کہ جب ذرا نیند آتی تو بڑے زور سے چونک جاتے تھے حکیم صاحب کو طلب فرمایا حکیم صاحب تشریف لائے دوائیں استعمال کرائیں اور امتحان کی غرض سے رات بھر جاگتے رہے کہ دورہ پھر تو نہیں پڑتا حالانکہ اپنا گھر چھوڑ کر کسی کے یہاں شب کو رہنے کی اس سے قبل کوئی مثال نہیں تھی، دوسرے دن بھی غالباً قیام فرمایا جب اطمینان ہو گیا کہ دورہ نہیں پڑیگا تب مکان تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب سے اور جناب قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے کچھ قریبی رشتہ بھی تھا اسلئے جناب قاری صاحب اکثر حکیم صاحب موصوف کے یہاں تشریف لاتے تھے چنانچہ ایک بار جب دیوبند کے مدرسہ کے حالات کچھ دگرگوں ہوئے تو بیمار ہو کر حضرت مہتمم صاحب بمبئی تشریف لائے تو حضرت والا کو جناب مہتمم صاحب کی علالت کی سخت فکر ہو گئی فرمایا کہ آپ یہیں بمبئی میں رہیے میں آپکا علاج کراؤں گا اور حکیم صاحب موصوف اور ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب کو متعین فرمایا کہ آپ دونوں حضرات کی نگرانی اور مشورہ سے قاری صاحب کا علاج ہوگا۔

چنانچہ اس خبر پر دیوبند سے نائب مہتمم صاحب علامہ ابراہیم بلیاویؒ کے اور بعض حضرات کے خطوط حضرتؒ کے پاس بطور مدیہ تشکر کے آئے حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس سے حقیقی خوشی تو مجھے اس وقت ہوتی جب آپ حضرات کے بجائے طلبہ کی جانب سے میرے پاس کوئی تحریر طلب خیریت کی آتی کیونکہ کسی مدرسہ کے مہتمم کی کوئی خدمت دراصل ان طلبہ کی بھلی خدمت ہے جو ان کے زیر اہتمام تسلیم پا رہے ہوں۔ اس سے اندازہ فرمائیے کہ حضرت مصلح الامۃ حضرت مہتمم صاحبؒ کی ذات والا صفات کو کس درجہ قابل احترام اور لائق تعظیم سمجھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسا انکی اسی نسبت کی وجہ سے تھا جو بزرگوں سے انکو حاصل تھی۔ بہر حال بزرگوں نے اپنے عمل سے اسکا ثبوت دیا کہ کسی نسبت کا کوئی شخص حامل ہو کہ خود بھی کس قدر لائق تعظیم ہو اکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت اقدسؒ اس مزاج کے بھی نہ تھے کہ کسی انسان کو معصوم سمجھتے ہوں مدرسہ کے اندرونی معاملات میں دخیل بھی نہ تھے تاہم ان سب باتوں کے باوجود اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ حضرت قاری صاحب اپنی ذات سے بھی اور اپنی نسبت کی رو سے بھی بڑے شخص ہیں اور مغتلمات زمانہ سے ہیں اب ان کے بعد لوگ ان کے جیسا بھی نہ پاسکیں گے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید حضرت حکیم الامتہؒ نے مدرسہ کو جس حال میں دیکھنا چاہا تھا اپنا زمانہ کو وہ پسند نہ ہوا پھر اب حضرت مصلح الامتہؒ نے بھی جو چاہا اسکے خلاف ہی میں لوگوں کی مصلحت معلوم ہوئی چنانچہ حضرت قاری صاحب کو ہٹا دینے کے بعد بھی سنا ہے کہ وہاں کا عملہ چین سے نہیں ہے اور ایک ایک کر کے تمامی باہمی اختلافات رونما ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہی دارالعلوم کی حفاظت فرمائے۔

میرا مقصد یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ جس طرح سے حکیم صاحب صوف کو حضرت اقدسؒ کی صحت کا لحاظ تھا تو حضرت والا نے بھی عجب نہیں کہ اسی کا صلہ ادا فرماتے ہوئے حکیم صاحب کے عزیز خاص یعنی سمدھی حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ یہ معاملہ

فرمایا ہو چنانچہ حضرت قاری صاحب کے معالجہ پر اسقدر توجہ فرمائی کہ اساطین دیوبند کو بھی اسکا اندازہ ہو کر تشکر نامہ ارسال کرنا پڑا مثلاً اسی موقع پر جناب سید مبارک علی صاحب نائب ہتتم دارالعلوم دیوبند نے حضرت والا کو یہ عریضہ تشکر ارسال فرمایا کہ

”حضرت مولانا محمد طیب صاحب زید مجدد ہتتم دارالعلوم دیوبند کا

گرامی نامہ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ کو موصول ہوا اس سے معلوم ہوا کہ

الحمد للہ حضرت ہتتم صاحب کی طبیعت نسبتاً اچھی ہے دوا اور پرہیز کا

سلسلہ جاری ہے نیز یہ معلوم ہوا کہ حضرت ہتتم صاحب کے علاج

کے سلسلہ میں آنجناب کو بہت زیادہ اہتمام ہے اور نہایت محبت

سے حضرت ہتتم صاحب کی طرف متوجہ ہیں۔ غایت درجہ مسرت اور

طمانینت حاصل ہوئی اور اس عریضہ تشکر کے ارسال خدمت کرنے کا

داعیہ قلب میں پیدا ہوا۔ ہم سب خدام دارالعلوم اس کے لئے ممنون اور

تشکر گزار ہیں امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آنجناب کی روحانی توجہات سے

جلد مرض کا ازالہ ہو جائے گا اور حضرت ہتتم صاحب عنقریب جمعیت فرمائے

دیوبند ہو جائیں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ اپنی جماعت میں جناب والا کی ذات گرامی معتقدات

میں سے ہے اللہ تعالیٰ تادیر اس ظل عاقل کو قائم رکھے۔ گو جناب والا

بندہ سے واقف نہیں لیکن احقر عرصہ سے جناب کے عقیدت کیشوں میں

شامل ہے۔ دعار کے لئے مستعدی ہے۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت

ہو۔ والسلام

نیاز کیش۔ بندہ سید مبارک علی

(نائب ہتتم دارالعلوم دیوبند - ۲۳ ۳/۲ ۱۳۸۷ھ)

اسی موقع پر ایک دوسرے حضرت علامہ بلیاویؒ کا خط بھی آیا ملاحظہ فرمائیے

”پرسوں یا نرسوں ایک ملفوف عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں۔“

آج یہ عریفہ خاص مقصد کے لئے لکھ رہا ہوں۔ معذرا! یہ معلوم کر کے
از حد مسرت ہوئی کہ آنجناب نے حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم
کے حصول صحت و بقائے ذات میں کمال توجہ اور التفات تامہ کام لیا ہے۔
علاج اور وہ بھی پر از کمال طبیب سے کرایا ہے۔ اگرچہ جناب نے اغوت روحانی
اور حفاظت دارالعلوم کا حق ادا کیا ہے مگر آنجناب کا یہ عمل
جماعت دارالعلوم پر جس میں جناب بھی داخل ہیں بڑا احسان ہے۔ اسلئے
احقر اور پوری جماعت مدیہ تشکر خدمت اقدس میں پیش کر کے مزید توجہ
کے متمنی ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ ہاتھ میں طاقت نہیں۔ والسلام۔

محمد ابراہیم ۲۸/۳/۱۳۷۷ھ

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ حضرت مہتمم صاحب کی ذات گرامی حضرت اقدس کے نزدیک۔
اور ان دونوں بزرگوں کے نزدیک (جن میں سے ایک نائب مہتمم اور دوسرا
صدر المدرسین دیوبند ہے) کتنی عزیز اور کس قدر گرامی شخصیت تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ
کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہ ان حضرات کے نزدیک مہتمم دارالعلوم کے واحد فرد
تھے۔

حضرت اقدسؒ نے ان دونوں خطوط کا یہ جواب مرحمت فرمایا:۔
"کل کی ڈاک سے جناب سید مبارک علی صاحب نائب مہتمم مدرسہ
دارالعلوم کا اور آج کی ڈاک سے جناب والا کا مکتوب گرامی حضرت
مہتمم صاحب کے علاج کے سلسلہ میں بطور تشکر کے آئے۔ علاج تو
حضرت مہتمم صاحب کا جناب حکیم جمیری صاحب اور ڈاکٹر اسحاق صاحب
کر رہے ہیں جنکا شکریہ تمام جماعت کی جانب سے ادا کرنے کے لئے
میں خود کافی بٹھا چنانچہ میں تو ان حضرات کا شکریہ تقریباً روزانہ ہی
ادا کر رہا ہوں۔ آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا اس سے کہیں زیادہ خوشی مجھے
اسوقت ہوتی جب آپ کے بجائے ان طلبہ کے خطوط جناب مہتمم صاحب

کی دریافت خیریت و دعا رگوئی کے لئے آتے جو کم از کم مجھ سے
تعلق و محبت رکھتے ہیں، اس لئے کہ حضرت مہتمم صاحب کی بیماری کا
سبب طلبہ ہی بنے ہیں تو جن لوگوں سے بیماری آئی ہے انہیں
لوگوں کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں تواظہار نیاز مندی
اور وساطت صحت کے لئے تشکر زیادہ زیب دیتا۔ اس سے زیادہ
کیا عرض کروں۔ والسلام خیر ختام بخود کم۔

وصی اللہ عفی عنہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ

حضرت قاری صاحب کے معالجہ کا ذکر حکیم صاحب موصوف کے ذکر میں
ضمناً آگیا ورنہ تو اصل ذکر حکیم صاحب کا ہو رہا تھا۔ آپ گنگوہ کے رہنے والے تھے
اور آپ کے والد حکیم سعید صاحب یا دادا جناب حکیم محمد اسماعیل صاحب مرحوم و مغفور
کچھ دنوں اجمیر رہے پھر وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے اور وہیں رہنے ہی لگے
چونکہ اجمیر سے بمبئی تشریف لے گئے اسلئے وہاں بمبئی میں حکیم اجمیری کے نام سے
مشہور ہوئے۔ ان کے بعد پھر ان کے صاحبزادے جناب حکیم مسعود صاحب کو بھی لوگ
اجمیری کہنے لگے اور ان کے بھی بعد ان کے دو صاحبزادگان حکیم مولوی سعد رشید صاحب اور
حکیم مولوی مسعود صاحب کو بھی لوگ حکیم اجمیری کے لقب سے پکارتے ہیں۔ بہر حال
جس طرح سے سعد کا مادہ اس خاندان کے مرد و عورت کے اسرار کا جزو لازم سا
ہو گیا اسی طرح سے اجمیر کی جانب نسبت بھی لازم سی ہو گئی اگرچہ وطن آپکا گنگوہ تھا۔
چونکہ بڑے حکیم صاحب حکیم سعید صاحب کا تعلق حضرت حکیم الامتہ
سے تھا اسلئے حکیم مسعود صاحب کو بھی گویا حضرت تھانوی سے پیدائشی عقیدت
تھی۔ حضرت اقدس مولانا تھانوی بھی بڑے حکیم صاحب کا بیجا ادب فرماتے
تھے اور ان حکیم صاحب کو تمانند اپنی اولاد کے مانتے تھے اسلئے بھی کہ آپ کا
خاندانی سلسلہ حضرت اقدس قطب عالم مولانا عبد القدوس صاحب گنگوہی سے ملتا تھا۔
اس نسبت پر حکیم مسعود صاحب معروف بہ حکیم اجمیری صاحب کا ایک واقعہ

جو یہاں کے لوگوں سے سنا ہے یا دیا عجیب واقعہ ہے :

جن دنوں حضرت والا پر بُر عاف کا دورہ پڑا تھا اور علاج کے سلسلے میں حکیم
اجمیری صاحب بھی بمبئی سے طلب کئے گئے تھے تو ایک مرتبہ حکیم صاحب کے سامنے
ہی حضرت کو بہت خون آیا ایسا کہ حکیم صاحب بھی پریشان ہو گئے رطبی اصول کے تحت
جو پرہیز ہونا چاہئے تھا اس میں حکیم صاحب نے کچھ کمی پائی مثلاً یہ کہ ایسی حالت
میں مریض کو بالکل آرام و رکارہ ہے ۔ تنہائی میں آئے ہوئے لوگوں سے گفتگو کرنا
تو الگ رہا ان سے ملاقات کرنے میں بھی کمی رکھی جائے ۔ یہ سب ہونا چاہیئے تھا
یہاں حال یہ تھا کہ حضرت والا غیر اوقات دورہ میں لوگوں سے اسی طرح سے ملتے
بھیسے عام قاعدہ تھا ۔ گفتگو فرماتے اس میں تیزی بھی ہو جاتی مواخذہ اور عتاب بھی
فرماتے ۔ یوں منع کرنے کو سب ہی اطباء اور ڈاکٹر نے حضرت کو اس سے منع کیا
لیکن حضرت یہ فرماتے تھے کہ میرے پاس لوگ آویں گے تو مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا
کہ میں چپ پیر بن کر بیٹھ جاؤں میں ضرور بولوں گا اور انکی اصلاح کروں گا ۔ لوگ
میرے پاس آویں اور میں یونہی ٹک ٹک ویدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنار ہوں
اس سے مرجانا بہتر سمجھتا ہوں ۔ بولنے سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ خون
آجائے گا آئے ۔ مر جاؤں گا مر جاؤں آخر مرنا تو ایک دن ہے ہی ۔ اور لوگ تو
اس تقریر کے بعد خاموش ہو جاتے تھے لیکن حکیم صاحب چونکہ بڑے طبیب تھے
اسلئے انھوں نے بھی محسوس کیا کہ حضرت کو مکمل آرام فرمانے کی ضرورت اس لئے
اس دن ذرا پریشان ہو کر یہ فرما دیا کہ اگر حضرت کا یہی حال رہے گا تو صحت مشکل ہے
حضرت نے بھی سنا کہ حکیم صاحب کچھ فرما رہے ہیں ۔ فرمایا کہ حکیم صاحب کیا فرما رہے
ہیں ؟ یہ سن کر حکیم صاحب ہی خود بولے کہ حضرت اگر آپ اسی طرح سے کام جاری
رکھیں گے بولیں گے خفا ہوں گے تو خون پھرا جائے گا تھوڑی مدت اس گفتگو کو
بند رکھا جائے ۔ چونکہ حکیم صاحب کا یہ لہجہ حکیمانہ کے بجائے ذرا حاکمانہ انداز اختیار
کر گیا تھا اس لئے حضرت نے فرمایا کہ میں تو بولوں گا دیکھیں تو خون کیسے آتا ہے ؟

اسپر حکیم صاحب تو یہ کہہ کر اپنے قیام گاہ پر چلے گئے اور حضرت والا خاموش ہو گئے۔
 خدام ششدر کہ یا اللہ یہ گفتگو تو آج گڑبڑ ہوئی۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ گزرنے پر حضرت
 والا نے کسی خادم کو حکیم صاحب کے پاس بھیجا اور فرمایا حکیم صاحب خون دوبارہ
 تو نہیں آیا۔ پھر آدھ گھنٹہ گزرنے پر دوسرے کو بھیجا کہ حکیم صاحب سے جا کر کہو کہ
 خون تو نہیں آیا۔ تیسری بار پھر کہلوا یا۔ حکیم صاحب یہ سن کر حضرت والا کی خدمت
 میں خود حاضر ہوئے اور منظر کو سمجھ کر دور کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضرت!
 میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ قانون طب کے اصول اور تاعدہ کے ماتحت
 عرض کیا تھا باقی میں الحمد للہ اولیاء اللہ کی کرامات کا منکر نہیں ہوں (مطلب یہ کہ اب
 کسی کو اگر ان حالات میں خون نہ آئے تو یہ اسکی کرامت ہے۔ میں اسکا منکر نہیں ہوں۔)
 اس طرح سے گویا اپنی اس فی الجملہ تیز کلامی کی معافی طلب فرمائی۔ حضرت والا کو
 یہ جملہ سن کر ہنسی آگئی۔ پاس بلایا اور فرمایا کہ حکیم صاحب آج خیر ہو گئی اسوقت
 آپ کی اس بات پر میں نے تو آپ کو کچھ کہہ دیا ہوتا لیکن قطب عالم حضرت عبدالقدوس
 گنگوہی کی روحانیت آڑے آگئی اسلئے زبان سے کچھ نکل نہ سکا۔ اس سے
 حکیم صاحب کی بھی اصلاح ہو گئی اور ہم لوگوں کے لئے اہل اللہ کا ایک ادب
 معلوم ہوا کہ وہاں تو انسان کو صر۔ "مجھے تو خوش ہے کہ ہر بات پر بجا کہیے" کا
 مصداق ہونا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ

نہ ہر جائے مرکب تو اں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن
 یعنی "ہر جگہ گھوڑے دوڑانے سے کام نہیں چلا کر تا کوئی کوئی جگہ ایسی بھی ہوتی ہے
 جہاں سپر ڈال دینی چاہیے"

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مصلح الامۃ کی علالت کو اللہ تعالیٰ نے بہت
 سے اطباء کے لئے انکی باطنی صحت کا ذریعہ بنا دیا تھا، ہمارے حکیم اجمیر جی صاحب
 نے بلاشبہ حضرت والا کا معالجہ نہایت ہی خلوص کے ساتھ فرمایا چنانچہ اسی کے
 بقدر اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدسؒ کے فیض سے بھی حکیم صاحب مرحوم کو حصہ وافر عطا

نرمایا اس سلسلہ میں حکیم صاحبؒ کے دو خط پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

حال : ”کینہہ خدام کفش بردار مسعودی عنہ بادب و نیاز عرض گزار ہے کہ رسالہ میں ملفوظات عالیہ ہمیشہ ہی بے بہا جواب ہوتے ہیں مگر تصوف کے عنوان سے ملفوظ عالی ایسا عجیب و غریب ہے کہ بیان ہنیکہ جاسکتا عمری ماحول میں گزری مگر اس عنوان پر ایسا جامع اور شافی وافی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ نہایت ہی عجیب و غریب استدلال ہے (مثلاً) ”اسم محدث ہے تو مسیٰ تو محدث نہیں۔ اور غل و غش کی وجہ سے تصوف کا رد و انکار ہے تو اصل صورت میں اسلام ہی کب باقی رہ گیا ہے“ بہت ہی عمدہ اور مسکت دلیلیں ہیں اس پر مستزاد حوالے اور امام مالکؒ کا قول تصوف کے متعلق ذکر فرمانا یہ امور سونے پر سہاگہ ہیں۔ آنے جانے والوں کو سناتا ہوں۔ محفوظ ہوتا ہوں محفوظ کرتا ہوں۔

یہ مضمون پورا آجائے تو دل چاہتا ہے کہ ایک جلد خادم زادے سعودیہ کو مدینہ طیبہ بھیجوں حق کے جویاں وہاں بہت ہیں۔ خیال تھا کہ علامہ مودودیؒ کو بھی بھیج دوں مگر وہ شخص حق کے جویا معلوم نہیں ہوتے۔“

والا نامہ ملفوفہ صادر ہو گیا۔ سوال میں حاضری کی آرزو اور ارادہ ہے تحقیق : ”ملفوظات پر جو آپ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے بہت مستر کا موجب بنا آپ کی قدردانی سے بڑا لطف آیا۔ نقل کر رہا ہوں تاکہ دوسروں کے لئے بھی مفید ہو۔“ والسلام وصی اللہ عنہ (ازر حشر ۱۱)

(حکیم اجمیری صاحبؒ کا دوسرا خط بنام مصلح الامۃ)

حال : افاضات عالیہ میں ہر فیض اور ہر ملفوظ لا جواب اور بے مثال ہوتا ہے

مگر نسبت صوفیہ یہ ملفوظ عالی تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی خادم کو سامنے بٹھلا کر بیان فرمایا جایا ہے نہایت پر مغز اور بہت عظیم الشان اور انتہائی جلیل القدر علم ہے اور بڑے انوکھے اور دشین انداز میں اسے تعلیم فرمایا گیا ہے۔ ہفتہ وار مجالس میں اسے ہی بیان کر رہا ہوں اور اس دل کی لگن کو بڑی لگن کے ساتھ لوگ سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات کبھی ذہن میں بھی نہیں آئی تھی اور اب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے جانتے ہیں قالوا ہذا الذی رزقنا من قبل کتنا صحیح اور انوکھا مصداق ہے۔ ہدایہ

تحقیق: آج ارادہ کر رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں کہ آئیے تشریف لائیے ملاقات کو طبیعت چاہتی ہے کہ اتنے میں آپکا محبت نامہ ملا۔ مضمون کے متعلق اپنے جو کچھ تو میں تو آپ ہی کے خاندان کا خوشہ چین ہوں میری کیا حیثیت باقی یہ مضمون نسبت صوفیہ جو آپ کو پسند ہو تو اس نسبت کی برکت سے جو اپنے اسلاف آپکو حاصل ہو و السلام۔ وصی

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت حکیم صاحب موصوف کی مکاتبت۔ اتنا بڑا شخص اور خود کو حضرت اقدس کے سامنے کس قدر فناء کئے ہوئے ہے۔ ایسا وسیع النظر انسان جو بزرگوں کی صحبت بھی اٹھا چکا وہ حضرت کے مضامین کی تعریف ان لفظوں میں فرماتے کہ ”ایسا شافی وافی مضمون نظر سے نہیں گذرا“ اسی اندازہ فرمائیے کہ کس درجہ حضرت کے فیض سے حصہ پایا تھا کہ علامہ مودودی تک ان مضامین کو پہونچانے کا داعیہ پیدا ہو گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ حضرت اقدس کی تصنیف یعنی ”رسالہ تصوف اور نسبت صوفیہ“ ہے ہی اسی شان کی چنانچہ بیوقت ہمارے حضرت نے اسکا کچھ حصہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کو جبکہ وہ حضرت والا کے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے راقم کے واسطے سے سنوایا تھا تو انھوں نے بھی برجستہ سی فرمایا کہ ارے ابھی ابھی مجھ سے ملنے کیلئے یہاں مولوی ابواللیث آئے تھے یہ آپ کے بڑے کام کی چیز تھی ہو سکتا تھا کہ انکو اس سے نفع ہوتا۔ اسی نوع کا تاثر ہمارے حکیم جمیری صاحب کو ہوا کہ جی چاہتا ہے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے پاس بھی ہو کبھی جدوں کہ لو اب تصوف کا انکار کرو الغرض ان اطباء کے کرام کی بھی ملاقات حضرت اقدس سے چونکہ آبادی میں ہوئی اسلئے حالات آباد کے ذیل میں کچھ ذکر ان حضرات کا بھی آگیا۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ حضرت اقدس کا ورود با مسعود الہ آباد میں نومبر ۱۹۷۷ء کو "حسن منزل" میں ہوا تھا وہیں حاجی شفیع اللہ صاحب لیدر مرچنٹ کے مکان میں حضرت والا کا قیام رہا اور اسکے متصل حاجی عبدالوہید صاحب ڈیری والے کے مکان میں حضرت کے متعلقین کا قیام تھا۔ اسی محلہ میں مجلس بھی ہوتی تھی طلبہ اور طالبین کا بھی قیام یہیں تھا۔ آنا فانا حضرت کا شہرہ شہر اور اطراف شہر میں عام ہو گیا ہر طرف سے لوگ آکر مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ مجلس کے لئے تو ماشاء اللہ حاجی شفیع اللہ صاحب کے بالاخانہ کا صحن خاصا وسیع تھا لیکن جس مکان میں صاحبزادیاں مقیم تھیں انہیں لئے چنداں آرامہ نہ تھا تاہم کسی نہ کسی طرح گزر ہوتا رہا کہ اسی عرصہ میں گرمی کا زمانہ آیا اور الہ آباد میں تاریخی قسم کی گرمی پڑی یوں تو الہ آباد ویسے بھی گرم جگہ سے سنگم پر اور دو دریاؤں گنگا، جمنا کے تین طرف سے شہر کو گھیرے ہوئے کے باوجود گرمی یہاں کافی پڑتی ہے لیکن امسال تو حد سے زائد گرمی پڑی جس کا اثر حضرت اقدس پر یہ ہوا کہ حضرت کے بھی تمام بدن پر گرمی دانے نکل آئے اور پھر دانوں نے ترقی کر کے چھالوں کی شکل اختیار کر لی جس میں بڑی جلن اور سوزش ہوتی تھی۔ تکلیف تو ایسی تھی لیکن سبحان اللہ حضرت بھی کوہ استقامت اور پیکر صبر و ضبط تھے کہ نہ تو کبھی مجلس ناغہ فرمائی اور نہ لوگوں کو اپنی اس تکلیف کا احساس ہونے دیا۔ ہوتا یہ تھا کہ مجلس کے ختم ہونے پر جب لوگ رخصت ہو جاتے تو حضرت والا کرتا اور بنیائیں اتار کر صرف تہبند باندھ کرہ میں ہو جاتے اور خدام دوایا پوڈر جو بھی ہوتا تمام بدن پر مل دیتے تھے۔ اس سے حضرت کو کچھ سکون ہو جاتا تھا۔ چونکہ صبح بعد الفجر کی تفریح میں ڈاکٹر صلاح الدین صاحب بھی ہمراہ ہوتے تھے اور حضرت والا کو ٹھنڈی جگہ کی تلاش تھی اسلئے ایک دن غالباً خود حضرت ہی نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب آج تمہارے گھر چلیں چنانچہ مجلس کے بعد فوراً مچھلی کو ٹھنڈی ڈاکٹر صاحب کے مکان پر حضرت والا تشریف لے گئے طلبہ کو اطلاع ہوئی کہ وہیں جا کر سبق پڑھیے چنانچہ

حدیث کا سبق وہی ہوا ڈاکٹر صاحب کا یہ مکان کرایہ پر تھا لیکن متعدد کمرے تھے اور سہ منزلہ بلکہ چار منزلہ تھا اسلئے نیچے کے کمرے میں سے باخصوص وہ کمرے جو دھوپ کے رُخ پر نہ تھے کافی ٹھنڈے تھے چنانچہ انہوں نے مکان کی پشت کی جانب گلی کا ایک کمرہ حضرت کے قیام کے لئے تجویز کیا اور اس میں حضرت اقدس کا پلنگ بچھا دیا اور مزید انتہام یہ کیا کہ کمرہ کی نالی بند کر کے اس میں پانی بھر دیا چار پانی کے پائے کے نیچے اینٹ لگا دی اور خدام اور ملنے والوں کے لئے کرسیاں رکھ دیں۔ حضرت والا کو اس نظم سے بہت آرام ملا۔ چنانچہ اب یہی معمول ہو گیا کہ مجلس فارغ ہو کر یہیں چلے آتے شام تک یہیں رہتے اور حضرت کے مکان سے کھانا یہیں آجاتا، طلبہ بھی یہیں آکر سبق پڑھتے اور حضرت والا مغرب کے وقت یہاں سے مکان واپس تشریف لیجاتے۔ شب کو صحن منزل ہی میں آرام فرماتے ڈاکٹر صاحب کا یہ مکان ڈھال والی مسجد محلہ بخش بازار سے قریب ہی تھا اسلئے کبھی کبھی حضرت عصر یا مغرب کی نماز پڑھنے اس مسجد میں بھی تشریف لاتے تھے اس کے متولی حاجی عبدالصمد صاحب مرحوم تھے ان کے چھوٹے بھائی حاجی عبدالستار صاحب حضرت کے مرید اور صحیح معنوں میں خادم خاص تھے۔ یہ میں نے صحیح معنوں میں اسلئے بڑھا دیا ہے کہ آجکل یہ لفظ بھی ایک خاص اصطلاح بن گیا ہے کہ خادم بمعنی مرید اور خاص بمعنی خلیفہ یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہو کہ کسی بزرگ کا خود کو خلیفہ ظاہر کرے تو وہ اس دعوے کو اس پر دے میں چھپا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں خادم خاص حضرت مولانا فلاں اس میں نفس کی ایک چال ہے معلوم ہوتی ہے کہ ادعائے خلافت سے کبھی محفوظ رہے اور مقصد کبھی حاصل ہو گیا کیونکہ کسی بزرگ کا کوئی اپنے کو خادم خاص کہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بزرگ کسی کو صحبت کا مجاز بنائے اور اسکی مصلحت ہوتی ہے کہ کاش لوگ مجھے مجاز بیعت سمجھتے تو بوقت اظہار نسبت لفظ صحبت کو حذف کر کے فلاں مجاز حضرت مولانا فلاں کہہ دیتا ہے۔ اب اس زمانہ

میں کتنے لوگ ہیں جو مجاز صحبت اور مجاز بیعت کے فرق کو سمجھتے ہوں اور قاعدہ یہی ہے کہ المطلق اذا اطلق يراؤ به الفرد الكامل پس صرف مجاز سے بھی لوگ مجاز کامل یعنی مجاز بیعت سمجھ لیں گے مقصد حاصل ہو جائیگا اگر کوئی واقف اعتراض کریگا تو جواب ظاہر ہے کہ ہم نے کب مجاز بیعت کہا ہے ہم نے تو صرف مجاز کہا ہے جو دونوں کو شامل ہے اب فرمائیے کیا اشکال ہے؟۔ چنانچہ حاجی عبدالستار صاحب فرماتے ہیں اس اصطلاحی معنی میں خادم خاص نہ تھے بلکہ واقعی نہایت مخلص خادم، بہت ہی مسکین صورت اور خوش مزاج اور نرم طبیعت انسان واقع ہوئے تھے اور دل سے ہر وقت یہ چاہتے تھے کہ حضرت پر کس طرح سے خود کو فدا کر دیں۔ جو تے کی دوکان تھی روزانہ کی بکری میں سے کوئی شرح مقرر کر رکھی تھی جو حضرت والا کو دین کے لئے صرف فرمانے کے لئے الگ دیتے تھے اور ذاتی یہ الگ دیتے تھے۔ چونکہ روزانہ کا یہ معمول تھا اسلئے اسکی جھلک ہم لوگوں کو بھی لگ جاتی تھی ورنہ ہم کو کیا معلوم کہ کون کیا دیتا ہے اور کیا لیتا ہے۔

اور ایک یہی خدمت کیا دیکھا جاتا تھا کہ حضرت والا نے گھر کی تمام ضروریات کی فراہمی کے لئے گویا انھیں کو منتخب فرمایا تھا اور حاجی صاحب نہایت خوشی اور انشراح کے ساتھ ہر کام کے لئے مستعد رہتے تھے۔ انھیں کے گھرانے میں مسجد کی تولیت تھی اسلئے مسجد کا انتظام بھی انھیں سے متعلق تھا اور یہاں کے دوسرے نمازیوں میں سے بھی بہت سے لوگ حضرت کے مرید اور معتقد تھے۔ امام مسجد ایک باہر کے رہنے والے بالکل سیدھے سادے نوجوان شخص تھے جو مدرسہ سبحانیہ میں جناب قاری محب الدین صاحب تجوید پڑھنے آئے تھے اور اس مسجد میں رہتے تھے نماز بھی پڑھاتے تھے اور چھوٹے بچوں کو کچھ تعلیم بھی دیتے تھے بعد میں حضرت والا سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ بہر حال حضرت اقدس جب اس مسجد میں پہلی بار تشریف لائے تب ہی سے یہ جگہ یہ محلہ یہ لوگ حضرت کو بہت پسند آگئے شاید اسی کا یہ اثر ہوا ہو کہ بعد میں چلکر حق تعالیٰ کی جانب سے یہی محلہ

حضرت والا کے قیام کیلئے تجویز کر دیا گیا اور مسجد بھی بعد میں اب حضرت مولانا کی مسجد عام طور سے کہی جانے لگی۔

حاجی عبدالستار صاحب اور دیگر اہل محلہ کے ساتھ انس و محبت نیز امام صاحب کی حسن قرأت کی وجہ سے حضرت والا بھی اب عصر و مغرب کی نماز اکثر یہیں ادا فرمانے لگے یہاں تک کہ ان حضرات کی خدمات سے متاثر ہو کر حضرت نے شب کا قیام کبھی کبھی مسجد کی باہری دوکانوں کی کھلی چھت پر فرمانا شروع کر دیا۔ امام صاحب کے زیر اہتمام عصر سے پہلے ہی خوب چھت ٹھنڈی کیجاتی تھی اسی پر چار پائی ڈال دی جاتی اور حضرت والا یہیں قیام فرماتے مجلس اب بھی حسن منزل ہی میں ہوتی تھی۔

اس درمیان میں حضرت کو یہ خیال ہوا کہ گرمی ایسی شدید پڑ رہی ہے لوگوں نے میری راحت کا تو انتظام کر دیا ہے لیکن میری بچیاں اور دوسرے لوگ تکلیف میں ہیں چنانچہ حضرت جب مکان تشریف لیجاتے تو برسبیل تذکرہ ذکر بھی آیا کہ یہ مکان دن میں تو تکلیف دہ ہوتا ہی ہے رات کو بھی نیند نہیں آتی کمروں کے آگے سائبان اور بارہ پرٹین کی چادر پڑی ہے جو دن رات تپتی ہے اسوقت حضرت والا کا احساس اور شدید ہو گیا اور اب حضرت نے پاس کے لوگوں سے کہنا شروع فرمایا کہ اب تو میں نے الہ آباد کو وطن بنا ہی لیا ہے لہذا یہاں اپنا کوئی مکان ہونا ضروری ہے اور اگر مکان لمجائے تو بہتر ورنہ کوئی پلاٹ ہی لمجائے تو لیکر اس پر مکان تعمیر کر لیا جائے

حضرت والا کی اس خواہش پر ہر خادم مکان یا پلاٹ کی جستجو میں لگ گیا حسن منزل کے لوگوں نے یہ چاہا کہ حضرت یہاں سے کسی اور محلہ میں نہ جائیں سوائے حاجی صاحبان نے اپنے اپنے مکان کی پیش کش کی لیکن حضرت نے فرمایا کہ بھائی اس مکان میں تو ہم مقیم ہی ہیں اور پھر بھلی تکلیف کی وجہ سے مکان کی تلاش ہے اب اگر آپ لوگ یہ مکان مجھے دے بھی دیں گے تو اس سے اصل تکلیف

کیسے رفع ہو جائیگی مکان تو وہی رہے گا صرف فرق یہ ہوگا کہ عاریت سے نکلکر ملکیت میں آجائے گا تو اسکا اثر رفع کلفت پر کیا ہوگا۔

حضرت والا کے سامنے جو کام ضروری آجاتا تھا دن رات اسکی ایک دھن سی ہو جاتی تھی اسلئے اب مکان کی ایک دھن تھی جو لگی ہوئی تھی اسی سلسلہ میں خدام سے فرمایا کہ بھائی جلدی کرو اگر زمین میں وقت ہوا اور واقعی اس پر مکان وغیرہ بنوانا وقت طلب ہوگا تو کوئی بنا بنایا مکان ہی تلاش کر لو چنانچہ ایک دن ہم لوگ حدیث کی کتاب لیکر سبق پڑھنے کے لئے حسب معمول پھیلی کوٹھی گئے ابھی سبق شروع نہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے آکر عرض کیا کہ حضرت یہاں قریب ہی محلہ ہی میں ہمارے ایک عزیز جو پھیلی شہر کے رہنے والے ہیں انکا مکان خالی ہے اور غالباً وہ اسکو فروخت بھی کرنا چاہتے ہیں مکان بہت بڑا ہے میرا دیکھا بلکہ رہا ہوا ہے وکیل صاحب گھر پر ہیں اگر مناسب سمجھیں تو چلکر ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سنکر حضرت فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم لوگوں سے فرمایا کہ چلو مکان دیکھتے آویں اسکے بعد سبق ہوگا۔

یہ مکان جناب وکیل ابوالحسن صاحب جعفری کا تھا جو راقم کے بھائی عزیز ہوتے تھے اور ہم لوگوں کے گھرانہ سے قدیمی رسم و راہ تھی آمد و رفت بھی رہا کرتی تھی اسلئے مکان میرا بھی دیکھا ہوا تھا۔ بڑا گھرانہ تھا مگر اب سب لوگ دوسری جگہ چلے گئے تھے صرف وکیل صاحب اور انکی اہلیہ یہاں رہ گئیں تھیں ڈاکٹر صاحب کے مکان سے شاید اسکا فاصلہ تین ساڑھے تین سو قدم سے زیادہ نہ ہوگا اسلئے حضرت پیدل ہی چل دیئے پیچھے پیچھے ہم سب طلبہ کی جماعت تھی ہمراہ ڈاکٹر صاحب تھے مکان پر پہنچکر دستک دی گئی صاحب خانہ نکلے حضرت اقدس سے ملے اندر پردہ کرایا اور فرمایا کہ حضرت تشریف لائیے۔ حضرت اندر تشریف لے گئے اور جتنا حصہ اس مکان کا خالی تھا اور فی الحال قبضہ میں آجاتا اسے ملاحظہ فرمایا آئیے آپ بھی اجمالاً اسکی سیر فرمائیے۔ مکان کا صدر دروازہ جنوب میں واقع

تھا شمال و جنوب اسکی لمبان تھی اور شرقاً و غرباً اسکی چوڑائی تھی۔ سڑک پر سے
 تین چار سیڑھیوں کے بعد باہر ہی لوہے کا چھڑو اور پھاٹک تھا اسمیں داخل ہو کر
 تقریباً سات آٹھ فیٹ مربع ایک دہلیز تھی اسکے دائیں اور بائیں دونوں جانب
 کمرے تھے، دہلیز کے بعد بقدر ایک سیڑھی کے بلند ایک ٹین کا مضبوط دوسرا
 پھاٹک تھا جو کہ مکان کا اصل دروازہ تھا اس میں جا کر ۱۲ فیٹ لمبی دوسری
 اندرونی دہلیز تھی جس میں داسنے بائیں بڑے بڑے ہال تھے جس کے دو دروازے
 اس دہلیز میں بھی کھلتے تھے اس دہلیز کے بعد درمیں بڑا پردہ پڑا تھا اسکے اندر
 داخل ہونے پر سارا مکان سامنے تھا پردہ عبور کر کے ہم لوگ دونوں بالوں اور
 دہلیز کے سامنے ایک وسیع و عریض سات دروں کے دالان میں تھے فرش پر
 پتھر کا چوکا بچھا ہوا تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہ دالان مکان کے چاروں طرف تھا فرق
 صرف یہ تھا کہ مشرق و مغرب کی جانب آدھے آدھے حصہ میں سردی و گرمی کیلئے
 باورچی خانہ تھا اور بقیہ آدھے حصہ میں مشرق کی جانب چند کونکھریاں اور
 مغرب کی جانب غسل خانہ اور پاخانہ وغیرہ بنا تھا۔ جب وکیل صاحب نے
 پردہ اٹھا کر حضرت کو مکان کے اندر بلایا تو ساتھ ساتھ داسنی جانب سے مکان
 دکھلانا شروع کیا عرض کیا کہ حضرت یہ ایک ہال کمرہ ہے (یہ وہی مشرقی ہال ہے
 جس کے دو دروازے لانبی اندرونی دہلیز میں بھی کھلتے تھے اور دو دروازے
 دالان میں بھی کھلتے تھے) حضرت نے فرمایا اچھا وکیل صاحب نے کہا اندر
 تشریف لے چلیں یہ اسکے مغرب میں وہی دہلیز ہے اور جنوب میں باہر کا کمرہ ہے
 جس میں کا ایک دروازہ پہلی دہلیز میں کھلتا تھا۔ اور یہ مشرق کی جانب اندرونی
 لانبی کونکھری ہے۔ پھر جانب شرق چلے کہا کہ یہ غلہ کی کونکھری ہے اور اسکے بعد
 یہ وسیع مشرقی باورچی خانہ ہے اور آگے یہ دو تین کونکھریاں ہیں مختلف ضروریات
 کے لئے۔ اب شمال والی دالان میں آکر کہا کہ یہ سامنے ایک بڑا کمرہ ہے حضرت نے
 باہر ہی سے اسے بھی دیکھا۔

ایک گیلری تھی حضرت نے فرمایا یہ کیا ہے؟ وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت یہ راستہ سے دوسرے قطعہ مکان میں جانے کا جو اسی کا ایک حصہ ہے کرایہ پر ہے ایک داروغہ جی رہتے ہیں اسکے بعد ایک کمرے کے تین دروازے بند ملے فرمایا یہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ حضرت جنوبی ہال کے مقابلہ میں یہ بھی ایک ہال کمرہ ہے لیکن اسکو بھی میں نے یونانی دواخانہ کو کرایہ پر دیدیا ہے یہ اندر سے بند ہے اسکے بعد دالان کے ختم پر ایک جانب اوپر جانے کا زینہ تھا۔ وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اوپر تشریف لے چلیں گے تکلیف تو نہ ہوگی فرمایا نہیں نہیں چل سکتا ہوں۔ چنانچہ حضرت اوپر تشریف لے گئے ختم پر داہنی جانب بھی راستہ تھا اور بائیں جانب بھی فرمایا کہ سرچلوں؟ وکیل صاحب نے عرض کیا کہ حضرت داہنی جانب تشریف لے چلیں اب حضرت دالان کی اوپر والی کھلی چھت پر تھے جس کے وسط میں چند زینوں کے اوپر حضرت تشریف لے گئے تو نہایت عریض وسیع کھلی چھت ملی جس میں مغرب کی جانب شمالاً و جنوباً ایک لانا سا کھیل پڑا ہوا تھا یہ صحن دراصل نیچے کے دونوں ہالوں کا مجموعہ تھا اور کچھ حصہ داروغہ جی کے مکان کا بھی اس میں پڑتا تھا حضرت اقدس کو کھلے مکان اور مقام سے ہمیشہ اُنس رہا ہے اسکو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے چوڑے کی پختہ چھت تھی اور بہت ہی بڑی کھلی ایسی کہ شہروں میں ایسی چھت تقریباً نایاب ہوتی ہے پھر اس سے واپس ہو کر بائیں جانب تشریف لے چلے تو پہلے ایک کمرہ ملا جو تقریباً ۱۶ فٹ لمبا اور ۸ فٹ چوڑا تھا اسکے بعد تقریباً ۱۸ فٹ لمبا ایک صحن تھا اسکے بعد ۵، ۶ فٹ چوڑا ایک دالان اسکے دروازے سے باہر ہوئے تو دوسری جنوبی دالان میں اترنے والا ایک تقابلی زینہ تھا اس سے حضرت والا نیچے اترے تو پہلے ہال کا بغلی لانا کمرہ ملا اسکے بعد بڑا ہال جس سے ملا ہوا پہلی دہلیز کا مغربی کمرہ تھا لیکن چونکہ درمیان سے یہ بند تھا اسلئے دونوں کمروں میں راستہ نہ تھا۔ پھر پردہ اٹھا دیا گیا اور حضرت والا دہلیز میں آگئے۔ وکیل صاحب حضرت سے

نہایت ادب سے ملے۔ حضرت نے فرمایا کہ اسکے متعلق اپنا خیال پھر مشورہ کر کے
ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے واسطے سے آپ کے پاس کہلا بھیجوں گا اسکے بعد
ہم سب لوگ واپس چلے آئے واپس آکر پہلے درس حدیث ہوا پھر حضرت نے
اولاً ہم ہی لوگوں سے پوچھا کہ مکان کیسا ہے؟ ہم سب نے کہا کہ حضرت بہت
عمدہ مکان ہے۔

اسکے بعد حضرت نے مجلس میں آنے والے مخصوص اصحاب سے فرمایا کہ آپ لوگ
بھی جا کر مکان دیکھئے اور پھر اسکے متعلق اپنا اپنا مشورہ دیجئے۔ چنانچہ حاجی شفیع اللہ
صاحب۔ حاجی عبدالوہید صاحب۔ حاجی عبداللطیف صاحب۔ شاکر حسین صاحب
ڈپٹی اقبال صاحب۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب۔ قاری حبیب احمد صاحب
والد ماجد مولوی سراج الحق صاحب۔ ڈاکٹر صلاح الدین صاحب۔ حافظ یونس
صاحب۔ سب سے اسکا مشورہ اور خیال معلوم کیا سب نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا
صرف ایک صاحب نے کہا کہ بہت پرانا مکان ہے حضرت کو ہمیشہ اسکو بنوانا ہی
پڑے گا، آج یہ چھت ٹپک رہی ہے کل کو وہ ٹپک رہی ہے، آج یہاں
مرمت کی ضرورت ہے کل وہاں کچھ کام کرانا ہوگا بس اسی طرح سے ہمیشہ لگا رہیگا
ایک صاحب نے یہ کہا کہ اس مکان کے خریدنے میں دو قباحتیں ہوں گی ایک
یہ کہ یہ گروہ دارے کے قریب ہے اور الہ آباد میں فسادات بھی ہوتے ہیں
اس لئے جگہ مخدوش ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں پانچ پانچ کرایہ دار ہیں ان
سب سے اسکو خالی کرانا پوری مصیبت ہے اس غور فرمایا جائے۔ چنانچہ
حضرت والائے جب گھر کے لوگوں سے مشورہ لیا تو حضرت قاری محمد حسین صاحب
نے بھی یہی خرابیاں بتلائیں کہ مکان بہت پرانا ہے دوسرے یہ کہ اسکا زیادہ
حصہ تو کرایہ داروں کے قبضہ میں ہے کون تخلیہ کے لئے بستہ باندھ کر کچری دوڑتا
پھر گیا۔

اور پھر یہ کہ محلہ کبھی کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے اسلئے طبیعت میں رکاوٹ ہوتی ہے ورنہ ویسے مکان تو بہت اچھا ہے۔

اجاب کے اختلاف رائے کا تو حضرت اقدسؒ پر کچھ اثر نہیں ہوا لیکن حضرت قاری صاحب کی زبان سے کبھی وہی باتیں سنیں تو حضرت کو فک ہوئی کہ ان کے اشکالات کو رفع کر کے انھیں مطمئن کرنا ضروری ہے اس لئے کہ مکان تو ہم انھیں لوگوں کے لئے رہے ہیں اگر انھیں کو پسند نہ ہو تو پھر فائدہ کیا؟ باقی حضرت اقدس کے انشراح سے اندازہ ہوتا تھا کہ خود حضرت کو کبھی یہ مکان پسند تھا۔ اسلئے جناب قاری صاحب کو حضرت نے یوں مطمئن فرمایا کہ ایک دن کسی سے فرمایا کہ ذرا کسی دن مجھے گرد و دارہ دکھلاؤ تو سہی۔ چنانچہ ایک دن تفریح کو جاتے وقت کسی نے حضرت سے کہدیا کہ حضرت یہ گرد و دارہ یہ جی۔ ٹی روڈ پر مکان سے اسٹیشن جاتے میں ایک فرلانگ کی دوری پر دوسری پٹری پر پڑتا تھا۔ اسکے ملاحظہ کے بعد حضرت نے فرمایا کہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ مکان کو اس سے کیا تعلق ہے کہاں مکان اور کہاں یہ؟ بہت فاصلہ ہے یہ تو کوئی عذر نہیں ہے۔ اور پھر قاری صاحب سے فرمایا کہ میں نے گرد و دارہ کو جا کر دیکھا ہے وہ تو گھر سے بہت دور ہے، رہا کرایہ داروں کے تخلیہ کا مسئلہ تو بیشک اس زمانہ میں ہے یہ ایک مشکل مرحلہ لیکن بتاؤ کہ اگر قتنا مکان خالی ہے اور جس پر ہمارا قبضہ ہو جائے گا اتنا حصہ کبھی تمھارے نتیجہ و والے مکان سے زیادہ ہے یا نہیں جس کو تم چھوڑ کر آئے ہو۔ قاری صاحب نے عرض کیا جی ہاں اس سے تو یہ کہیں زیادہ ہے۔ فرمایا کرایہ دار خالی کریں یا نہ کریں کرایہ تو دیں گے چلو غیر یہی سہی۔ اول تو تخلیہ کی کوشش کی جائے گی اور نہ خالی ہو گا نہ سہی ہمارا کیا نقصان ہے۔ باقی یہ کہ مکان پرانا ہے اور خستہ ہے تو یہ سوچو کہ اگر اس وقت اس کو گرا کر اسکے دروازے۔ آئینیں۔ پتھر اور کمریاں فروخت کی جائیں تو ۲۵ ہزار میں بک جائیں گی یا نہیں؟ قاری صاحب نے

عرض کیا ہاں ضرور یک جائیں گی۔ فرمایا پھر زمین تو تم کو مفت کی مل گئی۔ جب تک چلے گا چلے گا نہیں تو از سر نو لیا جائے گا۔ ان جوابات کو سنکر قاری صاحب کی تسلی ہو گئی اور مکان کے متعلق شرح صدر ہو گیا۔ عرض کیا کہ جی ہاں بہتر ہے لے لیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد ڈاکٹر صلاح الدین صاحب کے توسط سے احمدیہ بہت کفایت پر معاملہ طے ہو گیا یعنی پچیس ہزار میں رجسٹری کر دینے کا وکیل مقرر وعدہ فرمایا اور حضرت بھی راضی ہو گئے۔ اور اب خریداری کے لئے رقم کی فراہمی کا سوال پیش آیا جو اچمد اللہ حضرت والا جیسی شخصیت کے لئے کچھ دشوار نہ تھا لیکن حضرت اقدس چونکہ اپنے ہر معاملہ کے ذریعے اپنے پاس آنے والوں کو سبق دینا اور تعلیم فرمانا چاہتے تھے اسلئے یہاں بھی یہی انداز اختیار فرمایا اور ایک دن چند خواص کو جمع کر کے فرمایا کہ بھائی وکیل صاحب تو تیار ہو گئے ہیں رجسٹری کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اب مکان کی خریداری کی کیا صورت ہو میرے پاس اس وقت نقد تو پچیس ہزار موجود نہیں ہے ہاں میں اتنی رقم آستہ آستہ فراہم کر سکتا ہوں اور ادا کر سکتا ہوں مگر مجھے بھی مکان کی جلد ہی ضرورت ہے اور وکیل صاحب کو بھی رقم کی فوری حاجت ہے تو اب کیا صورت اختیار کی جائے؟ جانیئے آپ لوگ باہم مشورہ کر کے کوئی صورت طے کیجئے۔ ان حضرات نے تجلیہ میں بیٹھ کر باہم مشورہ کیا کسی نے کسی سے قرض لینے کی رائے دی اور کسی نے کسی اور شخص کا نام پیش کیا۔ ایک صاحب نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ حضرت کے مقامی و غیر مقامی خداموں میں سے پچیس اہل ثروت کا انتخاب کر لیا جائے اور ہر ایک کے ذمہ ایک ایک ہزار کی فراہمی لازم کر دی جائے۔ چنانچہ اس طرح سے پچیس ہزار کی رقم حضرت کی خدمت میں پیش کر دی جائے اور ہم لوگ حضرت کو اتنی سہولت اور پہنچا دیں کہ جب اور جتنی گنجائش ہو حضرت آستہ آستہ ہی ادا فرماتے رہیں، اور ہم لوگ ایک فہرست اپنے طور پر مرتب کر لیں کہ کس شخص

کو فوری ضرورت ہے یا جلدی ضرورت ہے اور ایک شخص کو نامزد کر دیں کہ حضرت اسے قسط عطا فرما دیا کریں اور وہ حسب ترتیب فہرست لوگوں کو ادا کرتا رہے۔ اس طرح سے کسی ایک شخص پر زائد بار کبھی نہ پڑے گا اور اتنا بڑا کام نہایت آسانی کے ساتھ انجام پا جائے گا۔ یہ تجویز اور مشورہ حضرت اقدس کے سامنے پیش کیا گیا جسے حضرت نے بھی بہت پسند فرمایا۔

یہاں ایک بات یہ ذہن نشین رہے کہ حضرت کے خدام میں سے بہت سے ایسے لوگ تھے کہ ایک معمولی سے اشارہ میں ایسی بڑی رقم ان میں سے ایک ہی شخص پیش کر سکتا تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ حضرت والا کا مزاج ہی کچھ اس نوع کا تھا کہ وہ اپنے ہر قول اور ہر فعل سے امت کے سامنے ایک آسان حل اور اپنے متعلقین کے اندر جذبہ ایثار و ہمہ روی اور وقت پڑ جانے پر کسی کی ضرورت کے احساس کے جذبات کو ابھارنا چاہتے تھے اسی لئے یہ تمام شوری و مشورہ تھا ورنہ نہ یہ ایسا کوئی بڑا کام تھا اور نہ حضرت اس میں کچھ مجبور ہی تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کے مزاج میں شروع ہی سے امرار سے استغنا اور مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی انابت کا داعیہ پیدا کر رکھا تھا۔ اسلئے بھی حضرت کو اپنے لئے مخلوق سے کچھ کمنا طبعاً گراں تھا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ امرار و وساک کی اصلاح بھی ان میں مضمر ہو کہ جب یہ دیکھیں گے اتنا بڑا دنیوی کام پڑا اور حضرت نے ہماری کچھ بھی ضرورت نہ محسوس کی تو اسکی وجہ سے ان کے قلوب میں شیخ کی عظمت اور وقعت اور اور بڑھیمگی جو کہ اصلاح کی روح ہے۔ چنانچہ عقلا نے لکھا ہے کہ اگر کسی بزرگ کو یہ مطلوب ہو کہ لوگ اس سے نہ ملیں اور انکی تنہائی کا سکون مشورش نہ ہو تو وہ یہ کرے کہ اپنے پاس آنے والے غریب کو تو کچھ ترض دے اور امیر کی جانب کوئی حاجت پیش کر دے بس دونوں سے نجات مل جائے گی۔ غریب عدم ادائیگی کی شرمساری سے محبوب رہے گا اور امیر

نئے مطالبہ کے اندیشہ سے خوف زدہ ہو جائے گا۔ اور مال معاملہ ایسا نازک ہے کہ
اہل دنیا اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں چنانچہ مقولہ مشہور ہی ہے کہ
گر جاں طلبی مضائقہ نیست۔ در ز رطلبی سخن درس است
بہر حال اس مشورہ کے بعد کیا ہوا اور رقم کیونکر فراہم کی گئی اسکی تفصیل مجھ کو نہیں معلوم
اور نہ ہم لوگوں نے اسے معلوم کرنے کی کبھی ضرورت سمجھی۔ تاہم ایک محترم نے اس سلسلہ
میں راقم کو واسطہ بنایا اور حاضر ہو کر کچھ رقم حضرت کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کی کہ حضرت
یہ اسی مشورہ کے ماتحت میری جانب سے قبول ہوا اور ایک گزارش یہ بھی ہے کہ مجھے
سردست روپیہ کی حاجت ہی نہیں ہے سب حضرات کو دیے جانے کے بعد آخر میں
میرا نمبر رکھا جائے۔ حضرت نے وہ رقم قبول کر لی اور بعد میں مجھ سے فرماتے تھے تمہارے
یہ عزیز حسن منزل والے بڑے مخلص شخص ہیں اپنی طرف سے مجھے ہر طرح کی سہولت
دیدہی۔ بس میں یہی چاہتا ہوں کہ اسی طرح سے مل جل کر لوگ ایک دوسرے کی ضرورت
کو پوری کر دیا کریں۔ بڑی پریشانی کا وقت ہے آدمی پر کبھی نہ کبھی کوئی وقت آ ہی جاتا ہے
اب اگر احباب کے اندر اتنی بھی حمیت اور حمایت نہ موجود ہو تو پھر کیا لطف زندگی ہے۔
یہ ضرور ہے کہ جب لوگ کسی کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کریں تو اس کو اپنے وعدہ
کی پابندی لازم ہے۔ آج لوگ یہی نہیں کرتے اسلئے لوگوں نے بھی کسی کی حمایت
کہ فی چھوڑ دی ہے۔

بہر حال تاریخ مقررہ پر مکان کی ریسٹری ہو گئی اور شام کو کچری سے واپس
آنے کے بعد ہم سب نے مرثوہ سنایا کہ حضرت احمد رضاؒ مکان کی خریداری کی تکمیل ہو گئی۔
دوسرے دن وکیل صاحب نے حضرت اقدس کو مکان کی کنجی حوالہ کر دی اور عرض کیا
کہ حضرت آج کا دن میرے لئے بڑی مسرت کا دن ہے یہ کہہ کر حضرت کا ہاتھ چوما اور
رونے لگے۔ حضرت نے خیال فرمایا کہ وطن سے اور مکان سے لوگوں کو رغبت ہوتی ہی
ہے یہ خیال آگیا ہو گا کہ آج سے یہ میرا آبائی مکان اب میرا مکان نہیں رہا۔ لیکن انھوں نے
اسکی صفائی دی کہ حضرت مسرت اس بات پر ہے کہ میں نے اپنے باپ دادا کی بنوائی

ہوئی عمارت اور ان سے پائی ہوئی اس امانت کو ایک اہل کی جانب منتقل کیا ہے جس کی بنا پر امید کرتا ہوں کہ حشر میں والد مرحوم کے سامنے مجھے کوئی ندامت نہ ہوگی اور ان سے یہ عرض کر سکوں گا کہ میں نے آپ کی امانت ایک اللہ کے ولی کے حوالے کر دی۔ حضرت والا ان کے ان الفاظ سے بہت متاثر ہوئے انکے سر پر ہاتھ پھیرا اور انکو گلے سے لگایا اور تسلی کے طور پر یوں فرمایا کہ نہیں ندامت کیوں ہوگی انشاء اللہ وہ بہت خوش ہونگے۔ آپ نے بہت خلوص اور ایتبار سے کام لیا ہے جزاکم اللہ تعالیٰ۔

اور واقعہ بھی یہی تھا کہ بہت دنوں سے کچھ لوگ اس مکان کی خریداری کی فکر میں تھے چنانچہ ایک سندھی نے سنا ہے ساٹھ ستر ہزار تک دام لگا دیا تھا لیکن ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ صحن خانہ کے وسط میں جو عورتوں کے نماز پڑھنے کے لئے ایک نچتہ چبوترہ ہے جسکے غریب جانب محراب بنی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ مسجد کے مشابہ ہو گیا ہے اسکو وکیل صاحب خود اپنے ہاتھ سے منہدم کر دیں تاکہ میری خریداری کے بعد بوقت انہدام محلہ کے مسلمانوں کی طرف سے کچھ سوال نہ اٹھے۔ وکیل صاحب نے ہر چند کہا کہ ہم لوگ اس پر نماز ضرور پڑھتے ہیں لیکن وہ مسجد نہیں ہے ہمارے ہاتھوں اسکو منہدم نہ کراؤ ہم تمہارے ہاتھ فروخت کر دیں پھر تم جو چاہنا بنا نا بگاڑنا تمکو اختیار ہے لیکن سندھی ایک تو پر دیسی دوسرے مسجد کے نام سے مرعوب بغیر اسکے لینے کی ہمت نہیں کر سکا ظاہری وجہ رکاوٹ تو ایک غیر مسلم کے لئے اس مکان کی خریداری کیلئے یہی بنی لیکن حق تعالیٰ کو تو یہ منظور تھا کہ جس مکان کو ایک دیندار نے بنوایا ہے اور جس میں دیندار خواتین نے نمازیں پڑھی ہوں اور جس مکان کے صحن کے مختصر چبوترے پر چند دینداروں نے رمضان کی ساری رات تلاوت کلام اللہ کر کے اور سنکر کے گزار دی ہو تو جس طرح قرآن کریم کے بارے میں فرمایا ہے کہ لا یمسہ الا المطہرون اسی طرح اسکے تلاوت کے مکان کو بھی کسی غیر مسلم کے قبضہ میں نہ دیا جائے گا اور یہ انتظام کیا جا رہا تھا کہ الہ آباد میں جب میرا یہ ولی آؤ

تو اسکو اسی میں ٹھیرایا جائے اور اس جگہ کو علم و معرفت کا سرچشمہ بنایا جائے چنانچہ
ایسا ہی ہوا کہ مکان کے بچنے کی تو عرصہ سے خبر تھی دام چڑھتا تھا اترتا تھا مگر کوئی
گاہک طے نہیں ہو پاتا تھا اور آخر میں ایک شخص نے لینا بھی چاہا تو شرط پوری
نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ بھی نہ لے سکا۔ اور حضرت کے یہاں کوئی چیز رکاوٹ ہی
کی نہ تھی اسلئے وکیل صاحب نے بڑے انشراح اور خوشی کے ساتھ حضرت
کے ہاتھوں اسکا فروخت کرنا منظور فرمایا۔ اور ابھی جو میں نے یہ عرض کیا کہ
چند دینداروں نے ساری ساری رات اس میں تلاوت کیا اور سنا ہے تو اسکی
تفصیل یہ ہے کہ مالک مکان جناب ابوالحسن صاحب جعفری (وکیل) کے والد کا نام
مولوی غلام مجتبیٰ صاحب جو پرانے وقت کے ایک فاضل دیندار وکیل تھے اور
یہاں الہ آباد کے مشہور طبیب جو حضرت کے معالج بھی رہ چکے تھے جناب حکیم
سید فخر الدین احمد صاحب جعفری کے والد بزرگوار کا اسم شریف مولوی محی الدین
جعفری تھا جو کہ الہ آباد کے ایک ذی علم معزز شخص تھے، ان دونوں الہ آباد کے
مدرسہ احیاء العلوم واقع مسجد عبداللہ میں قرأت کے ایک مشہور استاذ جو اپنے
زمانہ میں اس اطراف کے استاذ الکمل قرار دیئے جاتے تھے یعنی قاری عبدالرحمن
صاحب مکی ثم الہ آبادی تجوید کے مدرس تھے، چنانچہ یہ دونوں حضرات یعنی
مولوی محی الدین صاحب اور مولوی غلام مجتبیٰ صاحب میں باہم بہت گہری
دوستی تھی اور دینداری کے سبب ان دونوں حضرات کو حضرت قاری صاحب
کی قرأت سننے کا بہت شوق تھا چنانچہ غلام مجتبیٰ صاحب مرحوم کے اسی مکان
میں کبھی کبھی یہ تینوں حضرات یا کبھی اور دوسرے بعض حضرات بھی جمع ہوتے
اور اسی صحن کے چبوترہ پر شبینہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھی سنتے گھر کی مستورات بھی
فیضیاب ہوتیں اور سارا گھر نورِ قرآن سے منور ہو جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرت قاری صاحب کا یہ قرآن پڑھنا مقبول ہو گیا تھا
اسلئے اللہ تعالیٰ نے بھی اس مکان کا مکین ہونا ایسی ذات کے لئے مسترد

سرمادیا تھا جسکو قرآن سے عشق تھا اور جس نے یہاں تشریف لاتے ہی تلاوت قرآن پر ایسا دلنشیں و عطا فرمایا کہ علماء اور مشائخ تک کو گویا انکا بھولا ہوا سبق یاد کرادیا۔ چنانچہ خود میر نے سامنے یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت نے مجھے اپنے کمرہ میں طلب فرمایا وہاں پہلے سے ایک بزرگ تشریف فرما تھے، حضرت نے فرمایا سنو! دیکھو یہ مولانا کیا فرما رہے ہیں۔ اتنے میں ان مولانا صاحب نے کہنا شروع کیا کہ میں نے حضرت سے ابھی ابھی یہ عرض کیا ہے کہ حضرت نے تلاوت کا مضمون بیان نہ کرنا امت پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ حضرت کی زبان سے تلاوت کے فضائل اور آثار و برکات کو سنکر اپنی طبیعت اب کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ اب کوئی دوسرا مضمون و عطا میں بیان کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا جب بیان کرتا ہوں بس تلاوت کے فضائل بیان کرتا ہوں یا تلاوت قرآن سے کچھ باتیں سنا دیتا ہوں بس یہی میرا بیان ہوتا ہے۔

اسی طرح سے اس سلسلہ میں ایک عالم کا تاثر سنئے انھوں نے اپنی الہ آباد تشریف آوری کے موقع پر حضرت کی صبح کی مجلس کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان فرمایا اور کسی کو لکھا کہ :-

” صبح کی جو مجلس ایک خاصے بڑے مجمع کے سامنے ہوئی اس میں زور شروع سے آخر تک بس تلاوت قرآن پر اور مروجہ اذکار و اشغال سے زائد قرآن مجید سے رابطہ قائم کرنے پر تھا اور بعد ظہر کی خصوصی مجلس کے تاثر کو ان لفظوں میں بیان فرمایا :-
 ” مولانا وصی اللہ صاحب حفظہ اللہ کے افراط کرم سے شرمسار و محبوب ہو کر واپس آیا، بعد ظہر کی مجلس میں انھوں نے ایک بات ایسی فرمادی جو دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئی سرمایا کہ ایسے علماء بھی ہیں جو مسائل تفسیر پر تو خوب گفتگو کر لیتے ہیں لیکن تلاوت قرآن سے ان کے دل کو لگاؤ نہیں اسلئے اسکے انوار و برکات سے محروم

ہی رہتے ہیں۔

یہ تو گویا اپنے کشف سے یا فراست سے میرے ہی دل کا چور پکڑ لیا
اب اگر آنقریزہ میرے اس خط کے حوالہ سے موصوف سے کچھ آداب تلاوت
دریافت کر کے مجھے لکھ بھیجیں تو یہ آنقریزہ کا بڑا کرم ہوگا۔

اسی کو راقم نے عرض کیا تھا کہ بہت سے علماء و مشائخ کو حضرتؒ نے

انکا بھولا ہوا سبق یاد دلادیا۔

اسلئے اسی کا انتظام ہوتا رہا دوسرے کسی کو یہ مکان مل بھی کیسے سکتا تھا؟ جو اسکا
صحیح معنوں میں اہل اور مستحق تھا اسکو پہونچا دیا گیا۔ چنانچہ وکیل صاحب نے
بھی یہی جملہ فرمایا کہ اب میں امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ قیامت میں والد صاحب کے
سامنے سرخرو ہونگا اور ان سے کہہ سکوں گا کہ ”حق بقدر رسید“۔

بہر حال حضرت دالانے مکان خرید لیا اور یہ کوئی ایسی نئی بات بھی نہ تھی
دنیا میں مکان بکتے بھی ہیں اور خریدے بھی جاتے ہیں لیکن خدا معلوم کیا اثرات
تھے کہ بڑی شہرت اور سرعنت کے ساتھ آنا فانا یہ خبر تمام شہر میں مشہور
ہو گئی۔ ہمارے محمدیاں صاحب فاروقی الہ آبادی اندنوں دہلی میں کھتے
دہاں سے واپس آکر جب حضرتؒ سے ملے تو فرمایا کہ مجھکو مکان کی خریداری کی خبر
مولانا شاہد فاخری صاحب نے دہلی میں دی۔ کہنے لگے کہ محمدیاں! سنا نہیں
آپ کے پیرنے ابو الحسن جعفری کا مکان خرید لیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ میں نے جواب
میں کہا کہ الحمد للہ۔ خدا معلوم مولانا شاہد فاخری صاحب نے کس خیال سے
یہ جملہ فرمایا تھا خبر محض تھی یا استعجاب تھا کہ پیر ہو کر اتنے مالدار ہیں! یا کیا غرض
تھی؟

باقی یہ تو بہر حال دیکھا گیا کہ مخالفین کی نظروں میں حضرت اقدس کا
مکان خرید لینا بہت کھلا برخلاف اسکے حلقہ احباب میں یہ خبر بہت ہی مسرت انگیز
ہی۔ اور باہر کے بعض حضرات بھی اطلاع پانے پر حضرت والا کو خطوط لکھے۔

چنانچہ صوفی عبدالرب صاحب نے اناؤسے حضرت اقدسؒ کو لکھا کہ
 ”معلوم ہوا ہے کہ حضرت اقدسؒ کا اب الہ آباد میں ذاتی مکان بھی ہو گیا ہے
 اور حضرت اقدسؒ اب اپنے ہی مکان میں تشریف فرما ہیں اس مژدہٴ روح افزا
 سے ایسی مسرت ہوئی ہے کہ جیسے اب تک پابند و گرفتار تھا کہ یگیاگی میرے
 ہاتھ پر کھل گئے۔“

حضرت اقدسؒ نے انھیں لکھا کہ چونکہ آپ کو مجھ سے محبت ہے اس لئے یہ خوشی ہے
 اور میری بھی یہی حالت ہے۔ اسی طرح سے ایک اور مولوی صاحب نے گورکھپور
 سے لکھا کہ مولوی سراج الحق صاحب الہ آباد سے تشریف لائے ان سے یہ
 ”معلوم ہوا ہے کہ آپ نے ایک مکان خرید لیا ہے جو کافی طویل و عریض
 اور آرام دہ ہے اور ایسا ہے کہ طالبین و ذاکرین و دارین و صادقین
 سب کے لئے گنجائش رکھ سکتی ہے۔ اور سب زیادہ قلبی خوشی
 کی چیز یہ ہے کہ زمخشریؒ کو مجاورت کعبہ کے باعث جارا اللہ کے معزز
 لقب سے ملقب کیا گیا اور حضرت کو ایک عالیشان مکان مسجد کے
 جوار میں رکھ کر علم و معرفت اور شریعت و طریقت کے عظیم الشان اور
 عالمتاب قندیلوں کے روشن کرانے کا سامان ہم پہنچایا جا رہا ہے۔“
 حضرت نے انھیں جواب دیا کہ آپ نے صحیح سنا ہے۔ جی ہاں مکان وسیع ہے
 خدا کرے آپ کا ظن صحیح نکلے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اجاب کو حضرت اقدسؒ کے مکان خرید لینے کی
 کس قدر مسرت ہوئی اور نہ صرف اہل الہ آباد ہی خوش ہوئے بلکہ جس نے جہاں بھی
 سنا اپنی خوشی کا اظہار کیا لیکن اغیار پر اسکا اثر یہ ہوا کہ خدا معلوم کیوں انکی پریشانیوں
 میں اضافہ ہو گیا شاید وجہ یہ ہو کہ اب تک تو وہ یہ سمجھتے رہے کہ ایک وہابی قسم کے پیر
 یہاں آگئے ہیں لوگ انکے یہاں بہت آتے جاتے ہیں انکی باتوں سے اکیل چھانٹا
 پڑھا لکھا طبقہ متاثر بھی ہے لیکن خیر یہ یہاں کتنے دنوں رہیں گے اپنے وطن کے

لوگوں سے ناراض ہو کر آگئے ہیں چند دن کے بعد معاملہ رفع دفع ہو ہی جائے گا اور یہ پھر واپس ہو جائیں گے کیونکہ اپنا مکان اور پھر ایسی عالیشان مسجد اور خانقاہ چھوڑنے کے لئے کھوڑا ہی بنوائی گئی تھی۔ مگر جب حضرت والا نے اپنے لئے مستقل مکان خرید لیا تو اب وہ یہ سمجھے کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہید شاہ صاحب یہیں رہ جائیں گے اور انکا یہاں قیام کر لینا ہمارے قہر بدعات کے لئے مہلک ثابت ہو جائیگا، اسلئے پریشان تھے۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی لوگوں کے اس مزاج سے خوب واقف تھے اسلئے، حسن منزل کی ابتدائی مجلسوں ہی میں حضرت نے اپنے بیان میں حضرت زکریا ملتانیؒ کی آمد اور وہاں کے مشائخ وقت کا ان کے ساتھ معاملہ دودھ کے بدیہ کا واقعہ اور اس پر پھول رکھ کر واپس کرنے کا نفیس و لطیف جواب اور اسکی وجہ سے ان حضرات کا مطمئن ہو جانا، یہ سب امور نہایت شد و مد کے ساتھ بیان فرما چکے تھے لیکن لوگوں کے مزاج مزاج میں فرق ہوتا ہے یہ کیا ضروری ہے کہ جس جواب سے حضرت زکریا ملتانیؒ نے اپنے زمانے کے مشائخ کو مطمئن فرما دیا ہو اسی سے اس زمانہ کے لوگ بھی مطمئن ہو جائیں۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اب ذرا کھل کر مخالفت کی جانے لگی کہ اب تک تو خال خال اور کوئی کوئی شخص کسی سے کہتا تھا کہ وہابی ہیں ان کے یہاں نہیں جانا چاہیئے اور کوئی اگر اور قابل ہوا تو اس نے یوں بہکایا کہ اپنے وطن میں لڑائی کرا کے وہاں سے بھاگ کر یہاں آکر پناہ لی ہے ان سے ہوشیار رہنا یہاں بھی نہ مسلمانوں کو لڑا دیں۔ (راقم نے یہ الفاظ خط کشیدہ بادل نا خواستہ تحریر کئے ہیں اور اسلئے تحریر کئے تاکہ آپ کے سامنے مخالفین کا پلان ظاہر ہو سکے کہ کس طرح سے یہ لوگ پیش بندی کرتے ہیں اور کس طرح سے اپنے کام کے لئے پہلے سے زمین ہموار کر رکھتے ہیں۔ حضرت والا کی جانب سے ان امور کا توبہ توبہ تصور کبھی نہیں ہو سکتا تھا جس نے حضرت سے ملاقات کر لی ہے اسکی سمجھ میں تو ان چیزوں کا کذب و بہتان ہونا بالکل آگیا ہو گیا اور بعد کے پیش آنے والے واقعات نے تو یہ ثابت بھی کر دیا کہ حضرت

اقدس وطن سے بھاگ کر یہاں نہیں تشریف لائے بلکہ اسکو ترک کر کے وہاں سے ہجرت فرمائی تھی۔ اس رو سے بھی اغیار کو اسوقت تک اٹھانی پڑی جب حضرت والا سے وطن کے لوگوں نے معافی مانگی اور اصرار کے ساتھ حضرت کو ایک مرتبہ متحجور تال زجا تشریف لے چلنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت اقدس پھر جیسی شان کے ساتھ وطن تشریف لیگے ہیں اسکے چشم دید گواہ آج بھی موجود ہیں (اسکا ذکر تفصیل کے ساتھ انشا اللہ ہم آئندہ کسی موقع پر کریں گے)

بہر حال اغیار کی جانب سے برابر اس امر کی کوشش جاری رہی کہ حضرت والا کو یہاں جمنے نہ دیا جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم حضرت کو اس طرح سے بدنام کر دیا جائے کہ لوگ ہی یہاں نہ آویں لیکن اللہ کی شان کہ جو ترکیب مخالفین کیطرت سے کی گئی وہ انکے حق میں الٹی ہی پڑی چنانچہ جس قدر غلط باتیں حضرت والا کے متعلق مشہور کی گئیں ان سے اس جماعت کا کذب ہی روز بروز کھلتا گیا۔ وہابیت کا پروپیگنڈہ اسلئے نہ چل سکا کہ لوگوں نے دیکھا کہ ان کی مجلسوں میں کتاب وسنت اور اللہ و رسول کی باتیں تو ہوتی ہیں یا پھر بزرگان دین کے واقعات اور اخلاص و اخلاق کی تعلیمات ہوتی ہیں ان کے علاوہ وہ تو کچھ بیان ہی نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ صحیح احباب حاضر اند باعداچہ حاجت است۔ یعنی ہمارے پاس بیانِ قرآن و حدیث اور بزرگوں کے واقعات کیا کم ہیں؟ پھر ہم انکا تذکرہ اپنی مجلس میں کیوں کریں؟۔ لہذا ہم انکی مجلس میں کیوں نہ جائیں اور اگر ہم وہاں نہ جائیں تو ان جیسی کسی مجلس کا پتہ ہی مل جائے جہاں سے ہم کو دین و اخلاق کی تعلیم ملے۔ ظاہر ہے کہ اسکا جواب ان کے پاس کیا ہوتا اسلئے یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو سکی

اس زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ عید کا موقع آیا اور یہاں شہر کی عید گاہ کی امامت مولانا محمد میاں صاحب فاروقی سے متعلق تھی وہ بوجہ اپنی علالت کے نماز پڑھانے کے قابل نہ تھے اسلئے انھوں نے حضرت والا کو لکھا کہ میری طبیعت ہے عید گاہ میں نماز عید پڑھانے کے لئے حضرت والا اپنے یہاں سے

کسی صاحب کو متعین فرمادیں وہ جا کر عید گاہ میں عید کی نماز پڑھا دیں۔ حضرت نے اپنے یہاں سے کسی کو بھیجنا مناسب نہ سمجھا لیکن محلہ کی مسجد کے جو امام تھے قاری غلام نبی صاحب وہ قاری محب الدین صاحب سے مدرسہ سبحانیہ میں تجوید پڑھ چکے تھے ان سے فرمایا کہ آپ عید گاہ جا کر نماز پڑھا دیجئے گا۔ چنانچہ عید کے دن قاری غلام نبی صاحب نے عید گاہ جا کر عید کی نماز پڑھا دی بس پھر کیا تھا اس موقع کو اغیار نے غنیمت جانا اور چند دنوں کے بعد ایک پوسٹر منظر عام پر لایا گیا کہ مولانا وصی اللہ صاحب کے ایک مرید نے عید گاہ میں امامت کر کے سارے مسلمانوں کی نماز کو غارت کر دیا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کے مفتون ہو جانے کے لئے اتنا سالہ کافی تھا۔

اب اس سے بحث نہیں کہ اگر آج بھی حسب دستور سابق مولانا محمد میاں صاحب فاروقی ہی نماز پڑھاتے تو مسلمانوں کی نماز عید کا کیا حشر ہوتا جبکہ وہ بھی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب سے بھی بلکہ ان کے بھی شیخ حضرت حکیم الامتہ مولانا کھٹانوی سے بھی بیعت تھے۔ لیکن آج کی نفسانی دنیا میں دریافت اور عقل سے کون کام لیتا ہے؟ بات یہ ہے کہ مولانا فاروقی مدظلہ مقامی شخص تھے اور عید گاہ کے مسلم امام تھے اسلئے ان کے خلاف کچھ کہنا آسان نہ تھا اور مولوی غلام نبی صاحب بیچارے کے یا خود حضرت مولانا کے متعلق سمجھتے تھے کہ یہ پر دسی لوگ ہیں یہاں انکو کچھ قوت حاصل نہیں ہے ان سے آسانی کے ساتھ بھڑا جاسکتا ہے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوا جاسکتا ہے۔ اب کیا اب تو حضرت والا کا نام برسر بازار لیا جانے لگا بلکہ مسلم محلوں کے ہر ہوٹل میں یہی تذکرہ ہونے لگا اب اللہ تعالیٰ کے علم میں جو بھی مصلحت اس میں رہی ہو دیکھنے میں تو یہی آیا کہ حضرت مولانا کی شہرت پورے شہر میں ہو گئی اور مجلس میں لوگ پہلے سے زیادہ آنے لگے۔ مخالفین نے یہ سمجھ کر کہ اب حضرت والا کا ذکر عام طور سے شہر میں چھڑ گیا ہے انکا تذکرہ اس طرح سے کر دیا جائے کہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو کر

ان سے دوری اور بعد ہو جائے۔ چنانچہ حضرت والا کے اند بظاہر کوئی نقص نہ پا کر حضرت کے تعارف میں حضرت مولانا تھانویؒ کا ذکر کرنا شروع کر دیا اور آخر میں یہ کہ یہ بزرگ جو تشریف لائے ہیں انھیں کے خلیفہ ہیں جنہوں نے خود اپنے پیر کی مخالفت کی، پیر کا کیا مسلک تھا اور انھوں نے ان کے خلاف اپنا طریقہ جدا رکھا اور اس موضوع پر محلہ محلہ سیرت کے جلسے ہونے لگے یعنی اعلان تو ہوتا تھا میلاد شریف کا اور بیان کیا جاتا تھا اس میں یہی مسئلہ۔

مکان کی خریداری پر امیر پیر کا لقب تو پہلے ہی مل چکا تھا اب یہ بحث بھی شب کی تقریروں میں سامنے آنے لگی۔ ادھر حضرت اقدسؒ کی بھی اپنی صبح کی مجلس شباب پر تھلی خوب لوگ آ رہے تھے اور حضرت والا کی اصلاحی اور معرفت حق کی باتیں، تصوف و سلوک کے رموز، بزرگان دین کے خوف و محبت کے واقعات موضوع تقریر بنے ہوئے تھے جنہیں جو شخص بھی سنتا تھا محفوظ ہو جاتا تھا۔ اب ان مضامین سے لطف اندوز اور سرشار ہونے والوں سے اگر کوئی کہتا کہ یہ وہابی ہیں تو وہ پلٹ کر فوراً جواب میں یہی کہتا کہ اگر یہی لوگ وہابی اور بُرے ہیں تو جاؤ ہم بھی وہابی ہیں۔

حضرت والاؒ شہر کی فضا اور اغیار کی باتوں سے یکسر صرف نظر فرمائے ہوئے صرف لوگوں کے مفید مطلب اصلاح اخلاق اور تحذیر نفاق سے متعلق بیان فرماتے رہے۔ صرف اس سلسلہ میں ایک دن یہ سنہرایا کہ مجھے آپ کے شہر میں آکر ایک تحفہ ملا ہے وہ یہ کہ سنا ہے کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بڑے امیر پیر ہیں۔ تو اس کے متعلق آپ سے یہ کہتا ہوں کہ پیروں کے متعلق یہ خیال اور ان پر یہ اعتراض نیا نہیں ہے، بلکہ خواجہ عبید اللہ احرار ایک بزرگ گذرے ہیں مولانا عبدالرحمن جامیؒ کے پیر میں مولانا جامی بھی پہلی مرتبہ جب انکی خدمت میں حاضر ہوئے اور انکا عالی شان محل اور وہاں پر پہرہ چوکی دیکھا تو وہاں سے یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ عہ نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد (جو شخص دنیا کو دوست رکھے

وہ بھلا کہیں اللہ والا ہو سکتا ہے حضرت خواجہ صاحب پھاٹک کے اوپر سہ درمی میں تشریف فرما تھے انھوں نے سن لیا۔ ادھر مولانا سفر سے تھکے ہوئے تھے پاس کی مسجد میں آرام کرنے کی خاطر جا کر لیٹ رہے، تھکے تو تھے ہی نیند آگئی خواب میں دیکھا کہ حشر قائم ہے اور میرا ہی نام پکارا جا رہا ہے ایک شخص مدعی حق میرا دامن پکڑے ہوئے اپنے حق کا مطالبہ کر رہا ہے اور میں ادا بیگی سے عاجز ہوں کہ اتنے میں خواجہ عبید اللہ احرار کی سواری اور ہر سے گزری ہمیں اس حال میں گرفتار دیکھ کر اس شخص سے پوچھا کہ کیوں کیا بات ہے تم نے انھیں کیوں مجبوس کر رکھا ہے اس نے کہا کہ حضرت میرا حق ان پر آتا ہے حضرت خواجہ نے جیب سے رقم نکالی اور اسکو دیکر فرمایا کہ یہ ہمارا آدمی ہے لو یہ اپنا حق اور اسکو چھوڑ دو۔ اتنے میں مولانا جامی کی آنکھ کھل گئی گھبرا کر اٹھ گئے اور اپنے خواب کی تعبیر خود ہی یہ دہی کہ میرا حصہ خواجہ صاحب کے یہاں ہے مجھے وہیں چلنا چاہیے۔ چنانچہ پھر واپس آئے اور اطلاع کرائی، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نے بلا لیا اور مولانا کو دیکھتے ہی فرمایا اجمی خواب و خیال کا کیا اعتبار؟ اب تو مولانا جامی کو اور عقیدت ہو گئی عرض کیا کہ حضرت بیعت فرما لیجئے۔ فرمایا کہ پہلے تم نے جو مصرعہ پڑھا تھا اسے پھر سناؤ۔ مولانا نے عرض کیا کہ حضرت وہ تو میری ناواقفیت تھی اور گستاخی ہوئی اسکی معافی چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ نہیں میں کہتا ہوں کہ وہ مصرعہ پڑھو۔ بہر حال شیخ کے اصرار پر مولانا نے عرض کیا کہ میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ ع

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد

فرمایا کہ بات تو تم نے ٹھیک کہی لیکن اس میں دوسرا مصرعہ یہ بھی لگا لو ع
اگر دارو برائے دوست دارد

دیکھو اگر میرے پاس مال نہ ہوتا تو تم کو کیسے رہا کرتا۔

چنانچہ مولانا جامی کا تعلق جب خواجہ عبید اللہ احرار سے ہو گیا اور اسکے بعد جب مولانا کو خواجہ صاحب کی کامل معرفت ہو گئی تو وہی مولانا جامی یہ بھی فرماتے تھے کہ

چونکہ اندر قبائے شاہی آمد بہ تدبیر عبید اللہی آمد
 (فقیری جب قبائے شاہی میں آئی تو خواجہ عبید اللہ احرار کے ہاتھوں آئی
 یعنی یہ کہ شاہی اور فقیری ان دونوں میں کچھ منافات نہیں ہے ایک فقیر مزاج بھی
 بادشاہ ہو سکتا ہے اور ایک بادشاہ فقیر ہو سکتا ہے لیکن اسکے لئے طریقہ اور
 تدبیر کی ضرورت ہے چنانچہ فقیری نے شاہی قبائے اس وقت زیب تن کی جبکہ خواجہ
 عبید اللہ احرار کی تدبیر اور انکا سا انتظام اسے میسر آیا مطلب یہ کہ انسان کے
 اندر اگر حضرت خواجہ احرار جیسی بے نفسی اور للہیت، حمایتِ خلق اور غریب پروری
 پیدا ہو جائے تو پھر وہ امیر کبیر بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ بس حضرت اقدس نے
 اس واقعہ کو بیان کر کے یہی سبق دیا کہ امیر اور دنیا دار مراد نہیں ہے۔ پھر اگر
 آدمی امیر ہو اور دیندار ہو تو اسکو تو حدیث میں بھی نعم المال الصالح لرجل الصالح
 بھی فرمایا ہے۔ یعنی صالح مال ایک صالح انسان کیلئے کیا ہی اچھی چیز ہے۔

اور اسکے بعد حضرت نے مال کے مسئلہ کو ایسا ایسا واضح فرمایا ہے کہ اسکی
 صحیح حیثیت لوگوں کے ذہنوں میں آگئی ورنہ تو اس باب میں لوگ افراط و تفریط
 ہی میں مبتلا تھے یعنی یا تو مال کو مطلقاً مذموم سمجھا جاتا تھا اور یا نہیں تو پھر مالدار کیا
 آدمی اگر دنیا دار ہو جائے تو اسکو بھی برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت والا نے اپنی
 مجالس میں اس مسئلہ کو بالکل صاف فرما دیا کہ مال نہ تو مطلقاً مذموم ہے اور نہ مطلقاً
 محمود ہے بلکہ انسان کے اگر وہ جیب اور بکس ہی میں رہے تو خیر غنیمت ہے اور اگر دل میں
 اتر جائے تو یہ حال برا ہے جیسے پانی کہ اگر وہ کشتی کے نیچے رہے تو اسکے چلنے کا ذریعہ
 ہے اور اگر کشتی کے اندر آ جائے تو تباہی کا باعث بھی ہے۔ چنانچہ ان مضامین
 کی قدر حضرات علماء نے فرمائی۔ باقی عوام کا تو ہر زمانہ میں یہ حال رہا ہے کہ وہ علم کی
 باتوں کا مقابلہ لاکھی ہی سے کرتے رہے۔

اسی طرح دوسرے معاملہ میں ایک دن بس یہ فرمایا کہ آپ کے اس شہر
 میں اگر مجھے ایک فیض یہ ملا کہ اپنے پیر کو گالی دیتے اپنے کانوں سے سنا۔ ورنہ

اتنا تو جانتا ہی تھا کہ اہل بدعت حضرت مولانا تھانوی ہی کو کیا تمام علماء ردیو بند کو برا کہتے ہیں اور کافر بناتے ہیں لیکن اپنے کانوں سے اپنے پیر کو برا بھلا کہتے ہوئے یہیں الہ آباد ہی میں آکر سنا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اور یہ فرمایا کہ سنا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے شیخ کی مخالفت کی۔ حالانکہ مدرسہ میں جا کر دیکھ لو پڑھا رہے ہوں گے کہ ہدایہ اور شرح وقایہ میں ہے کہ خلافاً للشافعیؒ یا قال ابوحنیفہؒ کذا خلافاً لابن یوسفؒ یا خلافاً للحمیدیؒ تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ امام ابو یوسفؒ یا امام محمدؒ اپنے شیخ اور استاذ ابو حنیفہؒ کے مخالف تھے اور انکا یہ فرمانا مخالفت تھا، اگر یہی مطلب سمجھا اور سمجھایا گیا تو بقول قائل ۷

گر ہمیں مکتب و ہمیں مِلّا کارِ طفلان تمام خواہ شد
(اگر ایسے ہی مدرسے اور ایسے ہی پڑھانے والے رہے تو بچوں کا کام تمام ہی سمجھو)
ظاہر ہے کہ کسی سے اختلاف کرنا اور چیز ہے اور کسی کا مخالف ہونا اور بات ہے
بس اسی طرح سے یہ حضرات یعنی حضرت مولانا تھانویؒ یا حضرت مولانا گنگوہیؒ کو
حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے بعض مسائل فقہیہ میں اختلاف ضرور ہوا
لیکن اسکو مخالفت سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ
ان حضرات نے اپنے پیر کی مخالفت کی لیکن خود پیر کو یعنی حضرت حاجی صاحب کو اسکا
کچھ بھی خیال نہیں تھا بلکہ جو لوگ اس سلسلہ میں ہیشتم کشی کر رہے تھے انکی نظر
سے ملال ہوتا تھا۔ چنانچہ غالباً کسی نے ہند میں مشہور کر دیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ
مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے سخت ناراض ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت
گنگوہیؒ کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی حضرت نے حاجی صاحب کو خط لکھ کر
استصواب فرمایا اس پر حضرت حاجی صاحبؒ کا جو جواب آیا اس نے اہل عناد کا
قصر ہی ڈھا کر رکھ دیا۔ تحریر فرمایا کہ :-

”ایک ضروری اطلاع یہ ہے کہ فقیر آپ کی محبت کو ذریعہ نجات سمجھتا ہے

الحمد للہ تعالیٰ نے آپ کی محبت کو میرے دل میں ایسا محکم کر دیا ہے کہ کوئی شے اسکو ملا نہیں سکتی اور میں اپنے سب اجباب کی محبت کو اپنے لئے وسیلہ نجات جانتا ہوں اور یقین جانوں کہ مجھ کو دنیا میں کسی سے ملال و کدورت نہیں ہے تو پھر اپنے عزیزوں سے جو اس گنہگار کے عقبی کے حامی ہیں کیونکہ کدورت رکھونگا۔

_____ اول تو کسی کو مقدور نہیں کہ فقیر کے سامنے آپ کے خلاف زبان ہلاوے کیونکہ اس بارہ میں اسکو سوا میرے رنج و ملال کے کیا فائدہ ہوگا۔ دوسرے جو کوئی فقیر کو دوست رکھتا ہے وہ ضرور آپ سے محبت رکھتا ہے تو اسکے خلاف کبھی کوئی تحریر آپ کے پاس جاوے تو اسکو باور نہ کرنا۔ عزیزم دل محل ایمان و معرفت و محبت ہے نہ محل کینہ و کدورت۔ آپکی دعا میرے حق میں مقبول ہے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اب اس اخیر زمانہ میں میرے دل کو نور ایمان و محبت و معرفت سے نور علی نور فرمادے۔ فقط

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کا خط ہے فقیر العصر حضرت مولانا گنگوہیؒ کے نام — چنانچہ حضرت مولانا تھانویؒ سے کبھی زیادہ جو بزرگ مسائل شرعیہ میں سخت تھے ان کے ساتھ حضرت حاجی صاحبؒ ہاجر مکیؒ کی کیسی محبت اور کیسے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مضمون خط سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کو حضرت مولانا گنگوہیؒ سے مخالفت و عناد رکھنے والوں کی مخالفت کا بھی اندازہ تھا اور انکی اس نوع کی حرکات بھی حضرت حاجی صاحبؒ مطمئن نہ تھے کہ دور کا معاملہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص میری ہی جانب سے کوئی تحریر ہندوستان بھیج دے اور اسکی وجہ سے مولانا پریشانی میں پڑ جاویں اسلئے صاف لکھ دیا کہ اگر اس کے خلاف کبھی کوئی تحریر بھی جاوے تو اسے باور نہ کرنا اسلئے کہ وہ دراصل میری تحریر ہی نہ ہوگی بلکہ کسی ہر بان کی حرکت ہوگی۔

دیکھا آپ نے ایسی صریح دستاویز کے بعد بھی اغیار کی جانب سے امن نہ تھا۔ تو پھر کسی سے محض اختلاف کو نوا لے کر اسکا مخالفت اور اسکے خلاف کرینگو مخالفت کہہ دینا کون سی بڑی بات ہے۔

عرض حضرت نے حضرت تھانویؒ کی حضرت حاجی صاحب سے مخالفت کا اعتراض اور اسکا جواب اپنی مجلس میں ذکر فرمایا جو الحمد للہ بہت ہی موثر ثابت ہوا اور پھر اسکے بعد ”مرید نے پیر کی مخالفت کی“ اس موضوع پر اہل بدعت کی کوئی تقریر نہیں سنی گئی۔ اور یہ پیر امیر کبیرؒ ”یا بہت روپے والے ہیں“ اس قسم کی باتوں کا چرچا بھی کم بلکہ قریب قریب ختم ہی ہو گیا۔

اس سلسلہ میں حضرت والا کا ایک اور واقعہ یاد آگیا وہ یہ کہ حضرت کا معمول تھا کہ اکثر جمعہ کو مجلس سے فارغ ہو کر مولوی عبد المجید صاحب اسرار کریمی پریس والے، کو یا کسی اور کو ہمراہ لیکر محلہ کٹرہ مسجد مینا شاہ پر قاری حبیب احمد صاحب مدظلہ کے یہاں تشریف لے جاتے وہیں آرام فرماتے نماز جمعہ ادا فرماتے اور قبل عصر واپس تشریف لاتے۔ اس سے حضرت کا مقصد غالباً مجمع سے تنہا ہو کر ذہنی سکون حاصل کرنا تھا۔ قاری حبیب احمد صاحب مدظلہ راوی ہیں کہ اسی طرح حضرت والا ایک دفعہ

مولوی عبد المجید صاحب کے ہمراہ تشریف لائے اور مسجد کے حجرہ میں قیام فرمایا حضرت والا لیٹے لیٹے کچھ گفتگو فرما رہے تھے ہم دونوں پاس بیٹھے ہوئے تھے حضرت کو منشرح دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ حضرت رکشے پر تشریف لاتے ہیں تھک جاتے ہوں گے، مولوی عبد المجید صاحب نے کبھی اپنی کار بیچ دی ورنہ تو حضرت جیسے کے لئے مناسب تھا کہ ایک کار دروازہ پر کھڑی رہتی اور حضرت جبکہ جہاں تشریف لے جانا چاہتے اس پر تشریف رکھتے اور آرام سے چلے جاتے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ حضرت والا میری بات کو بغور سنتے رہے اور اسکے بعد فوراً مولوی عبد المجید صاحب کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا کہ مولوی عبد المجید صاحب! یہ میں نے مکان جو خرید رہا ہے تو کچھ اپنے لئے نہیں لیا ہے بلکہ اپنے بچوں کے لئے لیا ہے کہ کل کو

وہ میرے بعد یہ نہ کہیں کہ میرے باپ نے ہمکو یہاں پر دیس میں لا کر بے سرو سامان چھوڑ دیا اور حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے بعد محتاج یعنی حاجت مند اور غریب نہ چھوڑ جاؤ کہ وہ دوسروں کے دست نگر رہیں۔ اور دیکھو میرے ساتھ اتنے لوگ بھی تو تھے، طلبہ تھے، آنے جانے والے مہمان تھے، اتنا بڑا مکان نہ ہوتا تو سب کا کام کیسے چلتا؟ باقی خود میری ذات کے لئے تو کسی مسجد کا صحن اتنا بڑا حجرہ کافی تھا مجھے نہ حویلی کی ضرورت تھی نہ موٹر کار کی قاری حبیب احمد صاحب فرماتے تھے کہ حضرت کی یہ تقریر سنکر میں تو پانی پانی ہو گیا اور مجھے بیدار مت ہوئی کہ میں نے یہ ذکر کیوں کیا۔

راقم عرض کرتا ہے کہ سبحان اللہ حضرت والا کی بھی کیا شان اصلاح تھی کہ مکان کی خریداری پر مخالفین کو تو وہ جواب دیا جو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اور اپنے ایک خادم مولوی کے ذہن جہاں ان چیزوں کا تصور آیا تو اسکو اس طرح سے کھرج کر نکال دیا اور اپنی پسند اپنا ذوق اس پر ظاہر کر کے اسکو بھی اسی ذہن و پسند کی طرف متوجہ ہونے کی جانب منہائی فرمائی۔

بہر حال خریداری مکان کے سلسلے میں چونکہ غیر معمولی حالات سامنے آ گئے تھے اسلئے ہم نے بھی کسی قدر تفصیل سے انکا ذکر اس غرض سے کر دیا کہ حضرت اقدس کے متوسلین کو ایسے مواقع پر حضرت کی سیرت یاد آ کر عمل کی جانب داعی بنے کہ حضرت اقدس نے اپنے حسن خلق اور صبر و ضبط ہی کی وجہ سے اہل اموی پر فتح پائی تھی اور تمام عمر اپنے لوگوں کو یہی چیز سکھلاتے رہے اور یہی خلق اپنے متوسلین میں دیکھنا پسند کیا

چنانچہ حضرت اقدس کے یہی وہ اخلاق و معاملات تھے جن سے متاثر ہو کر جامع معقول و منقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ نے حضرت اقدس کو اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ :-

”مخدوما! خانقاہ تھانہ بھون۔ رائے پور، دور گنگوہ کی ویرانی

کے بعد طبیعت بہت افسردہ رہتی تھی۔ البتہ آپ کے احوال و کوالف
 شکریہ مایوسی مبدل بہ توقعات و مسرت ہو جاتی تھی اور سمجھ میں آتا تھا کہ
 وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے
 کہ اس نے آپ سے ملاقات کے وسائل ہم پہنچائے اور میری دیرینہ
 آرزو پوری ہوئی۔ آپ سے ملاقات کے بعد مسرت کی بے پایاں میں
 برابر اضافہ ہوتا گیا ملاقات کی مدت اگرچہ بہت مختصر تھی مگر اس ملاقات
 سے جو تاثرات مرتب ہوئے وہ نہایت دیر پا اور بے پایاں ثابت ہوئے
 اب بھی اس ملاقات کی مسرتیں اور سرشاریاں میرے دل میں بحالہ
 باقی ہیں۔

آنحضرت کو میں نے کمال صلاح و اصلاح سے متصف پایا اور
 آپ کے طریق اصلاح کو اس آیت کا پورا نمونہ پایا وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ
 يَكْفُرُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (یعنی تم انکے
 معبودوں کو برا مت کہو مبادا وہ جہالت کی وجہ سے خدا کو برا کہنے لگیں)
 اس نفاق اور سلب کمال کے زمانہ میں غیروں کو اپنانا اور اپنوں کو گلے لگانا
 وہ جنس گرا نمایاں ہے جسکا کم از کم اس زمانہ میں ملنا دشوار ہے۔ آپ کا
 انداز اصلاح مدعیان تصوف کو بلا کسی جنگ و جدل اور حیلہ و تدبیر کے
 شکست فاش دے چکا ہے اور یہ شعر آپکی اصلاحی مساعی پر پوری
 طرح صادق آتا ہے

گرا میں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پروا سختے

اگر یہ مدعی محبت خدا کا عادت ہوتا تو اپنے دشمن سے لڑنے میں مصروف نہ ہوتا،
 کیونکہ آپ نسبت محمدی (علی صاحبہا الف تیجہ) کے مظہر کامل ہیں نسبت کے
 حاملین کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

چنانچہ حضرت والا کے اسی نرمی اور خلق محمدی پیش فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ مخالفین

اپنا کام کرتے رہے اور حضرت اقدس کے یہاں نئے نئے لوگ برابر بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے عوام و خواص ہر طبقہ میں حضرت کی نصرت کرنے والے بنا دیئے و اللہ اعلم۔

اس سلسلہ میں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس کی نصرت کیونکر فرمائی دو حضرات کے واقعات لکھتا ہوں ایک صاحب تو عامی ہیں لیکن شہرت میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں دوسرے صاحب الہ آباد کے خواص میں شمار کیے جاتے ہیں۔ میری مراد پہلے صاحب سے اپنے صدیق مخلص برادر ام انیس احمد صاحب ساکن پیر خاص ہیں۔ آپ انکی کہنی خود انکی زبانی سنئے۔ اور یہی طریقہ اس زمانہ میں کسی معاملہ کا مصدق ہو سکتا ہے ورنہ تو اس زمانہ کی روایات نے اپنا اعتبار بالکل ہی کھو دیا ہے ہمارے حضرت عظیم الامۃ اسی سے متاثر ہو کر یہ فرمایا کرتے تھے کہ خبر (روایت) کے معنی تو علماء نے یہ بیان کئے ہیں کہ مایکتل الصدق و لکذب یعنی خبر وہ ہے جو صدق اور کذب کا احتمال رکھے لیکن اخبار دیکھنے اور سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خبر سکو کہتے ہیں جس میں صدق کا احتمال بھی نہ ہو۔ اور حکیم الامتہ نے مزاح کے انداز میں ایک حقیقت بیان فرمادی ہے کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ فی زمانہ روایت ہے باب میں عوام تو عوام بہت سے خواں اور پڑھے لکھے لوگ بھی ایسا غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کر جاتے ہیں جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید ان کے پیش نظر کذب کی مذمت باقی نہیں رہ گئی ہے یا البیاد با اسکو وہ حلال سمجھتے ہیں جو منہ میں آیا کہہ گزرے و وجوہات ان کے قرین مصلحت ہوئی زبان سے نکال دی خواہ عالم حقیق میں وہ بات سیاہ جھوٹ ہی کیوں ہو اناللہ وانا الیہ راجعون اسلئے میں نے عرض کیا کہ اس زمانہ میں روایت وہ قابل اعتبار ہے جس میں راوی خود آپ بیتی بیان کرے۔ بنا چہ بھائی انیس صاحب نے اپنے سابقہ خیالات اور حضرت مصلح الامتہ کے دربار میں اپنی حاضری کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح بھی ہے اور حضرت

اقدس کی نصرت جو منجانب اللہ ہوئی اسکی کڑی بھی ہے اسلئے اسکو انھیں
کے لفظوں میں پیش کرتا ہوں

(بھائی انیس احمد پُر خاصوی کی کہانی خود انکی زبانی)

بیان کرتے ہیں کہ میں بچپن ہی سے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب
کا معتقد اور بریلوی مسلک کا دلدادہ تھا۔ علماء بریلی (یعنی ان کے مقررین اور
میلاد خوانوں) میں خاص مقام رکھتا تھا اسلئے کہ خود بھی نعت شریف کہتا اور
عمدہ ترنم کے ساتھ پڑھتا بھی تھا اسلئے آس پاس کے جلسوں میں میرا بھی نام
شایع ہوتا تھا اس طور پر اس اپنے صوبہ کے تمام ہی علماء سے میرے تعلقاً
اور روابط تھے چونکہ اپنے مسلک پر نہایت پکا تھا اسلئے عرس کے موقعوں پر
مزارات پر بھی حاضری ہوتی تھی حتیٰ کہ اچھا پڑھنے ہی کی وجہ سے محرم میں نوہ
اور مرثیہ خوانی کے لئے شیعہ حضرات اپنی محفلوں میں مجھے بھی بلا تے تھے۔ میں جاتا اور
نوہ پڑھتا تھا۔ (اور غیر مجھے تو اب معلوم ہوا کہ شریعت میں نوہ اور مرثیہ خوانی اور
اور سینہ کو بی کی ممانعت ہے تاہم علماء بریلی میں سے کسی نے اسپر نہ کیا نہیں
فرمائی) اور اعلیٰ حضرت سے غالباً نہ عنایت کا یہ عالم تھا کہ میں بھی ان تمام
لوگوں کو اسلام سے خارج سمجھتا تھا جن پر ہمارے اعلیٰ حضرت نے کفر کا فتویٰ
لگایا تھا جن میں دیوبندیہ و ہابییہ سرفہرست تھے۔

ایک مرتبہ الہ آباد سے مولانا محمد میاں صاحب فاروقی نبیر حضرت مولانا
شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی ہمارے گاؤں پُر خاص تشریف لائے میرے ہی
یہاں مولانا کا قیام تھا گھر اور گاؤں کے بہت سے حضرات مولانا کی خدمت میں حاضر
تھے میں بھی جا کر قریب ہی بیٹھ گیا۔ اپنے مسلک میں انتہائی متشدد اور طبیعت کا
جرمی واقع ہوا تھا اسلئے مولانا سے بے جھجک عرض کیا کہ حضرت بڑے افسوس
کی بات ہے کہ شہر میں آپ جیسی مہتی موجود ہو اور وہاں ایک وہابی آکر اپنا رنگ

جمالے۔ یہ روشن باغ میں کون آگیا ہے کہ سب طرف سے لوگ جا جا کر وہابی ہوئے چلے جا رہے ہیں اور آپ لوگ خاموش تماشا دیکھ رہے ہیں اس کا کچھ افساد نہیں فرماتے۔ اسی نوع کے بلکہ اس سے بھی سخت بے ادبی کے کلمات حضرت مولانا فتچپوری رحمۃ اللہ کی شان میں میری زبان سے نکلے یہ سنکر مولانا محمد میاں بڑی زور زور سے اپنا دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے اور فرمایا کہ تو بہ تو بہ برخور دار تم نے ایک اتنے بڑے ولی کی شان میں ایسی بات کہہ دی اس سے مجھے بیکہ تکلیف ہوئی میں آپ کا مہمان ہوں اسلئے آپ سے صرف یہ کہتا ہوں ہوں کہ کسی ولی اور بزرگ کی شان میں بے ادبی اچھی چیز نہیں ہے۔ خدا کا غضب مول لینا ہے سخت ہلک ہے۔ آپ نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی لہذا اب یا تو آپ میرے سامنے سے ہٹ جائیے یا مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہاں سے چلا جاؤ مولانا محمد میاں کی زبان سے ان کلمات کو سنکر میرے بعض عزیزوں نے مجھے اشارہ کیا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور حضرت مولانا سے معذرت کر کے مولانا کو راضی کر لیا۔

ادھر مولانا محمد میاں صاحب کی اس بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنے مکان کے ایک گوشہ میں جا کر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا اور خوب رویا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ میں اس وقت بڑی الجھن میں پڑا ہوا ہوں مجھے ہدایت عطا فرمائیے۔ یا اللہ! میں کدھر جاؤں؟ یہ محمد میاں فاروقی جن کے یہاں عرس ہوتا ہے جو اجمیر شریف کے عرس میں بھی جاتے ہیں۔ سنی عالم ہو کر بھی ایک وہابی کو کیسے بزرگ کہہ رہے ہیں۔ جبکہ اعلیٰ حضرت نے ان سب کو کافر کہا ہے اسی طرح دل دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہا اور ہدایت طلب کرتا رہا۔ عصر تک اسی طرح بیقرار رہا کہ اچانک قلب میں یہ ارادہ پیدا ہوا کہ حضرت مولانا فتچپوری کو چل کر خود دیکھا جائے۔ چنانچہ پہلی حاضری حضرت والا کے یہاں اس طرح ہوئی کہ اپنے گاؤں پر خاص سے چلکر شہر الہ آباد آیا اور روشن باغ پہنچ کر

حضرت والاؒ کے مکان کے پاس آیا اور کسی صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت مولانا سے ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے انھوں نے کہا کہ اب نماز ظہر کا وقت قریب بہتر ہے کہ آپ مسجد میں حضرت سے ملاقات کر لیں حضرت مسجد تشریف لیجانے ہی والے ہیں۔ چنانچہ ڈھال والی مسجد میں آیا پہلی بار قدم رکھا تو عجیب منظر دیکھا۔ دیکھا کہ مسجد بالکل منور ہے اور ایسی نورانی ہے کہ میں اس کے بیان سے قاصر ہوں (یہ میرے اپنے تاثرات ہیں جو عرض کر رہا ہوں) میں مسجد میں ایسے وقت داخل ہوا تھا کہ اذان ظہر ہو چکی تھی بہت لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے کچھ لوگ وضو کر رہے تھے، عمر بھر میں پہلی دفعہ میں نے اتنی تعداد میں کم عمر طلبہ کو شرعی لباس میں دیکھا یہ منظر بھی مجھے ایسا حسین معلوم ہوا کہ میری حیرت اور تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہ گئی سبحان اللہ! مسجد کو جو دیکھا تو کچھ کچھ بھری ہوئی تھی یہ نظارہ بھی میں نے شاید پہلی بار ہی دیکھا تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ تقریباً سب ہی حضرات کے چہرے پر شرعی ڈاڑھی موجود دیکھی اور چھوٹے بڑے سب ہی طلبہ کو شرعی لباس پہنے ہوئے دیکھا۔ انکو دیکھ کر میری حیرت اور زیادہ ہو گئی کہ دیکھو تو یہ لوگ کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ عام طور سے سب ہی لوگوں کا وہی مخصوص لباس تھا جو حضرت مولانا کا تھا یعنی سفید کرتا۔ شرعی پاجامہ اور چوگوشہ گول ٹوپی اور اسی لباس میں معصوم طلبہ بھی تھے۔ دینداروں کا یہ منظر دیکھ کر دل کی جو حالت تھی ناقابل تحریر ہے۔ مسجد کے اندر تمام مجمع بالکل خاموش اور پرسکون تھا کوئی سنت پڑھ رہا تھا اور جو پڑھ چکا تھا وہ تسبیح لئے خاموشی کیساتھ ذکر میں مشغول تھا کوئی یاد خدا میں مراقب بیٹھا تھا اگر کوئی شخص کسی سے کچھ کہنا چاہتا تو نہایت خاموشی کے ساتھ بلکہ اشاروں سے بات کرتا تھا۔ میں نے بھی وضو سے فارغ ہو کر سنت پڑھی اور مسجد کے شمال کی جانب صحن ہی میں بیٹھ گیا اور پاس کے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت مولانا صاحب کون ہیں انکی زیارت کے لئے آیا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت ابھی تشریف نہیں لائے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔

حضرت مولانا کے شوق دیدار میں مسجد کے دروازہ کی طرف ٹھٹکی باندھ کر دیکھنے لگا اور ہر نئے آنے والے پر جو مشرع صورت ہوتا یہ گمان کرتا کہ شاید یہی حضرت مولانا ہیں اور اس سلسلہ میں مجھے اپنے پاس والے سے بار بار دریافت کرنا پڑا۔ بالآخر انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ نہیں صاحب آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں خاموش بیٹھے رہے۔ جب حضرت مولانا تشریف لائیں گے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کسی دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ اُن کے اس جملہ کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میرا دماغ کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اب میرے دماغ میں یہ بات گونجنے لگی کہ۔ ارے بھائی یہ مولانا آخر کتنے بڑے بزرگ ہیں کہ انکے آنے پر بغیر تعارف کراے ہوئے ایک اجنبی آدمی کیسے خود بخود انھیں پہچان لے گا، کیا وہ بشری لباس میں نہ ہونگے۔ کیا عام انسانوں سے انکی صورت و شکل اور ہاتھ پاؤں مختلف ہونگے یا شاید انکا کوئی خاص امتیازی لباس (عبار چو غا وغیرہ) ہوگا جسے وہ زیب تن کئے ہونگے اسکی وجہ سے پہچاننے میں سہولت ہوتی ہوگی اسی قسم کے خیالات میں غلط و بیجاں تھا کہ اتنے میں حضرت مسجد میں داخل ہوئے تو واقعی بقول ان صاحب کے کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی حالانکہ لباس میں کوئی امتیاز نہ تھا لیکن کیا عرض کروں کہ حضرت کس شان سے مسجد میں داخل ہوئے اس کا بیان تحریر سے باہر ہے اسکا تعلق کچھ دیکھنے ہی سے تھا۔ الغرض حضرت تشریف لا کر سنت میں مشغول ہو گئے لیکن میں نے اپنے دلی اطمینان کی خاطر پھر ان صاحب سے پوچھ لیا کہ کیوں صاحب اب تو غالباً حضرت مولانا یہی ہیں انھوں نے کہا جی ہاں۔ حسن اتفاق سے میں جس صف میں تھا حضرت والا کھوڑے فاصلہ سے اسی میں سنت پڑھ رہے تھے مجھے موقع مل گیا اور میں جی بھر کہ حضرت کو دیکھنے لگا۔

اب مجھ پر کیا بنی اور میرے دل و دماغ میں کیا کیا باتیں آنے لگیں اور کیسے کیسے خیالات گزرنے لگے اسکو میرا دل ہی جانتا ہے۔ حضرت کو دیکھتے دیکھتے میری نگاہ ایک دم تمام نمازیوں پر پڑی ہر شخص کو بغور دیکھ رہا تھا یہاں تک کہ مسجد کی بناوٹ اور

اسوقت کا ایک نورانی کیف قلب کو متاثر کر رہا تھا، اسی اثنار میں پہلا سوال جو میرے دل میں پیدا ہوا یہ تھا کہ کیا یہ سب لوگ جو مشرع صورت مسجد میں موجود ہیں اور جنکی صورت سے نور ٹپک رہا ہے ایسا کہ دل بے اختیار انکی جانب کھینچ رہا ہے کیا یہ سب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بزرگان دین کو نہیں مانتے اور انکی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اسکا جواب خود بخود یہ ذہن میں آیا کہ نہیں ایسا نہیں ہے کیونکہ اگر ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) امانت ہی کہنی ہوتی تو اپنی شکل و صورت، لباس و وضع شریعت اور سنت کے مطابق نہ بناتے اور جس سکون اور آداب کے ساتھ یہ لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں یہ طریقہ تو حضور ہی کا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے کتنے پابند تھے اور فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اسلئے بغیر حضور سے محبت کے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک بات یہ کہ یہ لوگ بہت سی باتوں کو منع کرتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر اس کو ناجائز بتلاتے ہیں (جسکو ہم لوگ کرتے ہیں) اس میں یہ لوگ بالکل نہیں ڈرتے۔ اسیر سے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں کو محبت نہ ہوتی تو ابھی اذان ہوئی ہے اس میں اشہد ان محمد رسول اللہ نہ کہتے بلکہ اذان میں بھی تبدیلی کر دیتے آخر شیعہ حضرات نے اذان میں تبدیلی کر ہی دی ایسے ہی انکی اذان ایک تیسرے قسم کی ہوتی۔

بہر نوع اسی نوع کے خیالات میرے دماغ میں چھائے ہوئے تھے اور میں اسی میں غلطیاں و بیجاں تھا کہ دفعۃً یہ خیال آیا کہ میاں انیس یہ تمھیں کیا ہو گیا کہ تم ان دہائیوں کو یونہیوں کی صداقت و عظمت اور ان کے مسلمان ہونے کا یقین کرتے جا رہے ہو جن کے متعلق ہمارے اعلیٰ حضرت ہی نے نہیں بلکہ عرب و عجم کے علماء نے کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ خبردار اسنے ایمان کی حفاظت کرنا اور اس قسم کے خیالات کو جن سے ان لوگوں کے حق میں ہونے کا یقین پیدا ہوا اپنے دماغ سے نکالو۔ اسکے بعد میں نے لا حول پڑھا اور گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد

پھر تقاضا پیدا ہوا کہ حضرت مولانا کو تو ایک بار پھر دیکھ لوں چنانچہ نگاہ اٹھا کر حضرت کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ حضرت سنت سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے گا ہے اس طرف گا ہے اُس طرف نگاہ پھیر رہے ہیں اور مصلیوں کا عالم یہ ہے کہ سب کے سب گردن جھکائے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں اور جیسا کہ حدیث شریف میں حضرات صحابہ کرام کے بیٹھنے کا ذکر آتا ہے اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک اور بزرگ کے سامنے یہ لوگ بھی اسی طرح بیٹھے ہوئے ہیں جس نے کانہم علی رؤسہم الطیر (گویا کہ انکے سروں پر چڑیا بیٹھی ہوئی ہو) کا نقشہ سامنے کر دیا۔ یہ مناظر میرے دل پر کیسے کچھ اثرات چھوڑ رہے تھے اسکو میرا دل ہی جانتا ہے۔ پھر دیکھا کہ حضرت کی نگاہ میری جانب ہے میں اسکی تاب نہ لا سکا چنانچہ عظمت اور ہیبت کی وجہ سے میری نگاہ نیچی ہو گئی مگر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد میں نے ہمت کر کے دوبارہ جب حضرت کی طرف دیکھا تو دیکھا کہ حضرت کی نظر اب بھی میری ہی جانب ہے پھر تو میرے ہوش اڑ گئے۔ اب یہ طے کر لیا کہ حضرت کی طرف نہ دیکھوں گا اسلئے کہ یہ خیال ہوا کہ شاید انھیں کشف کے ذریعہ میری حالت اور موجودہ میرے گندے خیالات کا علم ہو گیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے مسجد ہی سے نکلوا دیں لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ ارے بھائی یہ تو وہابی ہیں کشف و کرامات اور روشن ضمیری سے انھیں کیا واسطہ چنانچہ اس خیال کے آتے ہی ہمت کر کے پھر جو نظر اٹھائی تو دیکھا کہ حضرت کی نگاہ کرم اب بھی میری ہی جانب بدستور قائم ہے۔ بس اس دفعہ نگاہ کا ملنا تھا کہ میرا کام ہو چکا تھا۔ اسکے بعد اقامت ہوئی اور سب لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے میں کن آنکھیں سے حضرت کو تو دیکھ ہی رہا تھا حضرت نے بھی اٹھتے اٹھتے ایک بار پھر مجھے بڑی لطف نگاہ سے دیکھا اور اب ہم سب لوگ فرض نماز میں مشغول ہو گئے۔

فرض نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں فوراً وہاں سے اس طرح سے بھاگا جیسے میری گرفتاری ہونے والی ہو مسجد سے روشن باغ میں آکر اپنے ایک عزیز کے گھر آ گیا اور سب سے پہلے اپنی نماز دہرائی اس خیال سے کہ وہابی کے پیچھے نماز

نہیں ہوتی۔ نماز سے فارغ ہو کر میں انکے ایک کمرے میں اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے آرام کرنے کے لئے جا کر لیٹ رہا۔ تنہائی ہونے کی وجہ سے میرے دل کی دنیا پھر آباد ہونی شروع ہوئی اور کبھی ایک اضطرابی اور اختلاجی کیفیت طاری ہوتی کبھی حضرت کی نظر اور مسجد کا دکش منظر یاد آ کر ایمانی لذت اور عبادت کی کیفیت محسوس ہوتی۔ غرض کافی دیر تک اسی سوتج اور فکر میں غلطاں و پیچاں چار پائی پر کروٹ بدلتا رہا، پھر معاً اللہ تعالیٰ کی جانب توجہ ہوئی اور یاد آیا کہ اب پہلے محمد میاں مدظلہ کی گفتگو کے بعد گاؤں میں بھی میری یہی کیفیت ہوئی تھی اور میں خوب رویا تھا اور رورور کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ گویا یہ سہارا ہے جس پر کہ گھبراؤ نہیں تمہیں صحیح راستہ مل جائیگا۔ چنانچہ اس گریہ و بکا کی لذت اس وقت بھی محسوس کر رہا تھا لہذا ایسی حالت میں پھر اللہ تعالیٰ ہی سے ہدایت کا طلب گار ہوا اور کروٹ لیکر لیٹے لیٹے خدا تعالیٰ کی جانب توجہ ہو کر عرض و معروض کرنے لگا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اسی طرح دیر تک چیخے چیخے روتا رہا کہ اتنے میں مجھے آہٹ ملی اور سمجھا کہ شاید صاحب خانہ میرے آرام کے سلسلہ میں اخلاقاً مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں، آہٹ کے ملتے ہی میرے آنسو ٹھہم گئے اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے یہ عزم لیکر چلا کہ انشاء اللہ میں حضرت مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کروں گا۔ چنانچہ عصر کے وقت اپنے ان عزیز کے مکان سے چل کر فائقہ شریف کی طرف کتاب حاصل کرنے کی عرض سے روانہ ہوا لیکن ابھی راستہ ہی میں تھا کہ پھر شیطانی وسوس نے مجھے پریشان کرنا شروع کیا۔ ایک خیال یہ آیا کہ میاں کیا تمہیں اس پر یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ دیوبندی لوگ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور ان کے عقائد باطل ہیں اور یہ لوگ اہلسنت و الجماعت سے خارج بلکہ اسلام ہی سے خارج ہیں جیسا کہ ہمارے علماء بریلی کہتے ہیں اسلئے واپس چلو ورنہ ایمان کی غیر نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انکی کتاب پڑھ کر ایمان ہی کھو بیٹھو، اسی لئے ان لوگوں کی کتابوں

کے دیکھنے کو ہمارے علماء منع کرتے ہیں۔ اس وسوسہ کا حملہ مجھ پر ایسا شدید ہوا کہ میں چلتے چلتے رک گیا اور کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ گھر واپس چلوں یا کیا کروں؟ چنانچہ چند قدم واپس ہوا پھر یکایک حق تعالیٰ کی جانب سے رہنمائی ہوئی اور دوسرا خیال معاً یہ آیا کہ اجماعی ہم جب کالج میں پڑھتے تھے تو اس میں آخر غیر مسلموں اور دیگر مذاہب کی کتابیں پڑھتے ہی تھے تو کسی مذہب کی صرف کتاب پڑھنے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان کو اپنے طریقہ میں پختہ ہونا چاہیے پھر کسی مذہب کا اسپر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس طرح سے ان لوگوں کی کتابوں کے پڑھنے میں کیا حرج ہے۔ پھر یہ کہ یہ لوگ اپنی حرکت سے باز آنے والے نہیں ان کتابوں میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے تو اپنے علماء کی تصدیق ہو جائیگی آخر تو پڑھے لکھے ہیں کچھ جاہل تو ہیں نہیں کہ کچھ سمجھتے بوجھتے نہ ہوں اور کوئی کسی کو جبراً تو دہابی بناتا نہیں اور نہ کسی پختہ سنی کو دہابی بنانا آسان ہے۔ ہاں کم فہم اور کم علم آدمی کے لئے بیشک دوسرے لوگوں کی کتابوں کا دیکھنا مضر ہے باقی کسی بچے شخص پر کیا اثر۔ اور اگر ہمارے علماء اس لئے منع کرتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں مقالات ہیں، کتاب و سنت کی تعلیم ہے، اخلاق اور صدق و امانت اور دیانت کی بحث ہے اسلئے ان کے دیکھنے کے بعد لوگ فوراً رسوم و بدعات سے نکل جائیں گے اگر اسلئے منع کرتے ہیں تب تو یہ صریح مداخلت ہے اور ایک بہت بڑی دینی خیانت ہے۔ کچھ اسی نوع کی باتیں ذہن میں چکر لگانے لگیں۔ اس وقت میری عمر ۲۲، ۲۳ سال کی تھی، الحمد للہ زمانہ حال کی آزادی کی ہوا سے محفوظ تھا یعنی آباد صرف حضرت مولانا کی زیارت کے داعیہ سے حاضر ہوا تھا اور ان وساوس کے بعد بھی یہ خیال نہ آیا کہ چلو شہر کی سیر کر کے مکان واپس چلیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو میری ہدایت منظور تھی اسلئے متعدد بار وساوس اور پھر اسکے جوابات کے ذریعہ طبیعت کو یکسو کر دینے کا سامان ہو رہا تھا۔ چنانچہ حضرت والا کی زیارت اور مسجد کے دکش نورانی منظر کے اثرات جو قلب پر چھا چکے تھے وہی غالب آئے اور اب میں نے قدم خانقاہ شریف کی طرف بڑھایا اور خانقاہ کے قریب ہی ایک کتاب کی دوکان (ادارہ اشرفیہ) کے قریب

کھڑا ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد دوکان میں داخل ہوا اور مالک دوکان سے جو ایک مولوی شکل کے تھے دریافت کیا کہ جناب مجھے یہ بتائیں کہ کیا حضرت والا نے کچھ کتب میں بھی لکھی ہیں؟ انھوں نے کہا جی ہاں تشریف رکھئے۔ میں نے کہا ذرا دو ایک کتاب مجھے دکھلائیے۔ چنانچہ یاد ہے کہ انھوں نے تلاوت قرآن - وصیۃ الاحسان اور اعتراضات ذنوب مجھے دی اور میں نے اجمالی طور سے انکا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان میں سے میں نے اعتراضات ذنوب کا انتخاب کیا کیونکہ اس میں میں نے اولیاء کرام کا نام جابجا دیکھا مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ - مولانا رومؒ - امام غزالیؒ - شیخ سعدیؒ وغیرہ دوکان سے اس کتاب کو لیکر روشن باغ کے چوراہے پر آیا اور کھڑا دیکھتا رہا کہ مشرع صورت آدمیوں کا ہجوم نماز عصر پڑھنے کے لئے مسجد کی طرف جا رہا ہے۔ دل میں تو آیا عصر کی نماز بھی حضرت ہی کی مسجد میں پڑھی جائے لیکن نفس اور شیطان نے پھر پریشانی کیا اور یہ خیال آیا کہ ایسی نماز سے کیا فائدہ کہ جسے پھر دہرائی پڑے یہ سوچکر اپنے ان عزیز کے یہاں چلا آیا اور وہیں نماز عصر پڑھی۔ دعار میں بہت رویا کہ اے اللہ! تو ہی میری مدد فرما اور میرے حال پر رحم فرما۔ غرض اسوقت پھر میری کیفیت اضطراب کی صورت اختیار کر گئی جنکو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

بہر حال نماز اور دعار سے فارغ ہوا تو میری ایک عزیزہ نے کہا کہ بھئی! آخر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ میں تمہیں بہت پریشان دیکھ رہی ہوں تمہارے چچا دفتر سے آتے ہوں گے کہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھلا دوں میں نے ان سے کہا کہ نہیں مجھے کوئی بیماری نہیں ہے اسوقت دین کا نشہ طاری ہے اس سے وہ مطمئن ہو گئیں کیونکہ میرے دینی جذبات سے واقف تھیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ آج کی شب یہیں قیام کر دوں گا۔ تھوڑی دیر بعد سعید الدین چچا بھی دفتر سے آ گئے رات کے وقت ان سے کچھ دینی بات چیت چلی اسی سلسلہ میں حضرت مولانا کا بھی ذکر آیا تو انھوں نے بھی حضرت کی بہت تعریف کی، کہا کہ وہ تو بہت بزرگ آدمی ہیں ان کے ماننے والے بہت ہیں اور رفتہ رفتہ دیکھ رہا ہوں کہ الہ آباد کے لوگ مولانا سے

بہت قریب ہوتے جا رہے ہیں اور اس محلہ کے بہت سے لوگ تو مرید بھی ہو گئے ہیں اور باہر سے بھی لوگوں کی آمد و رفت کا اتنا بندھا رہتا ہے۔ انکی مجلس میں ہر طبقہ کے لوگ جاتے ہیں۔ میں نے اس سچ ان سے پوچھا کہ مجلس کا کیا مطلب ہے انھوں نے کہا سب لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس میں حضرت مولانا کچھ وعظ بیان فرماتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس میں شرکت کی ہے؟ جواب دیا نہیں۔ میں نے کہا کیوں؟ کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بزرگ تو ضرور ہیں مگر وہابی ہیں اس لئے میں نہیں گیا اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں انھوں نے کہا کہ تم شاید کوئی کتاب پڑھ رہے تھے میں نے کہا کہ اس وقت تو نہیں پڑھ رہا تھا ماں عشار کے بعد ایک کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں انھوں نے پوچھا کونسی کتاب ہے۔ میں نے کہا مولانا وصی اللہ صاحب کی کتاب لایا ہوں۔ انھوں نے تعجب سے کہا ارے یہ تم کیا کہہ رہے ہو تم اور انکی کتاب! میں نے کہا کہ ہاں میں نے خرید لیا ہے تاکہ خود پڑھ کر دیکھوں کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کی شان میں کیا کیا کہا ہے کیونکہ اس کتاب میں چند بزرگوں کے نام میری نظر سے گذرے ہیں۔ اس کے بعد ان عزیز سے سلسلہ گفتگو ختم کر کے میں اپنے بستر پر گیا اور کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ اور مطالعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ یا اللہ میں اس کتاب کا مطالعہ تعصب کی عینک سے نہ کروں بلکہ مجھے غیر جانبدارانہ طور پر خالی الذہن ہو کر خلوص کے ساتھ اس کے پڑھنے کی توفیق عطا فرما۔ چنانچہ یہ دعا کر مطالعہ شروع کیا۔ اس کتاب میں حضرت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؓ کے علاوہ بہت سے بزرگان دین اور اولیاء کرامؓ کے ایسے ایسے واقعات ایسے موثر انداز میں لکھے ہیں کہ سخت سے سخت دل انسان بھی اگر خلوص سے انکو پڑھے تو متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا اور اگر دین کی کچھ فہم اور ذوق بھی اسے حاصل ہے تو بغیر روئے رہ نہیں سکتا۔ اس کے مطالعہ سے اس پر گہر یہ طاری ہو جائے گا اور بڑے سے بڑے متکبر

اور مغرور کا تکبر پاش پاش ہو جائیگا۔ کیونکہ اس کتاب میں حضرتؑ نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے اسی قدر اسکو اللہ تعالیٰ کی معرفت زیادہ ہوتی ہے اور اپنی معرفت بھی ہوتی ہے اسلئے وہ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرتا ہے اور اسکے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی عبادیت اور بندگی بہت پسند ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرتؑ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر صحابہؓ، تابعینؓ اور اولیائے کرام تک کے واقعات بیان فرمائے ہیں کہ ان حضرات نے کس کس طرح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں باوجود معصوم و محفوظ ہونے کے عاجزی، فروتنی اور انکساری اور تواضع اختیار کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں پڑھنے والے پر یہ اثر ہوتا ہے کہ جب انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح سے گریہ و زاری کی ہے رور و کر و عائیں مانگی ہیں، اسکے روبرو گر گرائے ہیں تو ہم گنہگار امتی اس دربار میں کس کیفیت کے تجھوے ہیں ہمیں اللہ تعالیٰ سے کتنا ڈرنا چاہیے۔

یہاں ہونچکر میں نے یہ بکلی سوچا کہ جب حضرت والا کی کتاب کا اتنا اثر پڑھنے والے پر پڑتا ہے تو براہ راست حضرت کی مجلس کی تاثیر کا کیا عالم ہوتا ہوگا کتاب کا ایک ایک واقعہ پڑھتا جاتا تھا اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا استحضار ہوتا جاتا تھا تو دوسری طرف اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا داعیہ قلب میں راسخ ہوتا جاتا تھا۔ اور جو سچ پوچھے تو پہلے بہت کچھ مزارات کی سیر کی لیکن اولیاء کرام کی صحیح معرفت اسی کتاب کے مطالعہ کی معرفت ہوئی۔ اب رات بھی کافی جاچکی تھی اور کتاب بھی ختم ہوگئی لہذا سو رہا اور بہت سو رہے ہی میری آنکھ کھل گئی، اٹھ بیٹھا اور شب کی تنہائی میں میری حالت غیر ہونے لگی یعنی ایک بار پھر شیطان سے مناظرہ کرنا پڑا۔ کچھ تو رات کے تاثرات کا اثر قلب پر پڑ چکا تھا لیکن وسوس کی پورش نے اس فیصلہ پر مجبور کر دیا کہ میاں مجلس و جلس میں کہاں جاؤ گے صبح اٹھکر چلو گھر چلو۔

میں پھر کشمکش میں پڑ گیا بالآخر وہی مجرب نسخہ کہ اضطراب کی حالت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دستگیری فرماتے ہیں یاد آیا اور میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے پھر دعا کی کہ اے میرے پروردگار مجھ پر رحم فرما آخر میری یہ باطنی حالت ایک حال پر کیوں قائم نہیں رہتی پارہ کی طرح ادھر ادھر کیوں لڑھک رہی ہے؟ میرے مالک مجھے ایک حال پر رکھ اور استقامت نصیب فرما! اس سے دل کو قدرے سکون ہوا اٹھا اور اٹھکر نماز فجر گھر ہی میں پڑھی اور مجلس کے وقت کے انتظار کی توفیق ہو گئی۔

الغرض وقت ہو گیا تو میں گھر سے خانقاہ کی طرف چلا چونکہ اس ماحول کے لئے نیا اور اجنبی سا تھا اس لئے روشن باغ کے چوراہے پر آیا اور کھڑا ہو گیا دیکھتا کیا ہوں کہ ہر چار جانب سے لوگوں کی آمد شروع ہے اور خانقاہ کے اوپر کے حصے پر جا رہے ہیں اور کچھ لوگ جو ادھر ادھر دکانوں پر چار چار پانچ پانچ کی تعداد میں پہلے سے کھڑے تھے وہ بھی اب اوپر کو ایک ایک کر کے جانے لگے۔ میں نے ایک صاحب سے ہمت کر کے یہ دریافت کیا کہ جناب کیا میں بھی مجلس میں چل سکتا ہوں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے انھوں نے کہا نہیں نہیں آپ شوق سے چلے اور آئیے میرے ساتھ چلے چنانچہ میں بھی اوپر چڑھ گیا دیکھا کہ صحن میں بہت سے مشرّع صورت کے لوگ، بہت سے مولوی نما حضرات سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں میں بھی سب کے پیچھے خاموشی سے جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد جو میں نے مجمع کی جانب نظر کی تو دیکھا کہ سامنے سہ درمی کے اندر (جسپر کھیل پڑا تھا) ایک گوشہ میں ایک چوکی کھپی ہے اور اس پر پشت کی جانب گاؤ تکیہ اور سامنے ایک چھوٹی سی تپائی جس پر چند کتابیں رکھی ہوئی ہیں اس سے میں نے یہی سمجھا کہ ابھی مولانا شاید اس مجمع میں نہیں تشریف لائے ہیں کمرہ میں ہیں اور اگر اسی منہ پر بیٹھیں گے اسکے بعد میں کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ سے بھی ایک ایک دودو کر کے چند حضرات

باہر آکر مجلس گاہ میں بیٹھ گئے اور اب سب لوگوں کی نگاہ اسی کمرہ کی جانب لگی تھی جس سے شاید حضرت مولانا تشریف لانے والے تھے یہ بھی دیکھا کہ مجلس کے کچھ لوگ مجھے بھی غور سے دیکھ رہے ہیں اس پر مجھے خیال ہوا کہ یہ لوگ مجھے اجنبی سمجھ کر دیکھ رہے ہیں اور یہ دیکھ کر تسلی کر لی کہ اور بھی چند حضرات ایسے تھے جن کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی اور لباس کوٹ و پتلون تھا انکو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا اور اب میں مطمئن ہو کر بیٹھا سب اہل مجلس کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا بعض حضرات مجھے اس مجمع میں ایسے نظر آئے جس نے اب تک کے اس خیال کی تردید کر دی کہ وہابی کے چہرہ پر نور نہیں ہوتا کیونکہ میں نے ایسی نورانی صورت اپنے سابقہ مجمع میں کبھی نہیں دیکھی تھی بہر حال لوگوں کی اس قدر مہذب اور شائستہ مجلس اور مجلس میں ایسی سنجیدگی سیج کہتا ہوں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی غرض جملہ سامعین بڑی بقراری کے ساتھ حضرت مولانا کا انتظار کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں حضرت والا کمرہ سے کسی صاحب کا ہاتھ پکڑے ہوئے نکلے اور تخت پر آہستہ سے رونق افروز ہو گئے۔ اب اہل مجلس کا رنگ ہی بدل گیا اور میرا تودل دھک دھک کرنے لگا (راقم عرض کرتا ہوں کہ شاید یہ اس لئے رہا ہو کہ ابھی یہ آنا ایمانی نہ تھا بلکہ امتحانی تھا اور یہ آنا آمد نہ تھا بلکہ آورد تھا یعنی خود نہیں آئے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے پیشانی پکڑ کر بھیجا تھا اس لئے ابھی قلب میں اعتقاد بھی نہ تھا اور سابق گندگیوں کا اثر تھا ہی اس لئے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں قلعی نہ کھل جائے۔ ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ

پیش اہل دل نگہدار یہ دل تاناہ باشی پیش اہل دل محفل

اللہ والوں کے سامنے اپنے دل کی بہت حفاظت کرنا اور نہ اہل دل کے سامنے تم رسوا ہی ہو جاؤ گے۔ چونکہ ابھی عقیدت کامل نہ ہوئی تھی تردد تھا اس لئے یہ انجمن تھی۔ واللہ اعلم

لیکن میں نے پھر اپنے کو سنبھالا اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ جس کی زیارت

کے تم تمنی تھے اللہ نے کرا دی۔ یہاں ایک لطیفہ اور سن لیجئے کہ حضرت والا کے تشریف لانے سے پہلے میرے ذہن میں یہ آ رہا تھا کہ مولانا جوں ہی کمرہ سے باہر قدم رکھیں گے تو یہ سب مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ بلند آواز سے نعرہ تبکیر اللہ اکبر کہیں گے اور مولانا وصی اللہ صاحب زندہ باد کا نعرہ لگائیں گے اس لئے کہ یہی طرز علماء بریلومی کا میں اب تک دیکھ چکا تھا لیکن شور کو کون کہے خاموشی ہی میں اضافہ ہو گیا اور ہوا یہ کہ ہر شخص حرکت میں آ گیا کوئی سنبھل کر بیٹھ رہا ہے کوئی اپنی ٹوپی درست کر رہا ہے کوئی آہستہ آہستہ آگے جگہ پا کر کھسک رہا ہے کوئی اپنے پھیلے ہوئے دامن کو سمیٹ کر دوسروں کے لئے جگہ بنا رہا ہے کوئی پیچھے سے آکر خالی جگہ پر کر رہا ہے۔ یہ عمل ایک آدمہ سکند میں بس پورا ہو چکا تھا اب سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئے میرے دل میں آیا کہ دیکھئے مولانا آخر کیا بیان کرتے ہیں بہت ممکن ہے علماء بریلی ہی پر ہاتھ صاف کریں سوچا کہ اگر ایسا ہوا تو تم کیسے سن سکو گے ادھر مجلس کا رعب اتنا تم پر غالب آ چکا ہے کہ تم درمیان سے اٹھ کر بھاگ بھی نہ سکو گے میں ان لغویات ہی میں مشغول تھا کہ مولانا تشریف لائے اور منہ پر بیٹھکر مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ نظر مجمع کے ہر فرد پر پڑ رہی تھی اور جس پر پڑتی و سرنگوں ہو جاتا تھا۔ یہ میں نے پہلی کرا مت دیکھی کہ بڑے سے بڑا شخص بھی حضرت سے نگاہ ملا نہیں سکتا تھا۔ میں حضرت کی طرف بغور دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں حضرت کی نظریفیض اثر مجھ پر پڑی فوراً ہی میری نگاہ نہی ہو گئی۔ اب میں گردن جھکا کر سوچنے لگا کہ دیکھئے پہلا جملہ زبان مبارک سے کیا نکلتا ہے۔ اتنے میں میرے کانوں نے یہ سنا کہ فرمایا کہ سنو! شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اپنی کتاب میں صحبت اہل اللہ کی تاثیر کے متعلق فرماتے ہیں۔ عبارت تو یاد نہیں رہی ایسا یاد پڑتا ہے کہ نیک صحبت اختیار کرنے کی ترغیب کا بیان اس میں تھا۔

داعقرنا قل عرض کرتا ہے کہ شاید حضرت والا نے اس موقع پر یہ عبارت

سنائی ہو کہ — بعد حمد و صلوٰۃ کے فقیر حقیر، اللہ قوی و باری کا یہ
 نجیفت ترین بندہ عبدالحق بن سیف الدین ترک دہلوی بخاری عرض پڑا
 ہے کہ تمام ان اہل فہم اور ارباب بصیرت کے نزدیک جن کا
 شمار بانہر اور قابل اعتبار ہستیوں میں کیا جاتا ہے یہ امر محقق اور مسلم
 ہے کہ موثر ترین حالات بلکہ افضل ترین عبادات اہل اللہ کی صحبت اور
 مقربان خدا کی ہمنشینی ہے۔ اسلئے کہ ان کی استقامت اور ان کے ثبات
 و استقلال کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایک قوت و ہمت پیدا ہو جاتی ہے
 جسکی وجہ سے عبادت کا تعب اور ریاضت کی مشقت کا برداشت کرنا جو کہ
 اس طریق پر چلنے کے لئے لازم ہے اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے بلکہ
 ان حضرات کے جمال کے مشاہدے سے اس کے قلب میں ایک نور
 پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شک و شبہات کی تاریکیاں کہ دراصل
 وہی بعد و حجاب ہوتی ہیں اس کے قلب سے زائل ہو جاتی ہیں۔ انتہی -
 دیکھئے یہاں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے مصاحبیت اہل کمال کو افضل ترین
 عبادت قرار دیا ہے۔

پھر حضرت نے شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا نام اور قاضی ثناء اللہ صاحب
 پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا اور ان کے نام کے بعد رحمۃ اللہ علیہ بھی فرمایا۔ ان کے
 اقوال بھی صحبت نیک کے فوائد و برکات سے متعلق تھے۔ اس وقت ذہن میں نہیں ہے
 کہ کیا قول بیان فرمایا تھا۔

۱۔ راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا شاید یہ کلام نقل
 فرمایا ہو کہ — شفاء العلیل ترجمہ القول الجلیل میں ہے کہ حضرت شاہ
 ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے فرمایا کہ پانچویں شرط شیخ کے لئے یہ ہے
 کہ وہ کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو۔ زمانہ دراز
 تک ان سے باطنی نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہ یعنی صحبت کاملین اسلئے

شرط ہوئی کہ مراد نہیں ملتی جب تک مراد پانے والوں کو نہ دیکھے جیسے انسان کو علم نہیں حاصل ہوتا مگر اہل علم کی صحبت سے۔ اور اسی قیاس پر ہیں اور پیشے جیسے آئینگری کہ بدون صحبت آئینگر کے یا نجاری کہ بدون صحبت نجار کے نہیں آتی۔

اسکے تحت حاشیہ میں مترجم لکھتے ہیں کہ:۔ شاہ صاحب نے یہاں یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت جو جاری ہوئی ہے کہ آدمی مراد کو نہیں پہنچتا بدون مراد پانے والوں کی صحبت کے اسکا راز یہ ہے کہ انسان اسی پنج پر مخلوق ہوا ہے کہ یہ کمال کو حاصل نہیں کر سکتا بغیر اپنے انبار جنس کی مشارکت اور اسکی معاونت کے، بخلاف اور حیوانات کے کہ ان کے کمالات پیدا نشی ہیں اور کسی نہایت کمتر۔ چنانچہ تیرنا حیوانات میں پیدا نشی کمال اور انسان کو بغیر سیکھے نہیں آتا۔ (شفاء العلیل ص ۲۱)

اور حضرت قاضی صاحب پانی پتی رحمہ اللہ کا شاید یہ ارشاد بیان فرمایا ہو کہ تحفہ السالکین ترجمہ ارشاد الطالبین میں ہے کہ قرب الہی کا سبب جذب ہے اور یہ جذب کبھی بلا کسی واسطہ کے ہوتا ہے اسکو اجتہاد کہتے ہیں اور اکثر کسی امر کے توسط سے ہوتا ہے اور وہ توسط حکم استقرار دو چیزیں ہو سکتی ہیں ایک عبادت (اور جو جذب اسکے واسطہ سے ہوتا ہے اسکو ثمرۃ عبادت کہتے ہیں) دوسری انسان کامل کی صحبت (اور جو جذب اسکے توسط سے ہوتا ہے اسکو تاثیر شیخ کہتے ہیں) یہ تاثیر شیخ تاثیر عبادت سے بڑھکر ہے۔ لہذا جو جذب کسی شیخ کامل کے توسط سے ہوتا ہے وہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اس جذب سے جو کہ عبادت کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرشتوں کے باب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وما منا الا لہ مقام معلوم یعنی ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک معین مقام ہے۔ اور شیخ سے جو جذب ملتا ہے وہ ترقی پر ترقی دیتا ہے

یہاں تک کہ شیخ کے مقام تک پہنچا سکتا ہے)

غرض تمام علماء و مشائخ کا نام حضرت بہت احترام سے لیتے تھے اور ہر ایک کے نام کے بعد رحمۃ اللہ علیہ یا قدس سرہ ضرور فرماتے تھے اسی اثنائے میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی آیا ان کے نام نامی کو حضرت کی زبان سے سن کر یقین پڑا کہ میں چونک پڑا اور غور کرنے لگا کہ دیکھو ان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ لیکن حضرت نے انہی جو بات نقل فرمائی وہ آج تک یاد ہے۔ فرمایا کہ حضرت اجمیریؒ فرماتے ہیں کہ ”اچھی صحبت اچھے عمل سے بہتر ہے اور بری صحبت برے عمل سے بھی بدتر ہے“ اور اسکے بعد حضرت نے مولانا رومؒ کا ایک شعر پڑھا جس کو میں بریلوی مولوی صاحبان کی زبان سے بھی سن چکا تھا وہ شعر یہ تھا کہ

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

(تھوڑے عرصہ تک اولیاء اللہ کی صحبت سو سال کی طاعت بے ریا سے بڑھ کر ہے) اس شعر کو پڑھ کر حضرت نے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اس شعر کیطرت حضرات علماء کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس کو لوگ پڑھ پڑھ کر وعظ کی محفل کو تو خوب گماتے ہیں لیکن اسکا مطلب شاید ہی کوئی سمجھتا ہو۔ میں نے جب یہ سنا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس مجمع میں ماشار اللہ علماء بھی موجود ہیں جب ہی تو حضرت انکو مخاطب فرماتے ہیں اس سے حضرت کی ایک خاص عظمت قلب میں بیٹھ گئی کہ حضرت بزرگ ہونے کیساتھ ساتھ زبردست عالم بھی ہیں اور حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ عالم اپنی قوم میں ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں ہوتا ہے تو اسکا مطلب حضرت کی بارعب مجلس ہی کو دیکھ کر سمجھ میں آیا۔ کیسی باوقار اور کیسی مہذب و شائستہ اور کس قدر نورانی مجلس اور تقریر تھی کہ سبحان اللہ کسی کو برا بھلا کہا جا رہا تھا نہ گالی گلوچ کا انداز تھا سیدھے سادے طور پر ایک نہایت اہم بات اور ضروری مسئلہ جو دین میں اساس کی حیثیت رکھتا یعنی صحبت نیک کی ضرورت اور اسکے فوائد پر مدلل کلام فرمایا جا رہا تھا اور ساری مجلس دم بخود تھی کیا عوام اور کیا خواص یعنی علماء۔ سمجھ میں آیا کہ ایک عالم ربانی اور شیخ حقانی

کی یہی شان ہوا کرتی ہے۔ اور جب سامعین کے قلوب میں کسی کی اتنی عظمت ہوتی ہے جب ہی اس سے قائدہ اور فیض بھی پہنچتا ہے۔ اس موقع پر مجھے مولانا روم کا ایک شعر یاد آگیا۔ فرمایا ہے کہ

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد
کیونکہ علماء کو اس مجلس میں حضرت کا مطیع و منقاد دیکھ کر مولانا روم کا خود کو حضرت شمس تبریزی کا غلام کہنے کا مطلب سمجھ میں آگیا اور اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور مجھے احساس ہوا کہ واقعی جو بزرگ کہ نائب رسول کہلانے کے مستحق ہوا کرتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے حضرت مولانا۔ اور صحیح معنوں میں جو لوگ صوفی کہے جانے کے مستحق ہیں وہ یہی لوگ ہیں واقعی انھیں لوگوں کو صوفی کہنا زیب دیتا ہے اور اب تک جو تم نے پیری مریدی کا ماحول دیکھا وہ تو اس مبارک جماعت کی نقالی اور طریق کی ایک تفریح تھی، جہاں پیر اور مرید دونوں آزاد ایک طرف پیری و مریدی تھی اور دوسری طرف نماز تک غائب اور معاً بعض بدعتی پیر ذہن میں آگئے جو یہ راگ الاپتے ہیں کہ ہماری نماز تو پیر کی محبت سے توبہ توبہ۔ حضرات صحابہ کرامؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر واقعی دل و جان سے فدا تھے انھوں نے کبھی ایسی بات زبان سے نہیں نکالی کہ ہماری نماز تو رسولؐ کی محبت سے اور بس۔ اور آج بدعت کی نئی شریعت میں لوگ اسکے کہنے سے بھی باک نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں خود اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جس سے اندازہ لگا سیکے کہ یہ بدعت لوگوں کو کس طرح دین سے دور کر دیتی ہے۔ ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی ایک شخص الحان قوال کوئی شعر گا رہا تھا اتنے میں مغرب کی اذان ہو گئی ایک صاحب نے کہا کہ مغرب کی اذان ہو رہی ہے لہذا اب یہیں اسی جگہ نماز پڑھ لی جائے یہ سن کر ایک شاہ صاحب نے قوال سے کہا تم اپنی قوالی جاری رکھو ہماری نماز یہی ہے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ انکا یہ جملہ شکر عوام کو بھی برا لگا کیونکہ لوگوں میں بے عملی آگئی ہے لیکن اکہم اللہ بدعتی آدمی نہیں آئی ہے اور یہ موجودہ بدعت قوالوں کو بدعتی بنا دیتی ہے۔

بہر حال حضرت کے یہاں ماضی سے مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی خانقاہ جبکا نام ہے وہ اسی اور اسی طرح کی جگہوں کا نام ہے جہاں اصلاح و تربیت اور اور روحانی امراض کا علاج اور تزکیہ نفس کرایا جاتا ہے۔

اور میں اپنی ان ہدایات کو بھی حضرت والا ہی کا فیض، برکت بلکہ کرامت سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے پہلے کبھی یہ سوج بھی نہیں سکتا تھا کہ حضرت اقدس سے مجھے اتنی عقیدت، اتنی محبت اور حضرت کی ایسی عظمت میرے قلب میں ہو جائیگی اور بلاشبہ یہ حضرت والا کی لائیت ہی کا ثمرہ تھا کہ ایک میں کیا نہ جانے کتنے گمراہ لوگوں نے حضرت کے توسل سے صراط مستقیم پایا۔

غرض تھوڑی دیر کے بعد (یعنی تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہ کر) مجلس ختم ہو گئی لیکن اسکے بعد بھی سب لوگ گردن جھکائے (جیسے کسی گہری سوج میں ہوں) بیٹھے ہی رہے۔ شاید یہ بات ہو کہ یہ حضرات ابھی بیان کی ہوئی حضرت کی باتوں کو اپنے حال پر منطبق کر رہے تھے، اور سب لوگ گویا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ غور کر رہے تھے کہ افسوس ہم کو کیا ہونا چاہیے اور ہم کیسے ہیں یا جو بھی وجہ ہو مجھے انکی یہ ادا بہت پسند آئی پھر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد ایک صاحب آئے اور حضرت سے مصافحہ کر کے رخصت ہوئے پھر دوسرے اٹھے پھر تیسرے اسی طرح سے ایک ایک کر کے لوگ اٹھتے رہے اور مصافحہ کر کے جاتے رہے۔ واپسی میں اور ختم مجلس میں شور و طر نہیں تھا بلکہ نہایت ادب و وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے لوگ اٹھے، یہ منظر بھی دل پر اپنا نقش جما گیا۔ اتنے میں میں نے ایک صوفی صاحب کو جو کہ مجلس سماع میں قہقہے کرتے تھے انکو بھی یہاں دیکھا ان سے آہستہ سے پوچھا کہ آپ یہاں کہاں؟ انھوں نے جواب دیا کہ پھر کیا ہوا؟ یہ کہہ کر چلے گئے۔ جب مجمع کم ہوا تو میں بھی مصافحہ کیلئے بڑھا حضرت نے مجھے آتے دیکھا تو فوراً ہاتھ بڑھا دیا میں نے مصافحہ کیا تو مجھ پر رعشہ طاری تھا پیر کی پنڈلیاں تھر تھرا رہی تھیں وہاں سے آکر ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا اور مڑ کر دیکھا تو حضرت مند پر سے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

ہم یہ بیان کر رہے تھے کہ الہ آباد کے قیام میں اگر ایک جانب مخالفین کی مخالفت چل رہی تھی تو دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی جانب سے عجیب عجیب طرح سے نصرت بھی ہو رہی تھی اس سلسلہ کے جزئی واقعات تو بہت ہیں ہم نے صرف ایک عامی کا حال آپ کے سامنے انھیں کی زبان میں پیش کیا دیکھئے کتنا زیادہ انہماک رسوم و بدعات میں انھیں تھا لیکن حضرت اقدس کی تشریف آوری پر اللہ تعالیٰ نے کس کس طرح سے انکی ہدایت کا انتظام فرمایا بھائی انیس صاحب کی اس آپ بیتی میں ہمارے لئے یہ سبق موجود ہے کہ نفس اور شیطان۔ انسان کے احباب۔ اسکا خاندان اور دنیوی ماحول کس طرح سے اسکو اپنی بندش میں لئے رہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت نہ ہو تو انسان کا ان بندشوں سے نکلنا بڑا ہی مشکل ہے نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان سے نجات کا طریقہ صرف تضرع و زاری بجانب باری ہی ہے۔ اگر کسی کو اسکی توفیق ہو جائے تو پھر حسب وعدہ الہی وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اللہ تعالیٰ اسکی ضرورت ہی دستگیری فرماتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جب بھائی انیس صاحب کو اسکی توفیق ہو گئی تو پھر لیلائے مقصود نے بھی رونمائی کی یعنی حضرتؑ کی نہ صرف زیارت ہی سے وہ بہرہ ور ہوئے بلکہ حضرتؑ کی توجہ اور دعاؤں کے بھی مورد بنے اور بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔ پھر اسکے بعد انھوں نے اپنے احباب میں حضرتؑ کی تعلیمات کا چرچا کیا اور گاؤں کے لوگوں کو بھی مسلک حق کی جانب دعوت دی۔ چنانچہ بہت لوگوں کو ان سے نفع پہونچا۔

دوسرا واقعہ نصرت کا براہ راست حضرت کی ذات سے متعلق تو نہ تھا لیکن حضرت کے شیخ حضرت حکیم الامتؒ سے متعلق تھا اسلئے اسکا اثر ظاہر ہے کہ خود حضرت پر پڑا اور حضرتؑ کے مسلک پر بھی پڑا اور میری مراد اس سے شاہ عبدالمعبود صاحب کی نصرت ہے مجھے خود جناب شاہ صاحب کے کسی عزیز قریب نے ایک دن یہ بتلایا کہ رات کو ایک نہایت اہم واقعہ ہو گیا وہ یہ کہ ہمارے محلہ میں میلاد

کے نام سے سالانہ جلسے ہوا کرتے ہیں اس سال بھی ہو رہے تھے میاں (یعنی شاہ
عبدالمعبود صاحب) چونکہ حضرت مولانا کی خدمت میں اکثر آتے رہتے ہیں یہ بات
دوسری جماعت کو نہایت شاق گذرتی تھی اسلئے اس سال محلہ کے جلسے میں بھی تقریباً
روزانہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا نام لیا جاتا تھا اور برا بھلا
کہا جاتا تھا۔ آخری دن ایک مولوی صاحب نے اسٹیج پر آتے ہی زہر اگلنا
شروع کر دیا۔ میاں کی طبیعت خراب تھی دائرے والے مکان میں لیٹے ہوئے
تھے لاؤڈ اسپیکر کا رخ بھی اسی جانب تھا اسلئے صاف آواز آرہی تھی۔ نیند تو
نہ آسکی تھوڑی دیر تک تو میاں لیٹے لیٹے سنتے رہے بالآخر چھڑی ٹیکتے ٹیکتے
جلسہ گاہ میں پہنچے لوگوں نے دور سے دیکھا کہ میاں آرہے ہیں تو کرسی انتظام
سمجھے کہ شاید تقریر سننے آرہے ہیں اور کرسی کو جمع کے آخر میں لا کر رکھ دیا میاں
آئے تو یہ فرمایا کہ کرسی وہاں اسٹیج کے قریب بچھاؤ لوگوں نے تعمیل حکم کیا اور کرسی
اسٹیج کے قریب ہی بچھا دی گئی اس پر تشریف رکھ کر فرمایا کہ لائے ذرا
مائیک مجھے دیجئے روزانہ کی تقریر گھر ہی سے سنتا رہتا تھا اس سے مجھے اندازہ
ہوا کہ شاید کچھ لوگوں کو اسپر ناگواری ہے کہ میں نے بارش کے موسم میں جلسہ
کی اجازت اپنی خانقاہ میں کیوں نہیں دی اسی دہم کے پیش نظر مولانا تھانویؒ
کے ساتھ ساتھ اشارۃً و کنایۃً مجھے بھی کہا سا جا رہا تھا تو میں قریب اس لئے
آگیا ہوں کہ میرے ادیر آپ کے مقرر صاحب کو فتویٰ لگانے میں آسانی ہو یہ کہہ کر
مائیک پھر مقرر صاحب کی طرف بڑھا دیا کہ ہاں لیجئے اور اب فرمائیے آپ کیا فرماتے
ہیں ان مولوی صاحب نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ سے میں صرف اتنا پوچھنا
چاہتا ہوں کہ کیا آپ اشرف علی کو مسلمان سمجھتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا
کہ مسلمان! یہ تو آپ نے بہت معمولی سی بات کہی میں تو انھیں نہ صرف مسلمان
بلکہ عالم دین - فقیہ زمانہ - اور اپنے وقت کا غوث و قطب بلکہ مجدد سمجھتا ہوں
اس پر وہ مولوی صاحب خفا ہو کر اور یہ کہہ کر اسٹیج سے اتر کر چلے گئے کہ پھر میں

آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اور جلسہ میں ایک شور و ہنگامہ مچ گیا اور سب لوگ منتشر ہو گئے جلسہ ختم ہو گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ معاملہ صرف معمولی شور و شغب کے بعد ختم ہو گیا کوئی فساد نہیں ہوا۔ انتہی۔

شب کے اس واقعہ کی اطلاع حضرت والا کو بھی ہوئی حضرت پر سجدہ اثر ہوا۔ راقم کے ذریعہ حافظ یسین صاحب اور راقم کے والد مولوی سراج الحق صاحب کو بلوایا اور ایک پیغام شاہ عبدالمعبود صاحب کے پاس بھیجا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پیغام کے بیان سے پہلے کچھ مختصر تعارف شاہ عبدالمعبود صاحب کا بھی کر دوں تاکہ ناظرین کو واقعہ علی و بہ البصیرت ذہن نشین ہو سکے۔

شاہ عبدالمعبود صاحب سجادہ نشین ہونے سے پہلے مجیدیہ اسلامیہ کالج الہ آباد میں پڑھتے تھے ان کے ماموں حافظ محمد یسین صاحب مدظلہ حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے اور حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کے مخصوص خدام میں تھے حافظ صاحب کے ہمراہ شاہ عبدالمعبود صاحب بھی تھانہ بھون تشریف لیجاتے تھے اور حضرت حکیم الامتہؒ سے بیعت بھی ہو گئے تھے تھانہ بھون میں آمد و رفت کے سلسلہ میں ہمارے حضرت مصلح الامتہؒ سے بھی شاہ صاحب کی اچھی خاصی ملاقات کئی یہاں الہ آباد میں دائرہ حضرت شاہ محمدی میں (جو دائرہ شاہ غلام علیؒ کے نام سے بھی مشہور ہے) حضرت محمدی شاہ صاحب کے بعد شاہ عبدالمعبود صاحب کے بڑے والد جناب شاہ عبدالشکور صاحب صاحب سجادہ ہوئے پھر ان کے بعد شاہ عبدالمعبود صاحب کے والد صاحب گدی نشین ہوئے۔ اب تک شاہ عبدالمعبود صاحب اس مسلک سے دور بلکہ نفور تھے۔ تھانہ بھون کی آمد و رفت جاری رہی اسکول میں ماسٹر تھے راقم کے والد مولوی سراج الحق صاحب سے بڑی گہری دوستی تھی شاہ صاحب نے مزاج چونکہ مرج و مرجان کا پایا تھا اور بڑے ظریف

اور خوش مذاق شخص تھے والد صاحب کے ہمراہ اصغر گونڈوئی کے یہاں بھی اکثر حاضری رہا کرتی تھی۔ حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد مولانا محمد عیسیٰ صاحب الدہلویؒ کی تربیت میں کچھ دنوں حضرات ساتھ ساتھ رہے چنانچہ جب مولانا عیسیٰ صاحب الدہلویؒ علیل ہوئے تو زمانہ علالت شاہ عبدالمعبود صاحب کے مکان ہی میں جو نور امروڈ کے قریب ہے گزارا اور اس میں شک نہیں کہ شاہ عبدالمعبود صاحب نے حق تیمارداری اور حق خدمت ادا ہی کر دیا پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولانا عیسیٰ صاحب علاج کیلئے جون پور ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہ کے یہاں تشریف لے گئے وقت موعود آہوچکا تھا وہیں اس دنیا سے سفر فرما گئے اور محلہ کی مسجد کی پشت پر امام کی محراب سے متصل دفن ہوئے۔ واقعی شیخ کی موجودگی بھی خدا کی رحمت ہوتی ہے اور اسکا سایہ اٹھ جانا گویا تاریکی میں انسان کو ڈالتا ہے یہی یہاں ہوا کہ حضرت تھانویؒ کے وصال کے بعد جب مولانا عیسیٰ صاحب نہ رہ گئے تو ان حضرات پر سے اصلاحی گرفت ختم ہو گئی ادھر یہ سانحہ درپیش آگیا کہ شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرؤف صاحب بھی بیمار ہوئے اور انکی حالت دن بہ دن گرتی ہی گئی لہذا یہ مسئلہ سامنے آیا کہ آپ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا؟ شاہ عبدالمعبود صاحب دل سے ان رسوم کے قابل تو نہ تھے جو آجکل کے پیروں کے یہاں رائج ہیں تاہم بعض حالات ایسے سامنے آئے کہ جانشین بنا دیئے گئے اور شاہ صاحب انکار نہ کر سکے۔ ادھر شاہ عبدالرؤف صاحب کا انتقال ہو گیا تو شاہ عبدالمعبود صاحب لوگوں کی جن رسوم پر اب تک ہنستے تھے اب ان تمام امور کو خود انجام دینا پڑ گیا۔ خاندانی جانشین اور یہ کہ پیر کا لڑکا ہی پیر ہوگا یہ کس قدر غلط اصول تھا کہ اہل ہویانہ ہو بہر حال لڑکے کے لئے باپ کی گدی پر بیٹھنا لازم تھا یہ طریقہ بھی اختیار کرنا پڑا تو الی اور دیگر رسوم میں شرکت بھی ناگزیر سی ہوئی۔ حالات سے مجبور ہو کر

سب کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا تھانویؒ کے مسلک سے تعلق رکھنے والوں کو بڑی ندامت اٹھانی پڑی اور ہر وقت کی شہادت اعداء برداشت کرنی پڑی یعنی لوگ طعنے دینے لگے کہ دیکھئے شاہ صاحب تو آپ ہی کے سلسلہ کے آدمی تھے اور مولانا تھانویؒ کے مرید تھے بالآخر انکو بھی ادھر ہی آنا پڑا اسکا اثر یہ ہوا کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنی جماعت سے کٹ سے گئے اور ہم لوگوں کا باہم ملنا جلنا بھی ختم سا ہو گیا۔ والد صاحب یا شاہ صاحب کے اور دوسرے اجباب مثلاً محمد احمد صاحب ٹیلر ماسٹر۔ پروفیسر محمد احمد صاحب صدیقی۔ شاکر حسین خان صاحب۔ ماسٹر محمد ابراہیم صاحب۔ سید حسن صاحب کمشنر وغیرہ جو کہ نہایت ہی بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور حافظ حسین صاحب جو شاہ صاحب کے حقیقی ماموں تھے ان سب سے تعلق ختم سا ہو گیا بس کہیں راستہ میں شاہ صاحب مل جاتے تو سلام و دعا ہو جاتی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی حالات تھے کہ اسی دور میں حضرت مصلح الائمۃ کا ورود الہ آباد میں ہوا بکھر حضرتؒ نے بخشی بازار میں مکان خرید لیا تو حضرت والا کا مکان شاہ صاحب کے اپنے آبائی مکان اور دائرہ شاہ محمدی کے درمیان میں پڑتا تھا اسلئے کبھی کبھی شاہ صاحب حضرت مولانا سے ملنے بھی آ جاتے تھے لیکن ہمارے حضرت والا نے کبھی ان کے اس تبدیلی مشن کے متعلق ایک لفظ ان سے نہیں فرمایا بس خیر خیریت جابین سے دریافت ہوتی اور مختصر سا قیام کر کے شاہ صاحب واپس تشریف لیجاتے مگر اس طرح سے بھی آتے جاتے رہتے سے انکا حجاب کم ہوا اور حضرت تھانویؒ کا اور زمانہ قیام تھا نہ بھون کے سابق واقعات کا چرچا حضرت سے ملاقات کی مجلس میں رہتا اور یہ مجلس کچھ دیر دیر تک رہنے لگی یہاں تک کہ ایک دن شاہ صاحب نے حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت کی عام مجلس میں بھی آنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن طبیعت خراب رہتی ہے دیر تک بیٹھ نہیں سکتا اس لئے

حضرت کوئی وقت مقرر فرمادیں تو اس وقت حاضر ہو جایا کروں گا۔ چنانچہ بعد عصر اکثر شاہ صاحب تشریف لانے لگے حضرت نے اتنا فرمایا کہ آپ کے مجھ سے اس طرح سے ملنے سے آپ کے لوگ تو کچھ خفا نہ ہو جائیں گے شاہ صاحب نے فرمایا کہ نہیں حضرت بالکل نہیں یہ سلسلہ پیری مریدی کا ایسا ہے کہ جو پیر کا مسلک ہوتا ہے وہی مرید کا مسلک ہوتا ہے۔ حضرت والا یہ سنکر مسکرائے۔ بہر حال شاہ صاحب اس طرح سے برابر آتے رہے اور اب ان کے اس اقدام کا حضرت کے لوگوں پر اثر پڑا کہ انکو بھی شاہ صاحب کی جانب سے انشراح ہونے لگا اور باہم ملاقات اب کچھ قلبی مسرت کے ساتھ ہونے لگی۔

شاہ صاحب مستقل بیمار ہی رہتے تھے اور روز بروز کمزور ہونے لگے بس یہی وہ زمانہ تھا کہ ان کے محلہ میں وہ جلسہ ہوا جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں اور وہ واقعہ پیش آیا جسکی اطلاع ہونے پر حضرت متاثر ہوئے اور حافظ یسین صاحب مدظلہ کو اور والد صاحب مولوی سراج الحق صاحب کو بلوایا اور ان لوگوں سے فرمایا کہ آپ لوگ ہمارا ایک کام کر دیں گے؛ دونوں حضرات نے عرض کیا کہ حضرت کے حکم کی تعمیل کو ہم اپنی سعادت تصور کریں گے۔ فرمایا کہ عبدالمعبود کے یہاں جانا ہے۔ اور حافظ یسین صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ تو شاید ان سے ملتے بکلی نہیں پھر کیسے جائیں گے؟ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کا حکم ہو گا تو وہاں بھی چلا جاؤں گا۔ فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے آپ دونوں حضرات شاہ صاحب کے پاس جائیے انے میرا سلام کہیے اور یہ کہیے کہ گزشتہ شب آپ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا مجھے اسکی کچھ اطلاع ملی۔ اس بنا پر آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کے اس واقعہ نے ہم سب کی گردن نیچی کر دی کہ ہم لوگ تو ناحق تھانوی ہونے کا دم بھرتے ہیں تھانوی تو دراصل آپ ہیں کہ رات حضرت مولانا (تھانوی) پر آپ نے اپنے کو قربان ہی کر دیا تھا کیونکہ فناءیت کا زمانہ ہے اگر بات اور بڑھ جاتی

اور لاکھی ڈنڈے چھری چاقو کی نوبت آجاتی تو کیا حشر ہوتا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے فضل فرما دیا کہ سلسلہ آگے نہیں بڑھا لیکن آپ نے تو حضرت مولانا رحمہ کی نصرت ایسے عنوان سے فرمائی کہ ہم نے کسی دیوبندی کو تو دیکھا نہیں کہ اس طرح سے پیش آیا ہو اس لئے ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ اور آپ کے اطمینان کیلئے آپ کو اس بات کی بشارت دیتے ہیں کہ آپ تمھانہ بھون سے محروم نہیں آئے آپ کو وہاں سے کچھ ملا ہے یعنی کوئی دولت ملی ہے اور اسی کا یہ اثر تھا کہ آپ سے حضرت تھانوی کی شان میں بے ادبی اور گستاخی برداشت نہ ہو سکی اس لئے کہتا ہوں کہ آپ انشاء اللہ حشر کے دن حضرت مولانا تھانویؒ کی جگہ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ (جس وقت ان کلمات کو اپنی زبان مبارک حضرت ادا فرما رہے تھے تو آنکھیں ڈبڈبائی تھیں اور انتہائی تاثر کے ساتھ یہ پیغام ارشاد فرمایا)۔ ان دونوں حضرات نے عرض کیا کہ حضرت ابھی عبدالمعبود کے پاس جاتا ہوں اور حضرت کا یہ پیغام سناتا ہوں اور اگر حضرت کو جواب دیتا ہوں۔

راقم عرض کرتا ہے کہ باب اصلاح کی یہی وہ نزاکتیں تھیں جنکی رعایت کرنے پر اہل نفس قادر ہی نہیں ہو سکتے۔ اور ہمارے حضرت اس میدان کے شہسوار تھے۔ شاہ عبدالمعبود صاحبؒ کی اس تبدیلی کی اصلاح کسی کے بس کی بات نہ تھی اور لوگ صرف اتنا ہی کر سکے کہ ان سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ کو دیکھئے کہ بدعت اور رسوم کی شناخت اور قباحت کو ان سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا تاہم اپنے انخوان طریقت کی اس لغزش پر کتنا صبر و ضبط سے کام لیا اور بالآخر اس زلت سے گرے ہوئے پر کس طرح سے رحم اور شفقت کا معاملہ فرمایا اور کس طرح سے اس سے اس کو نکالنے کی سعی فرمائی یعنی ایک بھائی سے چوک اور لغزش ہو گئی تو اسکو چھوڑ نہیں دیا اور رشتہ رنجوت کو توڑ نہیں دیا بلکہ حضرت تھانویؒ سے اسکا رشتہ بالآخر

اس طرح سے جوڑ ہی دیتا کہ آج بکلی وہ یہ سمجھیں کہ بعض کوتاہیوں میں مبتلا ہونے سے ہم حضرت تھانویؒ کے سلسلہ سے نکلے نہیں بلکہ اب بھی اس سے دھلے ہیں۔ اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ

نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

غرض دونوں حضرات شاہ عبدالمعبود صاحب کے پاس گئے حضرت کا پیام پہنچایا شاہ صاحب نے بھی قلب بریاں سے نکلی ہوئی بات کو دل گریاں سے سنا اور تاثر کے ساتھ سنا۔ لوگ کہتے تھے کہ عبدالمعبود صاحب آنکھوں سے تو نہیں روئے لیکن اندازہ ہوتا تھا کہ دل انکا بھی رو رہا ہے

الفت کا جب مزا ہے کہ دونوں ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برا برا بر لگی ہوئی

حضرت والا بھی تھانہ بھون کی ملاقات کی بنا پر شاہ عبدالمعبود صاحب کو اولاد کی مانند چاہتے تھے اور شاہ صاحب بھی حضرت والا کی شفقت اور رافت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد یہ سمجھے ہوں گے کہ ابھی ہمارے سر کے اوپر ہاتھ رکھنے والے موجود ہیں۔ سبحان اللہ۔

الغرض میں یہ عرض کر رہا تھا کہ الہ آباد میں مخالفین کی طرف سے مخالفت بھی ہوتی رہی لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے لوگوں سے اس طرح سے حضرت کی اور حضرت والا کے مشن کی نصرت فرمائی کہ لوگ متحیر ہی تو رہ گئے چنانچہ بھائی انیس صاحب اور شاہ عبدالمعبود صاحب کے واقعات سے آپ نے اندازہ فرمایا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ انیس صاحب کو خلوص و استقامت نصیب فرمائے اور شاہ صاحب مرحوم کی مغفرت فرمائے اور آخرت میں مزید درجے بلند فرمائے

خدا رحمت کن دایں عاشقانِ پاک طینہ را

حضرت والا اب الہ آباد میں ہیں اور اپنا مستقل ذاتی مکان بھی اٹھ لٹھ ہو گیا ہے ایک طرف اہل الہ آباد میں سمجھتے ہیں کہ حضرت کی آمد کی خوشی اور مسرت ہے تو دوسری جانب بعض لوگوں کو پریشانی اور ناگوار سی ہے چنانچہ مخالفین کی مخالفت اور موافقین کی نصرت کے بعض واقعات ہم گزشتہ سطور میں پیش کر چکے ہیں اب ناظرین اپنے ذہن میں یہ بھی رکھیں کہ حضرت سے لوگوں کے تعلقات کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اعظم گڑھ میں — فٹیچور، کوپا گنج، گھوسی، مٹو، کاریا تھ اور ندوہ سرانے وغیرہ کے حضرات سے تو حضرت والا کا دیرینہ ہی تعلق تھا۔ پھر گورکھپور جانے کی وجہ سے اہل گورکھپور سے خصوصی تعلقات ہوئے اسلئے الہ آباد آنے کے بعد ان حضرات کے بھی خطوط برابر آتے رہے جسکی وجہ سے ہر جگہ کے معاملات کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ وطن کے لوگوں کا فتنہ کرنا اور ایسا فتنہ جسکی وجہ سے حضرت نے وطن ہی کو خیر باد کہہ دیا اسکا سارا نقشہ اہل وطن کے خطوط سے یاد آ جاتا تھا اور اہل گورکھپور کی مکاتبت کی وجہ سے وہاں کے اہل شہر کی انتہائی نازیبا حرکت جس نے اسوقت حضرت کو ترک شہر پر نہ سہی ترک جائے قیام پر تو مجبور ہی کر دیا تھا اور حضرت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے تھے اور الہ آباد جب حضرت تشریف لائے تو یہاں بھی جب لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اسکا مصداق پایا کہ طر۔

بہر میں کہ رسیدیم آسماں پیدا ست
چنانچہ اب حضرت والا کے سامنے خصوصی طور سے تین شہروں کے معاملات تھے
وطن کے گورکھپور کے اور خود اہل الہ آباد کے

وطن کے معاملات کا حاصل یہ تھا کہ کسی کے خط میں حضرت کی جدائی اور ترک وطن کے انتہائی صدمہ کا اظہار ہوتا اور وہ رور و کر اپنی کوتاہی کی معافی کا طلبگار ہوتا۔ کسی کے خط میں سفارش ہوتی کہ فساد کا اصل مجرم میرے واسطے سے آپ سے معافی مانگنے الہ آباد آنا چاہتا ہے۔ کوئی یہ لکھتا ہے کہ اب ہم لوگوں کو آپ کے

یہاں سے چلے جانے کے بعد اپنے نقصان کا علم اور اندازہ ہوا اور آپ سے فیض حاصل کرنے پر قلق ہوا۔ اب ہم اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت کے سدھارنے کا آپ سے وعدہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں کا ہر مضمون حضرت والا کے غیظ و غضب میں تحریک ہی پیدا کرنے والا تھا اسلئے حضرت نے اسی انداز کے سب کو جوابات بھی دیئے۔

اہل گورکھپور کا جرم تو وہیں کے دوسری جگہ قیام کے زمانہ میں ہی معاف اور صاف ہو چکا تھا تاہم علالت کے بعد جب حضرت الہ آباد تشریف لے آئے تو جیسا کہ کہا گیا ہے کہ ”قدر مردم بعد مردن و قدر نعمت بعد زوال“ یعنی نعمت کی قدر اسکے زائل ہو جانے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ اسی اصل کے ماتحت گورکھپور کے بھی خطوط آنے لگے کہ صحت کے بعد ایک وفد پھر گورکھپور تشریف آرائی سرمائی جائے۔ کسی نے اپنے تاثر اور تاسف کو ایسا ظاہر کیا جو کہ اس شعر کا گویا مصداق تھا کہ

بے رونقی، جمود و تعطل، سکوت مرگ

ایسا ہے کائنات کا نقشہ تر سے بغیر

ظاہر ہے کہ اسکی وجہ سے بھی حضرت کے سامنے گورکھپور کے زمانہ قیام کے تمام ہی واقعات یاد آکر حضرت کے نشاط و کیف میں اثر انداز ہو کر اسکو مکرر کہتے تھے چنانچہ ان حضرات کو بھی اسی کے مطابق جواب مرحمت فرمائے۔

اور الہ آباد میں مخالفین کی مخالفت کی تو حضرت کو ذرہ برابر پرواہ نہ تھی اسکے متعلق تو یہی فرماتے تھے کہ مخالفین کا ہونا اور مخالفت کا کیا جانا یہ ایک خدائی نظم ہے اسی کی وجہ سے اہل اخلاص ممتاز ہوا کرتے ہیں اور انکو خدا کے یہاں نمبر ملتا ہے اور یہی وہ خدائی دستور ہے جس پر تمام انبیاء کو چلایا گیا ہے وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ شَيْءٍ عَدُوًّا شَيَاطِينُ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن بنائے شیاطین جن میں سے

بھی اور شیاطین انس میں سے بھی۔ فرماتے تھے کہ رنج ان لوگوں کے معاملات سے ہوتا ہے جو احباب میں داخل ہیں اور ہماری بات اور تعلیمات پر عمل نہیں کرتے نص کو اپنا پیشوا نہیں بناتے بلکہ انکا مقتدا انکا نفس ہوتا ہے۔
 ہم یہاں بعض خطوط اہل وطن کے بعض اہل گورکھپور کے اور بعض اہل الہ آباد کے نقل کرتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ حضرت اقدس کیا کام کیا کرتے تھے صرف لوگوں کو مرید ہی کرتے تھے یا انکی کچھ خدمت بھی اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے اور یہ کہ انکی خدمت کے سلسلہ میں کس قدر ضیق کس قدر پریشانی اور کتنا بار قلب مبارک پر اٹھانا پڑتا تھا انھیں سب امور کا تصور کر کے کبھی کبھی یہ شعر پڑھ دیا کرتے تھے کہ

خون دل پینے کو اور سخت جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو
 ترتیب بیان یہ ہوگی کہ پہلے اہل الہ آباد کے معاملات کا ذکر ہوگا پھر اہل گورکھپور کا پھر اہل وطن کا اسلئے کہ اہل وطن کے خطوط میں فساد کے اصل مجرم کے معافی کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ وہ الہ آباد آیا اور حضرت سے معافی طلب کی اور پھر اسکی درخواست پر حضرت والانے وطن کا سفر بھی فرمایا ان سب کا بیان ذرا طویل بھی ہوگا اور اہل وطن ہی کے خطوط پر مرتب بھی ہے اسلئے یہاں ترتیب خط بھی ترتیب نفس الامری کے برعکس پیش کرنی پڑی۔

(بعض حالات اہل الہ آباد)

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں الہ آباد میں کبھی باہم حضرت کے لوگوں ہی میں بڑے بڑے اختلافات تھے ان میں سے بعض معاملات حضرت کے سامنے آئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے کسی موقع پر حضرت اقدس کا کوئی فیصلہ اپنے خلاف پاتے ہوئے دل میں یہ خیال کیا کہ حضرت کو ہر شخص کے پورے حالات کی اطلاع تو ہوتی نہیں اس لئے اپنے اجتہاد سے فیصلہ

فرمایا ہے اور اجتہادی غلطی موصوم نہ ہونے کی بنا پر حضرت سے بھی ہو سکتی ہے۔
غالباً اسکی اطلاع کسی طرح حضرت کو بھی ہو گئی اس پر کسی صاحب کے واسطے سے
ان صاحب معاملہ کے پاس کہلوایا کہ جا کر ان سے کہو کہ :-

”آپ کا اب تک میرے متعلق جو یہ خیال تھا کہ — ”میں باوجودیکہ تھانہ بھون
میں رہا لیکن نہ تو حضرت مولانا کو سمجھا اور نہ ان کے طریق کو سمجھا نہ خود اپنے کو پہچانا
نہ اپنے پاس آنے جانے والوں کو پہچانتا ہوں، نہ یہ جانتا ہوں کہ کون مخلص ہے
اور کون غیر مخلص اور کسی کو جو کہتا سنتا ہوں وہ بھی بلا بصیرت ہی کے یوں ہی
کہہ سن دیتا ہوں کچھ سمجھتا نہیں — تو یہ جو آپ کا میرے متعلق اب تک خیال ہے
اب اسکا کیا حال ہے۔ اب بھی آپ اسی پر ہیں یا اسمیں کچھ تبدیلی ہوئی ہے
اس کے متعلق کچھ فرمائیے۔“

ان صاحب نے فرمایا کہ ”استغفر اللہ! حضرت والا کے متعلق اس قسم
کا خیال تو دوسوہ کے درجہ میں کبھی کبھی دل میں نہیں گذرا بلکہ اسکے برخلاف حضرت
والا کے متعلق اپنا تو یہ خیال ہے کہ اسوقت ہندوستان میں حضرت مولانا تھانوی
کے جو لوگ موجود ہیں سب سے بڑھکر حضرت ہی کو اور حضرت کے طریق تربیت کو
جانتا ہوں۔

لیکن اسکے ساتھ ساتھ اپنا جو مرض ہے جو اپنے اندر پہلے کبھی تھا اور اب
بھی موجود ہے وہ یہ کہ حضرت والا کی اس بزرگی کو مانتے ہوئے کبھی میرے متعلق
جو بعض واقعات پیش آئے اس سلسلہ میں یہ دوسوہ ضرور ہوا کہ حضرت والا سے
اجتہادی غلطی واقع ہوئی اسکو میں بزرگی کے منافی نہیں سمجھتا چنانچہ ایسے وقت
میں اپنے متعلق یہ بھی خیال ہوا کہ جیسی کہ بعض لوگوں کو حضرت والا سے والہانہ
عقیدت ہے اپنے کو اس سے خالی پاتا ہوں۔“

اور اس سلسلہ میں وہ صاحب چند جزئی واقعات بتانے لگے کہ ”حضرت
والا نے مجھ سے چند ایسی باتوں پر مواخذہ فرمایا کہ میں اس جرم کا مرتکب نہیں تھا۔

اسوقت یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص حضرت سے باتیں صحیح غلط نقل کرتا ہے اس سے بہت تکلیف ہوتی تھی کہ اب اس سے کس طرح بچا جائے۔

(اسی قسم کی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ وہ صاحب واسطہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ جزئیات نہ بیان کیجئے بس بات تو صاف ہو گئی۔ آپ جس چیز کو خطائے اجتہادی سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت والا نے بھی جو یہ فرمایا ہے کہ — آپ کا جو یہ خیال تھا کہ میں نے طریق و ریت کچھ سیکھا نہیں ہے اور یونہی کہتا سنتا رہتا ہوں تو اسکا بھی یہی مطلب ہے — اور

جناب محترم! میں نے دو ایک آدمیوں سے اور اسی قسم کے کلمات سنے اور جب سنا تو طبیعت پر ایک دھکا سا لگا وہ یہ کہ جب بھی شیخ کی کسی رائے کو نہ ماننا ہوا تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ کوئی نبی تو ہیں نہیں یا یہ کہ کیا حضرت یہ وحی سے فرما رہے ہیں؟ یا یہ کہ خطائے اجتہادی بزرگوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ تو جناب والا اس کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ یہ تو شریعت کا مسئلہ مسئلہ ہے کہ معصوم صرف انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں اور اب کسی پر وحی نہ آوے گی اور یہ کہ علماء و مشائخ سے بھی اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن باوجود اس امر کے مسلم ہونے کے پھر جب کوئی شخص اسکو اپنی زبان سے کہتا ہے تو یہ کلمہ حق پراد بہا الباطل ہی کا مصداق معلوم ہوتا ہے اور اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر اور اسکے باطن میں انکار اور سوائے اعتقاد مضمر ہے کہ ایک شخص سے اعتقاد نہیں ہے اسکو نہیں ماننا چاہتا اسلئے اسکے متعلق ایسا کہہ رہا ہے ورنہ یہ حقیقت سے روشناس کرانا نہیں ہے بلکہ اسکی توہین مقصود ہوتی ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ مودودی جماعت کے لوگ حضرات صحابہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ نبی تو کچھ نہیں کہ انکی کسی خبر اور روایت میں غلطی کا احتمال نہ ہو تو اس سے انکار حدیث کا شبہ ہوتا ہے اور اس عنوان کو لازم ہے کہ صحابہ کرام ہی پر سے اعتماد اٹھ جائے بات بالکل صحیح ہے لیکن مقصد نہایت بھونڈا ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج ہم لوگوں کا یہی مرض ہے کہ عمل تو کچھ ہے بھلی لیکن اعتقاد میں بہت خامی ہے حالانکہ اعتقاد کی سرحد شروع ہی وہیں سے ہوتی ہے جہاں عقل کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ عقیدت و محبت کے بعد پھر شیخ کی تجویز میں اس قسم کی ناگواریاں نہیں ہوا کرتیں کیونکہ بالفرض وہ اگر کسی معاملہ میں اسکے مظلوم ہونے کے باوجود ظالم سے الٹی معافی مانگنے کو فرمائے تو یہ نفس پر شاق تو ہو سکتا ہے لیکن ایک سعید مرید اسکو اپنی زبان سے یوں نہیں کہہ سکتا کہ شیخ سے اس معاملہ کے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید وہ اتنا تو کہہ سکتا ہے کہ حضرت اس سے معافی مانگنا قلب پر شاق بہت ہے اور اسکی ایذاؤں کے پیش نظر اس سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن چونکہ آپ کا حکم ہے اس لئے معافی مانگتا ہوں۔ ادھر یہ عمل کرے اُدھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! شیخ پر حقیقت حال منکشف فرما دیجئے۔ اب اگر دنیا ہی میں فیصلہ ہو گیا اور مخلص و منافق میں امتیاز ہو گیا تو نبھا ورنہ صبر کرے اور سمجھے کہ کل قیامت کو انشاء اللہ تعالیٰ ان سب پر مجھے اجر ملیگا۔ اسمیں گو ضیق بھی ہوگی اور تکلیف بھی مگر طریق میں قدم رکھا ہے اور مخلص ہے تو ان سب کو اللہ تعالیٰ کے لئے برداشت کرے۔ اور حضرات مشائخ جو یہ فرماتے ہیں کہ طریق میں لوہے کے چنے چبانے ہوتے ہیں تو آخر وہ کون سے چنے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہی سب چنے ہیں جو چبانے پڑتے ہیں۔ ایک صابح اور نیک بخت مرید کا تو ایسے مواقع پر یہی طرز عمل ہونا چاہیئے

نہ یہ کہ کسی مواخذہ پر شیخ ہی سے بظنی کرنے لگ جائے اور اسکے خلاف دساؤں کا شکار ہو جائے کیونکہ اس طرح سے اگر ہر بات پر خود ہی... ایک رائے قائم کر لے گا تو شیخ کی جانب سے اسکے آگے ایک سداور دیوار حائل ہو جائیگی جو اسکے حق میں فیض سے مانع ہوگی۔

اور پھر مرید کو یہ حق ہی کب پہونچتا ہے کہ وہ دل ہی دل میں شیخ سے یہ

یہ مطالبہ کرے کہ شیخ کسی کی اصلاح و تربیت کے بارے میں اسکی رائے پر عمل کرے۔ شیخ و مربی تو وہ ہوا اور رائے و تجویز اسکی یہ کیوں؟ یہ تو مشیخت کے بالکل خلاف ہے۔ اس طور پر تو کوئی شیخ شیخ ہی نہیں ہو سکتا۔
 اسی طرح سے شیخ کے لئے بھی یہ کب جائز ہے کہ مثلاً دو مریدوں کا آپس میں نزاع ہو تو وہ کسی ایک کے ساتھ ہو کر دوسرے کا فریق بن جائے۔ اور کسی مرید کے لئے کسی حقیقی شیخ سے متعلق یہ خیال کرنا کب روا ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ شیخ مجھ ہی کو کہتے ہیں اور مجھ ہی سے مواخذہ فرماتے ہیں۔ اسکو (فریق مقابل کو) کچھ نہیں کہتے۔

جناب محترم! میں تو حضرت کے یہاں رہتا ہی ہوں دیکھتا ہوں کہ حضرت اس باب میں کس درجہ عدل سے کام لیتے ہیں۔ اصلاح کے سلسلہ میں باہر والوں کی تو کیا رعایت کریں گے جبکہ اپنے گھر کے خاص لوگوں تک کو نہیں چھوڑتے ہر شخص سے سوال ہر شخص سے پوچھ کچھ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر اسکو وہی شخص جانتا ہے یا شیخ جانتے ہیں۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ شیخ سب سے اپنے اس قسم کے معاملات بتا بھی دیں۔

سب سے مواخذہ ہوتا ہے اور حضرت والا کا کوئی مقرب نہیں ہے جو مخلص ہے وہی دوست ہے ورنہ اخلاص سے دور رہ کر کوئی اپنے کو مقرب سمجھے تو دھوکہ میں ہے۔

(وہ صاحب جو واسطہ تھے کہتے ہیں کہ) اسی قسم کی باتیں میں نے عرض کیں جبکہ ان صاحب نے بغور سنا اور تسلیم کیا۔ فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور آخر میں فرمایا کہ حضرت والا سے میری جانب سے جا کر عرض کر دیجئے کہ :-
 ”حضرت والا نے جو بیان فرمایا ہے اسکا تو دوسو سو بھی الحمد للہ نہیں ہوتا باقی اپنے اندر قافی بہت موجود ہے اسکے دور ہونے کی حضرت سے دعا کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کی سچی محبت اور کامل عقیدت

نصیب فرمائے۔

حضرت والا سے آکر ان صاحب کا جواب نقل کیا حضرت نے یہ تحریر خود اپنے قلم سے لکھ دی اور فرمایا کہ مجلس میں وہ صاحب تشریف لائیں گے پہلے اسکو سنا دو پھر اس کے بعد مجھ سے زبانی گفتگو کریں۔ تحریر یہ لکھی ا۔

۔۔۔ صاحب سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آخر مجھکو کام کرتے ہوئے بہت دن ہو گئے آپ بھی اسکو سمجھتے ہیں یہ بتلایئے کہ بھلا کوئی معتقد یہ کہہ سکتا ہے اور وہ بھی شیخ کے مواجہہ میں کہ مجھکو آپ سے عقیدت والہانہ نہیں ہے۔ فلاں صاحب بھی معافی کے لئے تشریف لائے تھے جب بھی یہی لفظ کہا تھا میرے سامنے دو مرتبہ ہو گیا پیچھے تو معلوم نہیں کتنی مرتبہ یہ لفظ کہا گیا ہوگا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ادھر اقرار کامل اور دوسری طرف انکار یا موہم انکار لفظ۔ آخر کیا لفظ کے کچھ احکام نہیں ہوتے؟ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں کسی کا فسر لیق نہیں بنتا اور نہ بننا مناسب ہے۔ بہت سے لوگ اب تدار میں آئے اور اسکے بعد بدل گئے یہ بدلنا اپنی اغراض نفسانیہ کی وجہ سے ہوتا ہے ورنہ بدلنے کے کوئی معنی نہیں اب آپ فرمائیے کہ آپ کیا سمجھے؟ اور آپ کو میں کیا سمجھوں۔ دو چیز ہے۔ اخلاص یا غیر اخلاص۔ بین بین درجہ معتبر نہیں۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نئے نئے لوگ گھس گئے ہیں اور ہمارے خلاف کہتے ہیں۔ یہ سب دلائل شرعیہ کے ماتحت فرماتے ہوں گے؟ شیخ کے مقابلہ میں یہ سب نفس کے پیچ میں جو مواخذہ کے وقت غیر مخلص سے صادر ہوا کرتے ہیں۔ عقیدت ہے تو ان امور سے روک سکتی ہے ورنہ غیر معتقد بیدھڑک زبان نکال کر طریق سے نکلتا ہے اور اپنے کو فاج بھی نہیں سمجھتا۔ اسکو سمجھنے کے بعد پھر زبان سلو کر دیتا۔

اس تحریر کو ان صاحب کو سنا دیا اور زبانی یہ کہا کہ ایک بات آدمی دوسروں کے لئے کہہ سکتا ہے لیکن وہی بات اپنے شیخ کو نہیں کہہ سکتا۔ یہ طریق بہت نازک ہے اس میں ادب ہی تو اصل چیز ہے۔

دیکھئے ہم لوگ علماء کے متعلق کہتے ہی رہتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں فلاں سے اجتہاد ہی غلطی ہوئی اور یہ کچھ معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن یہی بات ہم اپنے شیخ کو نہیں کہہ سکتے سعدیؒ نے گلستاں میں سرمایا ہے کہ۔ ط۔
 ”خطائے بزرگاں گرفتن خطاست“۔ جب عام مشائخ کا یہ حکم ہے تو پھر اپنے شیخ کا تو کیسا کچھ ادب ہو گا؟ اسی طرح مولانا روم فرماتے ہیں کہ
 گر خطا گوید و را خا طلی مگو و رشود پر خوں شهید آ نرا مشو

(یعنی کوئی اللہ والا اگر غلط بھی کہے تو اسکو خا طلی مت کہو اور اگر کوئی شہید پر خوں ہو جائے تو اسکو مت دھوؤ) خون شہیداں ز آب اولیٰ تراست ویں خطا از صد صواب اولیٰ تراست (اسلئے کہ شہیدوں کا خون پانی سے بڑھکر پاک ہے اسی طرح سے انکی خطائیں سیکڑوں صواب بڑھکر ہیں) یہ گفتگو سنکر ان صاحب نے فرمایا کیئے تو کچھ لکھ دوں باقی حضرت کے سننے زبانی تو مجھ سے کچھ نہ عرض کیا جائے گا۔

اس گفتگو سے ناظرین کو اندازہ ہوا ہو گا کہ سنئے اور مبتدی نہیں بلکہ حضرت والا سے قدیمی تعلق والوں کے بھی بہت سے معاملات یونہی چل رہے تھے تفصیل کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ سب کا بیان کرنا ممکن ہے اسلئے صرف چند خطوط نقل کرتا ہوں تاکہ لوگوں کے حالات اور انکی اصلاحات کا انداز معلوم ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت والا پر اپنے لوگوں کی عدم اصلاح کس قدر ضیق اور رنج کا سبب بنتی تھی۔

چونکہ یہاں لوگوں کے باہمی اختلافات قدیمی تھے اسلئے بیجا نہ ہو گا کہ اگر اہل موقع پر فقیہ (وطن) ہی کے دور قیام کی تحریر پیش کروں — حضرت والد ماجد مولوی سراج الحق صاحب مرحوم کے ہاتھ کی ایک تحریر کا غذا

میں ملی۔ وہو ہذا۔

(ایک اہم انتباہ اور ضروری اطلاع)

تمہید : اس مرتبہ احقر کی حاضری فچپور کے زمانہ میں حضرت شیخ مدظلہ کے پاس ایک لفافہ گننام پہنچا جسکا پتہ کاتب نے کسی وجہ سے رومی سلمہ سے لکھوایا تھا حضرت والا مدظلہ کو اس تحریر سے سخت تکدر ہوا اور حضرت والا نے احقر کو بتایا کہ وہتہد حکم فرمایا کہ یہ مضمون (جو آگے درج ہے) الہ آباد والوں کو جا کر سنادو۔ چونکہ سب برادران طریق کا ایک جگہ جمع ہونا دقت طلب ہے نیز زبانی کہنے سے زیادہ اثر تحریر کا ہوگا اسلئے میں الہ آباد کے جملہ برادران طریق سے درخواست کرتا ہوں کہ حضرت والا مدظلہ کے فرمانِ ذیل کو غور سے دو تین بار پڑھ لیں اسکے بعد اس کاغذ کی پشت پر دستخط کر دیں تاکہ میں یہی تحریر حضرت والا مدظلہ کی خدمت بھیج دوں۔

والسلام احقر سراج الحق غفرلہ
الر نومبر ۱۳۵۷ھ

وہ فرمان یہ ہے :-

(الہ آباد کے ان تمام لوگوں کے نام جو مجھے تعلق رکھتے ہیں) کچھ عرصہ سے میرے پاس الہ آباد سے ایک خاص نزاع کے متعلق فریقین نزاع کے خطوط یکے بعد دیگرے مسلسل آرہے ہیں آج بھی ایک خط گننام آیا ہے ہر چند کہ میں نے دو ایک بار ممانعت لکھ بھیجی کہ مجھے ان سب قصوں سے معاف رکھا جائے اور ان میں نہ ڈالا جائے اور میرے متعلقین میں سے کسی کی شکایت دوسرا فریق یا کوئی اور شخص مجھ سے نیکوے مگر الہ آباد والے باز نہیں آتے اور بار بار میرے پاس لکھ لکھ کر بھیجتے ہیں اب میں آخری بار الہ آباد والوں کو تصریحاً اطلاع دیتا ہوں کہ :-

اگر کسی کو کسی سے کوئی غلطی ہو تو ایک فریق یا دوسرا فریق مجھے کیوں پریشان کرتا ہے عدالت موجود ہے وہاں جا کر چارہ جوئی کرے یا جو جی چاہے کرے میرے پاس آئندہ سے کھل کر کچھ نہ آوے۔

ورنہ میں الہ آباد کے تمام متعلقین کے بارے میں یہ رائے قائم کر لوں گا کہ سب کے سب اس میں شامل ہیں اور سب مجھے اذیت دینا چاہتے اور یہ چیز سب کے لئے سخت مضر ہوگی اسلئے آئندہ فریق معاملہ بھی اور ان کے مشیرکار وہی خواہ کبھی اس سے بہت بچیں۔ والسلام۔

(حضرت والا کا سرمان ختم ہوا)

چند تشریحی معروضات از احقر سراج :

۱۔ حضرت والا مدظلہ کے اس لفظ سے کہ ”عدالت موجود ہے وہاں جا کر چارہ جوئی کرے“ کہیں کوئی برا در طریق عدالتی چارہ جوئی کی حضرت کی طرف سے اجازت نہ سمجھ بیٹھیں، عدالت کی تباہ کاریاں دیکھتے ہوئے کوئی معمولی مسلمان کبھی یہ بات نہ کہیں گانہ کہ حضرت والا مدظلہ! جنکا منصب تذکیر آخرت۔ انابت الی اللہ کی تعلیم دینا ہے۔ یہ لفظ تو ہمارے پست اخلاقی پر خطاب اور طنز یہ خطاب ہے ورنہ حضرت والا مدظلہ کا منشا اور تعلیم یہ ہے کہ اخلاق عالیہ کو اختیار کرو اور معاملات میں انکا اظہار کرو۔ صاف حق اللہ کی رضا کے حصول کے لئے اپنا حق معاف کرنے کی ہمت کرے اور جس کے ذمہ کوئی مطالبہ کسی کا آتا ہو وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لئے حق کی نیت کرے اس میں دینی جوش اور جلدی سے کام لے تاکہ نفس کو اور مشیرکاروں کو بہکانے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ ص۔ نامردی و مروی قدمے فاصلہ دارد۔

حضرت والا کے ارشاد پر ایک اللہ کے بندے نے ہمت سے کام لیکر اللہ کی مدد سے حضرت کی تشریف آوری کے وقت میں آیا ہی کیا تھا۔ پس جیسا افواہا معلوم ہوا۔ ہے کہ عدالت جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں خدا کے لئے اس

راے پر نظر ثانی کر لیجائے۔

۲۔ حق اور خاصان حق کی نہ تو عنایت دیکھ کر مطمئن ہو جانا چاہیے اور نہ حق اور خاصان حق کی کدورات سے بے نیاز و بے پروا ہو جانا چاہیے۔ اب کسی صاحب کو اسکی ہمت اور نیت نکرنی چاہیے کہ ہم مطالبہ تو حضرت ہی کے سامنے لینا اور دینا چاہتے ہیں، جیسا سنا جاتا ہے۔

۳۔ سب صاحبان خوب سن لیں کہ کسی ایک نے بھی اگر اس فرمان والا کے خلاف کیا تو جملہ آلہ آبادی انخوان طریق پر اسکا وبال پڑے گا اسلئے اپنے اوپر بھی رحم کریں اور سب آلہ آبادی انخوان طریق کے حال پر رحم کریں اور اسکی خلاف ورزی نہ کریں۔ والسلام

دستخط کنندگان :- محمد سراج الحق غفرلہ - عبد الوحید عفی عنہ
حبیب احمد عفی عنہ - خلیل احمد غفرلہ - احقر عبدالقدوس رومی غفرلہ - شاکر حسین
خال عفی عنہ - صابر حسین عفی عنہ - محمد عبدالستار عفی عنہ - کریم اللہ عفی عنہ
محمد ادریس عفی عنہ - عبد الحکیم عفی عنہ - محمد شفیع اللہ عفی عنہ - خلیل الرحمن -
سید حسین مصطفیٰ عفی عنہ - نثار احمد - محمد یسین عفی عنہ - عبدالمنان عفی عنہ
محمد ابراہیم عفی عنہ - میرالدین وغیرہ۔

حضرت اقدس باوجود اسکے کہ اصلاح میں سخت تھے مگر قلب کے بہت نرم تھے۔ اُدھر والد صاحب کے ذریعہ اہل آباد کو یہ تحریر بھیجی جس میں احقر کے بعض اعراب بھی مخاطب تھے اسلئے حقیقت حال سمجھانے کے لئے والد صاحب مرحوم کے فتویٰ جانے کے بعد ہی مجھ سے کچھ فرمایا اور فرمایا کہ اپنے والد صاحب کو بھی لکھ دو چنانچہ رانم نے یہ تحریر بھیجی :-

(آپ کے جانے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں آپ کا تأسف
 و تاثر عرض کیا تو حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ — میں تم لوگوں کو جو
 کہتا سنتا رہتا ہوں تو اس لئے تاکہ تمہاری عزت رہے تمہارے والد کی عزت
 رہے آدمی کی عزت رہے عیسیٰ کی عزت رہے کیونکہ انسان کی عزت اسکے
 افعال سے ہوتی ہے۔ آدمی جس بات کو کہدے پھر اسکو تو کرنا ہی چاہیے۔ میرا
 ذاتی کوئی نفع نہیں ہے۔ یہ سب باتیں سمجھ لو گے تو عزت کے ساتھ رہو گے
 اور یہ فرمایا کہ میری اس گفتگو کی اطلاع اپنے والد صاحب کو بھی کر دو)

انہیں حالات میں حضرت والا الہ آباد تشریف لائے اور یہاں بعض
 لوگوں سے بعض کے معاملات ابکھے ہی ہوئے تھے اس سلسلہ میں فردا فردا بھی
 اور خطاب عام کے ذریعہ بھی حضرت برابر سب کو نصیحت فرماتے رہے تاکہ
 حضرت کا سفر فتحپور (وطن) درپیش ہو گیا اور حضرت والا تین ماہ کے لئے
 میں فتحپور تشریف لے گئے اور وہاں کی فتح کی خوشی کے ساتھ ساتھ
 یہاں کے لوگوں کا غم بھی ہمراہ لے گئے۔ چنانچہ جناب تھاکر خاں صاحب مرحوم
 کے خط کے جواب میں فتحپور سے لکھا کہ :-

”دیکھو بھائی میرے ہی لوگوں نے بعض میرے ہی لوگوں کے خلاف
 قصداً اضرار پہنچانے کی کارروائی کی ہے اور بہت دنوں سے یہ کارروائی
 کر رہے ہیں مجھ کو بہت تکلیف ہے اور لوگ انکی بزرگی کے معترف ہیں اسوجہ
 سے میرا جی چاہتا ہے کہ الہ آباد نہ آؤں آپ بتائیے کہ یہ حرکت میرے ذمہ میں
 داخل ہو کر کیسی ہے؟ میں ایسے لوگوں کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتا جو مسلمانوں
 کے درپے آزار بنے رہتے ہوں۔ ذمہ والے نہیں بلکہ عموماً مسلمان
 اسی میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں والی اللہ المشتکی۔

اب بتلائیے کہ آپ کے کیا خیال مبارک میں آیا؟ اگر آپ کی بات
 کی طرف کوئی کان لگائے تو اسکو بھی سنا دیجئے اور جلد اسکا جواب مرحمت فرمائیے

یہ بھی سن لیجئے کہ میں اہل اصلاح کا نہیں ہوں اسلئے میرا جقد کوئی
شاکی ہو درست ہے اب میرے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے علیحدگی
اختیار کروں ورنہ انکی باتوں کی نسبت بدعقیدہ لوگ میری طرف کریں گے
یا کرتے ہیں۔ اب میں ان لوگوں کے معاملے کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں ہر شخص
خود وہاں اپنا جواب دہ ہے۔

پھر غالباً انھیں ایام میں ایک اور تحریر شاکر خاں صاحب موم مولوی
عبد المجید صاحب وکیل انعام الحق صاحب کے نام آئی۔ وہ ہوندا۔
جناب شاکر خاں صاحب و مولوی عبد المجید صاحب وکیل انعام الحق صاحب
سلمہم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ یہ بات ضرور ایسے لوگوں کو پہونچا دیجئے
جو شکایت یہاں پہونچا کر اپنا تابع بنا کر اپنے دشمن سے انتقام لینا چاہتے ہیں
وہ یہ سن لیں کہ گو میں اصلی پر نہیں ہوں مگر ایسا بھی نہیں ہوں کہ یہ لوگ مجھ کو
اپنا تابع بنالیں انکو اپنا ہوش درست کرنا چاہیئے اور اپنا رتبہ پہچاننا چاہیئے
جب چند ٹھیکرے کسی کے پاس ہو جاتے ہیں تو اسکا دماغ چل جاتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ڈرا سکے دل سے نکل جاتا ہے اور نہایت بد فہم و بداخلاق
ہو جاتے ہیں اور ظلم پر کمر بستہ ہو جاتے اور پھر اپنے کو عادل بھی سمجھتے ہیں اور
ہم جیسے سے منوانا چاہتے ہیں۔

میں یہ الفاظ اس لئے لکھ رہا ہوں تاکہ یہ لوگ باز آئیں اور سمجھیں کہ ہم پر
نفس مسلط ہے اور وہی یہ سب کرا رہا ہے ورنہ بارہا معافی تلافی ہو چکی اور
کہہ چکے ہیں کہ دل صاف ہو گیا۔ زبان سے کہہ دیتے ہیں اور دل اور نفس
ہرگز اس پر راضی نہیں ہوتا نفاق انکا شیوہ ہو گیا ہے میں نے بہت نرمی
سے سمجھایا مگر انھوں نے نفاق کو جو انکی زندگی کا نصب العین ہے نہیں چھوڑا

لیپ پوت میرے یہاں نہیں ہے۔ اصلاح نفس ہے اور اصلاح نفس پر آسان نہیں۔ آکر غلط اقرار کر لیتے ہیں اور لوگ باور کر لیتے ہیں۔ وما یخدعون الا انفسہم وما یشعرون۔

پھر اسی درمیان میں اور انھیں حالات میں جناب قاری محمد حسین صاحب مدظلہ کو ایک تحریر لیکر الہ آباد بھیجا جسکا جواب شاکر خاں صاحب کے خط میں ملاحظہ ہو اور آگے حضرت والائے جو انکو جواب تحریر فرمایا وہ ملاحظہ ہو:۔

”شب میں جناب قاری صاحب نے حضرت والائی وہ تحریر بھی احقر کو سنائی جو اپنے ہمراہ لائے ہیں انشاء اللہ اس پر عمل کر دنگا خانہ جنگیوں سے دور رہونگا آپس میں میل جول اور محبت رکھونگا کیسی دلائل زاری نہ کرونگا۔ ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرونگا جو خدا اور رسول کی مرضی کے موافق ہو اور حضرت والائے کو پسند فرمائیں، ہمارے قلوب میں حضرت والائی سچی قدر پیدا ہو جائے اور ہماری زندگی حضرت کے زیر سایہ گذرے اور حضرت کی برکات اور فیوض سے ہم لوگ بہرہ اندوز ہوں۔ ہم اپنے بزرگوں کے بدنام کنندہ نہ بنیں۔ ہمارے اعمال و اطوار سے ہمارے بزرگوں کی نیک نامی ہو۔ ہم نے واقعی حضرت کی قدر نہیں کی اب ہم کو اللہ تعالیٰ قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔“

تو نظیری زلفک آمدہ بودی جو مسیح باز پس رفتی کس قدر توشاخت و ریغ (اے نظیری تو آسمان سے مانند مسیح کے آیا اور پھر چلا بھی گیا مگر تیری قدر کسی نے بھی نہ پہچانی) تحقیق، خانصاحب سینے آپکو معلوم ہے کہ شمس الدین خاں کی وجہ سے میں اپنا مکان و خانقاہ اور مسجد سب چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب اسکے تعلقات سینے ہر کام میں ہمارے پیش پیش رہتا ہے ہمارے ہر مشورہ میں شریک اور دل سے شریک رہتا ہے یہاں تک کہ اسکی ایک بچی کو اسی کے فریق کے ایک آدمی نے مار دیا تھا جس پر اسکو بہت غصہ آیا مگر یہ کہا کہ ہم مولانا کو لانے میں پیش پیش تھے

اسلئے ہم فساد کرینگے ورنہ بتاتے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ کہاں تک وہ مان گیا ہے۔ اب گاؤں کا حال سینے چار بریلوی نے اس مذہب سے تائب ہو کر جھکو تحریر لکھدی ہے کہ ہم دیوبندی ہیں اور آہستہ آہستہ امید ہے ستائیس ہو جائیں گے۔ اب موافقین کو لیجئے سب نے تحریر دیدی ہے کہ ہم شریعت مقدسہ پر عمل کریں گے اور باہم اتفاق و اتحاد سے رہیں گے اور تمھارا کہنا مانیں گے۔ اور دیار کے لوگ بھی بہت زیادہ متاثر ہیں اور اس تاثر کا اثر خارج میں ظہور پذیر ہو رہا ہے حالانکہ میں کہیں جاتا نہیں ہوں مگر اہل آباد میں بقول حضرت مولانا محمد حسین ہمدانی رحمہ اللہ حد کا مادہ زیادہ اور مشائخ کے اعتقاد و اعتماد کا مادہ بہت کم ہے اسلئے سچی عقیدت سے یہ لوگ محروم ہیں بلکہ آج میرے پاس بخشی بازائے لوگوں کی تحریر موجود ہے انھوں نے میری بات سمجھی ہے اور اسکا اقرار کیا ہے کہ ہم جو چیز تم نے لکھی ہیں یعنی دینی ماحول پیدا کریں گے اور تنازع و نزاع باہمی سے بچیں گے اور اتفاق و اتحاد سے رہیں گے، یہ کس قدر دور تھے قریب ہو گئے اور جو قریب سمجھے جاتے تھے دور ہیں۔ جانتے ہیں کیا بات ہے؟ ہم سب بد اخلاقی کے شکار ہیں۔ مسلمانوں کے حقوق ہی نہیں پہچانتے اور ان پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اسکو دین ہی نہیں سمجھتے فقط نماز روزہ کو دین سمجھتے ہیں درمختار میں ہے و اذا کان الرجل یصوم ویصلی ویضر الناس بیدہ لسانہ فذکر بما فیہ لیس بغیبتہ قولہ فذکر بما فیہ لیس بغیبتہ ای یحذره الناس ولا یفتروا بصومہ وصلواتہ فقد اخرج الطبرانی و بیہقی و الترمذی اترعون فی الغیبتہ عن ذکر الفاجر اذکروا بما فیہ یحذره الناس شامی ص ۲ جب آدمی روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور پھر بھی لوگوں کو اپنے ہاتھ اور زبان سے ضرر پہنچاتا ہو تو اس میں جو برائی ہے اسکا ذکر غیبت نہیں ہے تاکہ لوگ اس سے احتیاط کریں اور اسکے نماز و روزہ سے دھوکا نہ کھائیں۔ طبرانی وغیرہ میں ہے کہ کیا تم قاجر کی غیبت کرنے سے ڈرتے ہو؟ ارے نہیں اسکی باتیں خوب بیان کرو تاکہ لوگ اس سے بچ سکیں۔ پس ایسا شخص اپنے علی الاعلان فسق کی وجہ سے واجب الاحترام نہیں ہے۔

جیسا کہ ابھی حضرت والاؒ نے تحریر فرمایا کہ — اہل الہ آباد میں حدیث کا مادہ زیادہ ہے اور لوگ بد اخلاقی کے شکار ہیں۔ مسلمانوں کے حقوق نہیں پہنچا اور معلوم ہو تو ان پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ تو بیچ ہے اپنے معاملات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل صحیح تشخیص فرمائی اور یہ حد ایسا شدید مرض ہے کہ اس سے گلو خلاصی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس کو الہ آباد کے لوگوں کی اصلاح کے سلسلے میں مشققت اٹھانی پڑی۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو اسکا اجر عطا فرمائے۔ اب جنکو بننا تھا بن گئے اور جنکی قسمت میں محرومی لکھی تھی وہ محروم رہے۔ ناظرین کو حضرت والا کے سابقہ جوابات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ کس قدر اصلاح کے لئے بیتاب ہیں اور کتنی ضیق اس سلسلہ میں قلب والا کو اٹھانی پڑی یہاں تک کہ اپنے ایک جواب میں شاکر خاں صاحب کو یہ تحریر فرمایا کہ :-

”آپ کا خط عین انتظار میں آیا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ میری تحریر بہت لوگوں کو پسند ہوئی۔ میں نے صرف اسوجہ سے لکھا کہ میری نا اہلی ظاہر ہو۔ اب تو آپ کے خط سے بھی ظاہر ہو گیا سب (ہی لوگ) مظلوم ہیں۔۔۔۔۔ اور ظالم کا پتہ نہیں اب میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ ان حالات کے متعلق آپ لوگوں کے فیصلہ کا منتظر ہوں۔۔۔۔۔ لکھکر انتظار رفع فرمائیے۔ اور معاملہ کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں ہر شخص خود وہاں اپنا جواب دہ ہے اور میں نا اہلی کا اقرار کرتا ہوں کہ میرے لوگوں کا ایسا ہونا میرے نقصان کی دلیل ہے۔“

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو بھین غیروں کی بات
 میں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں
 اب اپنے دین کا ہر شخص ذمہ دار ہے“ والسلام۔ وصی اللہ عفی عنہ

اسی سلسلہ کی ایک اور تحریر ملاحظہ فرمائیے :-
 ایک صاحب نے جن کا تعلق حضرت اقدسؒ سے دیرینہ تھا۔ اپنے
 معاملات اور لوگوں کی آویزشوں سے پریشان ہو کر حضرت کی خدمت میں
 دس آدمیوں کے نام تحریر کئے کہ ان لوگوں سے مجھے شکایت ہے اور
 غالباً مقصد انکا یہ تھا کہ یہ لوگ بھی چونکہ آپ سے تعلق رکھتے ہیں لہذا آپ ہی
 میری طرف سے ہو کر ان لوگوں سے بھڑ جائیے۔ حضرت والا نے اسی پرچہ
 پر ان صاحب کو تو یہ جواب تحریر فرمایا کہ :-

” میں لکھ چکا ہوں کہ — الہ آباد کے لوگوں کو (ہر ایک کو) سمجھ
 گیا ہوں اور اصلاح میں بھی لگ گیا ہوں اس سے زیادہ کیا کر سکتا
 ہوں۔ اب آپ کے وہ لوگ مرضی موافق ہو جائیں یہ میرے
 اختیار سے باہر ہے۔ میں نے بہت کچھ کر دیا ہے۔ آپ لوگوں کا
 تابع نہیں ہو سکتا۔ اپنے دین کا ہر شخص کو اختیار ہے جو جیسا کرے
 ویسا پائے گا اور پا ہی رہا ہے۔ ہر شخص پر اپنے نفس کی اصلاح
 فرض ہے جیسے نماز اور روزہ فرض ہے اور یہ مشکل امر ہے۔
 والسلام وصی اللہ عفی عنہ

اور شاکر خاں صاحب کو اس سلسلہ میں یہ تحریر لکھ کر ایک صاحب کی معرفت ارسال فرمائی
 و صوبہ :-

آج ایک خط آیا ہے اس میں ایک پرچہ ہے اپنے کسی دشمنوں کا لکھ کر
 بھیجا ہے میں ان لوگوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ ایک عبارت شامی سے
 لکھ رہا ہوں ملاحظہ فرمائیے جس میں ازالہ امراض نفسانیہ کو فرض کہا گیا ہے اور
 نماز و روزہ کی طرح فرض عین۔ اب آپ بتلائیے کہ یہ بزرگ لوگ جو ہمارے
 ساتھ متعلق ہیں کیا اصلاح نفس کو فرض عین سمجھتے ہیں حاشا و کلا۔
 سب جگہ کو فاسد کرنے کے بعد اب ہماری جگہ کو فاسد کرنا چاہتے ہیں

اب بتائیے کہ ہم لوگ کہاں جائیں ؟ اور اپنا دین ان سے کس طرح بچائیں۔ آپ کو اسکا جواب دینا اور حق جواب دینا لازم ہے۔ گرفت خداوندی ہماری گرفت سے کہیں زیادہ ہے ان اخذہ الیم شدیداً شامی کی عبارت ہے اعلم ان علم الاخلاص والعجب والحسد والرياء فرض عين مثلها غير آفات النفوس والكبر والشح والحقد الخ جان لو کہ اخلاص۔ عجب۔ حسد اور ریا کا علم فرض عين ہے اور اسی طرح دیگر ذائل نفس کا بھی مثلاً کبر۔ شدت نجل کینه۔ دھوکا دہی۔ غصہ۔ عداوت۔ بغض۔ طمع۔ غرور۔ خیانت۔ براہمت۔ حق بات سے سرکشی۔ مکر۔ خداع۔ قناعت قلبی طول امل وغیرہ اور ان امراض سے کوئی بشر خالی نہیں ہو سکتا لہذا ان تمام چیزوں کا علم بوقت حاجت حاصل کرتا رہے تاکہ اس کا نفس ان گندگیوں سے پاک وصاف ہو جائے کیونکہ انکا ازالہ فرض عين ہے اور ازالہ ان ذوائل کا بدون انکی تعریف اور علامات کی صحیح معرفت کے ممکن نہیں۔ انتہی۔

اور معرفت اسلئے نہیں ہو رہی ہے کہ نفس کی اصلاح کو کوئی فرض عين ہی نہیں سمجھتا۔ صرف نماز روزہ کو فرض سمجھتے ہیں اسکی وجہ سے انھوں نے اپنا دین ہی نہیں تباہ کیا ہے بلکہ اپنی دنیا بلکہ اپنا گھر اور تمام محلہ اور تمام شہر تباہ کر دیا ہے۔

اب ہم لوگوں کو بھلی یہ بد اخلاق تباہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی اس ناپاکی اور پلیدی کا انکو علم بھی نہیں۔ اب آپ لوگ بتائیے کہ ہم کیا کریں ؟ فقط ایک ہی چیز الٹ باقی رہ گئی ہے کہ انکی نفیات کی جزا کو خدا کے حوالہ کریں کہ وہ احکم الحاکمین ہے۔ والسلام وصی اللہ عفی عنہ

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس طرح سے دسوزی اور تعب و مشقت ایک مصلح کو قوم کی اصلاح کی خاطر اٹھانی پڑتی ہے۔ واقعی جو حضرات مصلحین متبع سنت ہوئے ہیں انکو ایسا ہی دیکھا گیا ہے کہ وہ حضرات اور تمام سنتوں کے ساتھ ساتھ بعدک باع نفسک ان لایکونوا مومنین ترجمہ) شاید آپ اپنے نفس کو ان کے مسلمان نہ ہونے کے غم میں ہلاک ہی کر دیں گے والی سنت سے بھی متصفت ہوتے تھے اور شاید زمانہ میں ایسے مصلحین کی کمیابی ہی پر افسوس کرتے ہوئے کبھی کبھی یہ فرماتے تھے کہ ————— ”اب آج دھرا ہے اخلاص اور دھرے میں مصلح کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ دوسرو کی اصلاح کی خاطر اپنے قلب و دماغ پر اتنا تعب اور بار برداشت کرے“

راقم نے اہل الہ آباد کا اب تک یہ ایک ہی رخ بیان کیا ہے اور مقصد اس سے یہ تھا کہ آپ پر یہ ظاہر کر دیں کہ ہمارے حضرت اقدس کی تمام ہی زندگی اسی کشمکش میں گزری۔ وطن میں اہل وطن اور اہل اطراف سے جو سابقہ پڑا وہ تو کہیں بڑھکر کھایا یہاں تک کہ فساد برپا کر کے لوگوں نے حضرت والا کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ پھر گورکھپور میں ایسا فتنہ تو نہ تھا تاہم بہت بہت ضیق وہاں بھی حضرت کو ہونی، بالآخر الہ آباد تشریف لائے تو یہاں کے حالات آپ کے سامنے ہی ہیں ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ واقعی

خون دل پینے کو اور سخت جگر کھانے کو یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو غرض کہ حضرت اقدس کے اسی نوع کے خط فتنچور سے آتے رہے چنانچہ اکثر شاکر خاں صاحب مرحوم کے نام آتا اور انھیں کو حضرت واسطہ بناتے اور مضمون خط کو تمام متوسلین حضرت والا کو سنایا جاتا یہاں تک کہ اسی سلسلہ کا ایک خط خانصاحب مرحوم نے ایک دن اہل مجلس کو سنا کر ان سے جواب طلب کیا۔ اہل الہ آباد نے اس پر متفقہ طور پر جو جواب حضرت اقدس

کو لکھا وہ یہ ہے :-

(اہل الہ آباد کا معافی نامہ و آئندہ اصلاح کا عزم)

عرض ہے کہ آج مجلس میں حضرت والا کا خط شاکر خاں صاحب نے ہم سب کو سنایا حضرت والا نے جو کچھ تحریر فرمایا بالکل صحیح ہے بیشک ہم لوگوں سے بہت کوتاہیاں ہوئیں۔ حضرت والا معاف فرماویں۔ اب ہم لوگ دل سے ارادہ کرتے ہیں کہ شریعت مقدسہ پر پورے طور سے پابندی کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق پیدا کریں گے۔ آپس کے جو تعلقات بگڑے ہیں ان کو درست کریں گے اسمیں کامیابی کے لئے حضرت والا سے درخواست دعا و توجہ کی ہے۔

دستخط متوسلین حضرت والا (الہ آباد)

(حضرت اقدس کا جواب با صواب)

آپ حضرات کی حق پرستی سے جی بہت خوش ہوا میں اہل حق کے ساتھ ارتباط رکھنا چاہتا ہوں اور اسکو اپنی سعادت سمجھتا ہوں اور اب ان لوگوں سے مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے (جنکی یہ تحریر ہے) اور (اب جنکی تحریر ابھی نہیں آئی ہے) ان لوگوں کا انتظار ہے۔ اور سب سے معافی مانگتا ہوں۔

والسلام وصی اللہ عفی عنہ

راقم عرض کرتا ہے کہ اہل اللہ کی خفگی اور ناراضگی کچھ اپنے نفس کیلئے نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ حضرات جس کو کچھ کہتے سننے میں یا کسی سے ناخوش ہوتے ہیں تو محض اللہ اور فی اللہ ہوتے ہیں جب وہ شخص برائی سے باز آجائے

اور توبہ کر لے تو پھر ان حضرات کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آجاتا ہے کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ جو شخص گناہ اور معصیت سے توبہ کر لے تو پھر وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے وہ گناہ کیا ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اب اسے غوش نہ ہو جانے کے کیا معنی؟ نیز یہ حضرات یہ بھی سمجھتے ہیں کہ انسان نفس اور شیطان کے ہاتھوں گرفتار ہے۔ بیچارہ ~~تھوڑا~~ مجبور ہی ہے اسلئے اس پر انکو رحم بھی آتا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ کہیں مواخذہ میں ہم سے کچھ زیادتی ہو گئی ہو اس سے معافی بھی طلب فرما لیتے ہیں۔ یہ اللہ والوں کی سیرت ہے اور انکا یہی کردار وقت پر کتنوں کو ذبح کر دیتا تھا۔ یعنی کتنے لوگ انکی اس ادا سے سبیل ہو جاتے تھے۔

چنانچہ اہل الہ آباد کا مجموعی طور پر جب معاملہ صاف ہو گیا تو بطور نصیح نصیح کے حضرت اقدس نے پھر ایک تقریر فرمائی اور پھر اسکو بہ نفس نفیس اپنے قلم سے لکھ کر حاضرین کو سنا بھی دیا اب چونکہ ان حضرات کے علاوہ یہ مضمون تمام امت کے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا اور ہر اس شخص کے مفید اور کارآمد تھا جس کا تعلق کسی شیخ سے ہو یا وہ راہ اصلاح میں قدم رکھنا چاہتا ہو اسلئے ہم اسکو یہاں بعینہ درج کرتے ہیں:۔

فہرما یا کہ — میں نے کل بعد نماز ظہر جو بیان کیا تھا اسکو قلم بند کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جو شخص دعوت الی اللہ کا کام کرتا ہے وہ اگر بصیرت سے خالی ہے تو حسب تصریح مشائخ مکر میں پڑا ہوا ہے اسکا فساد اسکی اصلاح سے زیادہ ہوگا۔ جو شخص خود مطمئن نہیں ہے وہ دوسروں کو کیا مطمئن کر سکے گا اور جس شخص کو خود یقین نہیں ہے وہ دوسروں میں یقین کیسے پیدا کر سکتا ہے اسلئے اس منصب کے لوازم میں سے بصیرت اور یقین ہے اپنے طریق کار پر اب جو لوگ ایسے شخص کے پاس آمد و رفت رکھنے

والے ہیں انکو جتنا اسکا یقین ہوگا کہ ہمارا تبوع محقق ہے بصیرت پر اور یقین پر ہے اتنا ہی اسکا اتباع کریں گے اور اس طرح انکو بھی رفتہ رفتہ بصیرت حاصل ہو جائیگی ورنہ اتباع کی دولت سے کبھی فائز المرام نہ ہوں گے ہم کھلی آنکھوں اسکا تجربہ کر رہے ہیں کہ کثرت سے لوگ اسکا شکار ہیں کہ جب ایسا آدمی کوئی اصلاحی چیز یا کسی غلطی پر انکو تنبہ کرتا ہے تو نفس و شیطان اسکو سمجھاتا ہے کہ انھوں نے تمھارے معاملہ میں غلطی کی ہے اور تمھارے دشمن کے کہنے پر عمل کیا ہے اور ہر فریق اپنے معاملہ میں اسی پر عمل پیرا ہے۔ اب بتائیے کہ اگر ایسا ہے تو ایسے شخص کو یک کثرت جواب دیدو کہ — عہ او خوشن گم است کرا رہبری کند۔

لیکن اگر چھوڑنے کی ہمت نہیں ہے تو سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ قلب کا ضعف یقین دور کرو اور پختگی سے بلا تردد و بلا شک عقیدہ راسخ کرو کہ یہ شخص ہمارا خیر خواہ ہے اگرچہ ہمارے نفس کے خلاف کہتا ہے ہمیں اسکا اتباع کرنا ہی دین ہے اور اسی میں ہمارا فلاح ہے اسکے بعد دیکھو کہ راستہ کھلتا ہے یا نہیں۔ اہل الہ آباد کی اصلاح کے سلسلہ میں لوگوں کے احوال اور حضرت اقدس کا مواخذہ اور عتاب اور ان سے ناراضگی کا منظر تو آپ نے دیکھا نیز یہ کہ ان حالات میں حضرت والا کو کس قدر ضیق برداشت کرنی اور تعب اٹھانا پڑتا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت اقدس یہاں کسی سے خوش ہی نہیں تھے ایسا نہیں بلکہ اللہ والوں کی خفگی اور ناراضگی محض لوگوں کی اصلاح کی غرض سے ہوتی تھی جب کسی کو اپنے نقص کا احساس

اور حالت کی درستگی کا خیال پیدا ہو جاتا تھا تو پھر اسکے بعد کچھ نہیں حضرت بھی مطمئن ہو کر خوش ہو جاتے تھے چنانچہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ اتنی ناراضگی کے بعد بھی جب لوگ گڑگڑائے اور معافی مانگی تو حضرت نے بھی انہیں معاف ہی فرما دیا۔

اس کے علاوہ الہ آباد میں حضرت کی تشریف آوری بہت سے لوگوں کے حق میں رحمت ثابت ہوئی۔ ہمارے بھائی عبداللطیف صاحب حسن منزل والے خود مجھ سے فرماتے تھے کہ حضرت والا کے الہ آباد تشریف لانے کا فائدہ جس جس کو ہوا وہ جانے خود مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ اسکو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ ناچیز پر کرم ہی ہوا کہ یوں سمجھئے کہ جیسے پیسے کے پاس کنواں پہنچ جائے۔ کہتے تھے میرے شروع کے حالات کچھ گڑبڑ ہو چلے تھے اس طرح سے کہ یوں تو اکھڑ میں نماز روزہ کا بچپن ہی سے پابند تھا مگر ایک غیر متشرع پیر کے یہاں پھنس گیا تھا اللہ پاک نے کرم فرمایا اور کسی کی صحبت کیوجہ سے مجھے ان سے نجات ملی۔ پھر حضرت اقدس کے یہاں فتحپور تال تر جا حاضر ہوا تو سکون ہوا کہ ہاں یہ صحیح جگہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حضرت والا اپنے وطن سے گورکھپور تشریف لے گئے اور اسکے بعد بلا شان و گمان الہ آباد آ گئے اور یہاں مکان بھی لے لیا اس لئے میں نے تو اللہ تعالیٰ کا بہت بہت شکرا ادا کیا اور یہ سمجھا کہ حضرت والا الہ آباد میری ہی اصلاح کے لئے بھیجے گئے ہیں اور مجھے حضرت کی صحبتوں سے بہت ہی فائدہ ہوا اب بھی ہر دن روز افزوں معلوم ہوتا ہے

اسی طرح سے ایک جوان صاحب کا اصلاحی خط ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ حضرت کے یہاں سے پائے والوں نے کون سا دولت پائی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ :-

حال : الحمد للہ کہ معمولات پورے کر رہا ہوں۔ حضرت اقدس و عارفہ مائیں کہ اللہ تعالیٰ ذکر کے برکات مجھ جیسے نالائق کو محض اپنے فضل و کرم سے نصیب فرمادیں۔ آج اسکول کی کتاب پڑھ رہا تھا بیچ بیچ میں سبج لیکر اسم ذات کا ورد کرنے لگتا تھا، یکایک دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا طبیعت میں ایک شوق پیدا ہوا کہ جو کچھ ملتا ہو جلدی سے مل جاوے، گو میں کسی قابل بھی نہیں ہوں مگر قابلیت بھی تو ادھر ہی سے عطا ہوگی۔ زبان پر بار بار خواہ صاحب کا یہ شعر آنے لگا

ہر تمناد دل سے رخصت ہو گئی ایتوا جا اب تو قلوبت ہو گئی

آفسو آنکھ سے نمودار ہو گئے۔ حالانکہ یہ شعر پڑھتے ہوئے شرم آتی ہے مگر حضرت بس جی یہی چاہتا ہے کہ جلدی سے عطا ہو جائے۔ حضرت اقدس اس نالائق کو کسی آسان راستہ سے پہنچا دیں۔ ایتو بعض وقت طبیعت بہت الجھتی ہے۔ غیر اللہ کا خیال دل میں دیکھ کر سخت افسردگی ہوتی ہے بعض وقت تو مرنے کا جی چاہتے لگتا ہے بعض وقت تو قاری صاحب کے یہاں پڑھنے جاتا ہوں وہاں بھی جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مشکوٰۃ شریف پڑھتا ہوں مگر پھر بھی طبیعت تپہ نہیں کیوں بھاگتی ہے۔ حضرت اقدس میرے لئے راستہ جو بھی تجویز فرمادیں مشکل یا آسان سب منظور ہے کیونکہ حضرت میری فلاح سب سے زیادہ چاہتے ہیں مگر طبیعت بس یہی چاہتی ہے کہ جلدی سے عطا ہو جائے۔ تحقیق : ا جی ملے گا کیوں گھبراتے ہو۔

حال : حضرت اقدس میری حالت پر سب سے زیادہ توجہ فرمادیں۔ آپ ہی اگر پاس گئے تو مشکل بھی آسان، اور دیر بھی سویر، اور بعب چیز بھی قریب ہو جاوے گی حضرت اقدس فرمایا کرتے ہیں کہ نوجوان ربط کے تحت بہت کرتے ہیں مگر حسب مشکل کو آسان کر نیوالی ہے یعنی محبت وہی حاصل نہیں کرتے تو حضرت اقدس کس طرح حاصل ہو حضرت ہی اس نالائق کو حاصل کرا دیوں باقی میں خود اپنے اندر

۵ قاری صاحب مراد کرہ کے قاری حبیب حمد ۳۴۲ صاحب مظاہر ہیں۔

طاقت نہیں پاتا۔ تحقیق: اللہ تعالیٰ محبت دے۔

اسی طرح سے ایک اور صاحب کا عریضہ ملاحظہ ہو جو کہ دین کے ساتھ ایک ممتاز دنیوی عہدے پر فائز ہیں اور اسکا مصداق ہیں کہ ع۔
ما احسن الدین والدینا اذا اجتمعا۔ دنیا کے ساتھ اگر کسی انسان میں دین بھی
جمع ہو جائے تو سبحان اللہ کیا ہی خوب بات ہے۔ وہ حضرت کو
کہتے ہیں کہ:۔

حال: معمولات و اذکار و نوافل حضرت والا کی دعار کی برکت سے پورے کر لیتا
ہوں۔ اپنے رذائل کی نگرانی رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضرت والا
کی توبہ اور دعار کی برکت سے متجاوز عن الحدود نہیں ہوتا ہوں۔ بس اللہ تعالیٰ
کی ہر بانی اور کرم کو ہر امر میں ہر آن اپنے ساتھ پانے لگا ہوں جس سے بڑی
طمانیت قلبی میسر ہے۔ اپنا جہل علمی جو کہ ایک حقیقت ہے اور جو نگاہوں سے
پوشیدہ تھا سامنے آگیا اور تقریباً ہر آن پیش نظر و خیال رہتا ہے جسکی وجہ سے
ناز و کبر کی بنیاد ہی مل گئی ہے۔ حضرات علماء کا احترام اور انکی منزلت کسی آن
فراموش نہیں ہوتی بلکہ ہر بندہ مومن اپنے سے علم میں اور ہر اعتبار سے اچھا
فطر آتا ہے، حصول تواضع اور استحضار فنائے خودی میں اس سے بڑی مدد مل ہی
ہے۔ جناب باری تعالیٰ کے فضل و کرم و مغفرت کے علاوہ ایک شتمہ بھی
سرمایہ اپنے پاس نہیں جو کہ قابل قبول ہو سکے یا پھر ان کے فضل و کرم کے بعد
اپنے بزرگوں کے دامن کا سہارا ہے۔

اپنے علم دینی کے نہ ہونے کے سبب قدرے افسوس ہے کہ میں نے
کیوں نہیں عربی پڑھی کہ قرآن و حدیث کو عربی میں سمجھ لیتا۔ ارادہ ہے اولین فرصت
پر انشاء اللہ تعالیٰ بقدر ضرورت عربی پڑھونگا۔

اپنے بچوں کی تعلیم کے باب میں بھی بہت غیر مطمئن ہوں۔ بڑے بچے کو

انگریزی تعلیم میری سمجھ میں راس نہیں آرہی ہے۔ اپنی آئندہ حاضری میں جو
 انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہوگی انکو بھی ساتھ لاؤنگا تاکہ حضرت والا انکو دیکھ کر فیصلہ کر سکیں
 اپنے عربی نہ جاننے سے جو اسوقت ایک بڑا فائدہ اپنی تسلی کے لئے
 محسوس ہو رہا ہے وہ یہ کہ اس سے میرا کبر کا مادہ بہت زیادہ ٹوٹ گیا جو شاید
 علم دین کے ہوتے ہوئے آسانی سے نہ جاتا اور بعد اس رذیلہ کے شکست کے
 ممکن ہے کہ علم دینیات کا پڑھنا مجھے مفید ہو۔ چنانچہ جو علوم دینی کہ اردو میں
 ہیں انکو پڑھنے سے بہت زیادہ فائدہ محسوس کر رہا ہوں۔ جتنا ہی ان علوم کو پڑھتا ہوں
 اپنا جہل زیادہ سے زیادہ منکشف ہو رہا ہے اور آجکل اسی حالت کا غلبہ
 ہر آن رہا کرتا ہے ۷

جبھی جا کے مکتب عشق میں سبق مقام فناء لیا
 جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صادق سے بھلا دیا
 اللہ تعالیٰ حضرت کو حیات خضریٰ اور دولت سرمدی کے ساتھ قائم و دائم
 رکھیں مجھ ناکارہ کی اصلاح انشاء اللہ تعالیٰ حضرت کی دعا اور توجہ سے
 ہو جائے گی۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان خطوط کو سبحان اللہ کیا اچھا حال ہے ایسے
 ایسے کتنے حضرات تھے جن کے حالات میں انقلاب آیا باقی دیکھنے کی جو چیز ہے
 وہ یہ کہ قدر مشترک کے طور پر دونوں خطوط میں جو بات ہے وہ معمولات کی پابندی
 ہے۔ اس طریق میں اسی سے پاتا ہے جو پاتا ہے اور جو محروم رہتا ہے وہ
 اسی میں کوتاہی کرتا ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے احوال، اعمال کے تابع
 ہوتے ہیں جیسا عمل ہوگا ویسا ہی حال پیدا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسکا کچھ حصہ
 راقم کو بھی عطا فرمائے۔
 اسی طرح سے ایک کلی نفع جو الہ آباد کو حضرت کی تشریف آوری سے

ہوا وہ یہ تھا کہ یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس کی ناراضگی کے دور میں ایک اللہ کے بندہ سے یہی لفظ لکھوا دیا حضرت والا اس سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اس نے نفع کی صابج تعبیر کی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے حضرت کو لکھا کہ :-

حال : آپ کی غیر موجودگی سے ہم لوگ یہاں ایک بہت بڑی کمی محسوس کرتے ہیں لیکن "صاحب امر" کی میثیت سے آپ کو کلی اختیار ہے کہ آپ جہاں چاہیں رہیں لیکن الہ آباد کو فراموش نہ فرمائیں۔

جو دینی ماحول آپ کی موجودگی سے الہ آباد میں پیدا ہوا ہے وہ الہ آباد کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے (اسکے جواب میں حضرت والا نے تحریر فرمایا کہ تحقیق : دینی ماحول ہی تو چاہتا ہوں اب تو گزرم لوگوں کا بغیر اسکے مشکل ہے اللہ تعالیٰ ہر جگہ یہ ماحول پیدا کر دے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان صاحب نے حضرت اقدس کی الہ آباد تشریف آوری کا نفع یہاں ایک دینی ماحول پیدا ہو جانے کو لکھا تھا۔ اسکو حضرت والا نے کقدر پسند فرمایا اسلئے کہ یہ ایک واقعی بات تھی اور حضرت سے الہ آباد والوں کو جو فائدہ حاصل ہوا تھا اسکی صحیح عکاسی تھی ورنہ حضرت اقدس کچھ تعریف پسند نہ تھے بلکہ بطور خوشامد کے اگر کوئی بجا تعریف کرتا یا مبالغہ آمیزی سے کام لیتا تھا تو اسپر سخت مواخذہ فرماتے تھے۔ یوں فرماتے تھے کہ پیر کو موٹے موٹے الفاظ بولکر راضی کرنا اور دل سے اسکو نہ مانتا یہ کیسا ہے ؟ اس سوال پر انسان کے حواس گم ہو جاتے تھے برخلاف اسکے یہاں ان صاحب کے جواب کو کقدر سراہا اور فرمایا کہ "جی ہاں دینی ماحول ہی تو چاہتا ہوں۔ اور اب اس زمانہ میں نیک لوگوں کا بغیر اسکے گزر مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ دینی ماحول پیدا فرما دے" چنانچہ جس طرح ہے ان وکیل صاحب نے دینی ماحول کو لکھا تھا اسی طرح سے حضرت اقدس کے ایک سوال کے جواب میں الہ آباد ہی کے

ایک اور مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے (جبکو اسی شمارہ کے ۴ پر ملاحظہ فرمایا جائے) ان حضرات کے بیان اور حضرت اقدس کی تصدیق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کے منتسبین خاص اور مخصوص مخلصین سب ہی اسپر متفق تھے کہ الہ آباد میں دیندار اور دیتداروں کا ایک ماحول اور مرکز جو پیدا ہوا ہے وہ صرف حضرت اقدس ہی اصلاحی مساعی کا ثمرہ تھا۔ حضرت سے قبل بھی علماء و مشائخ اور واعظین برابر ہی یہاں تشریف لاتے رہے اور لوگوں نے ان سے دینی اثر بھی قبول کیا لیکن جسے کہنا چاہیے کہ الہ آباد کو ایک دینی مرکزیت جو حاصل ہوئی وہ صرف حضرت کی برکت تھی اس میں اہل فہم کی دورائے نہیں ہے۔

زمانہ قیام الہ آباد میں شہر میں اپنے مکان کے علاوہ اطراف و جوانب کے بعض مقامات سے بھی حضرت کو خصوصی تعلق تھا۔ چنانچہ شہر کے مغربی جانب ۶۔۷ میل کے فاصلہ پر بمرولی نامی ایک موضع دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے، چودھری عزیز الرحمن صاحب مرحوم وہاں کے مشہور دیندار تھے، حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے ان کے بعد ان کے صاحبزادے چودھری حبیب الرحمن صاحب نے اپنے والد کی جگہ لی، ماشاء اللہ جو ان صاحب آدمی تھے اور ہمارے حضرتؒ سے بیعت تھے ان کا تعلق حضرت سے کچھ اتنا بڑھا کہ حضرت والا کبھی کبھی شہر کی فضا سے گھبرا کر بمرولی چودھری حبیب الرحمن صاحب کے یہاں تشریف لیجاتے تھے۔ کبھی ایک ہی دن کبھی دو چار دن اور بعض مواقع پر تو چند ماہ قیام فرمایا چنانچہ ایسے مواقع پر تو ان کا گھر شک خانقاہ بن جاتا تھا۔ جو حضرات باہر کے الہ آباد تشریف لاتے انھیں وہیں حضرت کے پاس بھیج دیا جاتا اس بستی کی ایک مسجد بالکل تجری من تحتھا الانھار کی یاد تازہ کر دیتی تھی صبح و شام کے وقت اس کے کھلے ہوئے صحن سے گنگا کی لہروں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ نہایت سکون و راحت کا مقام تھا۔ بعض حالات میں حضرت

اقدس کے لئے شہر کی مسموم فضا کا اس فضا سے تبادلہ ناگزیر ہو جاتا تھا اور صحت کے لئے مفید تر ہوتا تھا۔

اسی بستی کا واقعہ ہے کہ ایک بار مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی حضرت اقدس کے پاس تشریف لائے حضرت نے کسی مصلحت کی بنا پر چودھری حبیب الرحمان صاحب کو بلا کر فرمایا کہ چودھری صاحب! آپ کے ہم نام اعظم گڑھ سے ایک مولانا صاحب آئے ہیں آپ انکو پہچانتے ہیں؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں حضرت خوب جانتا ہوں۔ فرمایا کہ ان کے پاس جائے اور ان سے کہیے کہ (حضرت) مولانا مجھے دریافت کیا ہے کہ اخلاص کسے کہتے ہیں اور اسکا جواب مولانا حبیب الرحمان صاحب سے پوچھ کر مجھے دیجئے۔ لہذا آپ فرمادیجئے کہ میں کیا جواب دوں؟ چودھری صاحب کا بیان ہے کہ مولانا حبیب الرحمان صاحب لیٹے ہوئے تھے میرے منہ سے یہ سوال سنتے ہی یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گئے اور ذرا دیر کے لئے سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ جا کر حضرت سے کہیے کہ حضرت اخلاص اسکو کہتے ہیں کہ آدمی جسکا ہو جائے بس اسی کا ہو کر رہے۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ میں نے حضرت سے جا کر اس جواب کو نقل کر دیا تو حضرت مسکرا دیئے اور زبان سے کچھ نہیں فرمایا۔

بمرولی سے حضرت اقدس کو اسلئے بھی انس تھا کہ دریا کے کنارے مسجد کے آس پاس بہت سی پرانی قبریں تھیں اور چند قبریں ایک مقبرہ کے اندر احاطہ مسجد میں بھی تھیں ان کے متعلق چودھری صاحب کہتے تھے کہ حضرت زکریا ملتانیؒ کے کسی عزیز خاص کی قبر ہے جنھوں نے کسی راجہ سے یہاں آکر جہاد فرمایا تھا یعنی یہاں بزرگوں کے آثار پائے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

پھر موضع بمرولی سے ایک ڈیڑھ میل غربی جانب اسرولی نامی ایک بستی دریا کے کنارے ہی آباد ہے، مولوی مقبول احمد صاحب یہاں کے بڑے زمیندار شمار ہوتے ہیں اور حضرت سے بیعت بھی تھے انکی وجہ سے کبھی کبھی حضرت

اسرونی بھی تشریف لے گئے ہیں۔

اسی طرح سے شہر کے شرقی جانب دس بارہ میل کے فاصلے پر سید آباد ریلوے اسٹیشن سے تین میل شمال اتر اوں نامی ایک بڑا گاؤں ہے جہاں مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب مرحوم رہتے تھے اور حضرت والا سے بیعت تھے انھیں مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب کے ایک خویش مولانا محمد فاروق صاحب اترانوی ہیں مولانا کے ایک بڑے بھائی حافظ محمد حنیف صاحب بھی تھے یہ دونوں بھائی ہمارے حضرت سے پہلے حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے اور حضرت مولانا سراج احمد صاحب امرہوی سے مولوی فاروق صاحب نے تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ پھر حضرت الہ آبادی کے وصال کے بعد ہمارے حضرت سے دونوں کا تعلق ہو گیا۔ حافظ حنیف صاحب بہت دیندار اور نیک سیرت انسان تھے جلد ہی اس دنیا سے سفر آخرت فرما گئے مولانا فاروق صاحب کی صلاحیت و استعداد میں انکی تربیت کو بھی خاص دخل تھا اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے ان کے بعد مولانا محمد فاروق صاحب بیچارے گویا تنہا رہ گئے لیکن کچھ تو انکی سلامتی طبع اور ذاتی استعداد پھر حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آخر میں حضرت مصلح الامت کی تربیت نے اپنا پورا کام کیا کہ آہن کہ بہ پارس آشنا شد فی الحال بصورتِ طلباء شد نیز مزاج میں اسم فاروق نے بھی پورا اثر کر رکھا تھا یعنی فارق بین الحق والباطل کے کامل منظر تھے۔ طباعی اور تیزی کے ساتھ ساتھ حکیم الامت کی کتب کے فامرض مطالعہ نے محققانہ اور مناظرانہ مزاج بنا دیا تھا۔ پھر ماحول بھی مولانا کو بدعت نواز ملا اسلئے زمانہ طالب علمی ہی سے ہر مسئلہ پر بحث و مباحثہ عقلی و نقلی دلیل پیش کرنا اور دوسروں سے بھی طلب کرنا طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ بہر حال انکے اطراف میں اسی نوع کے عالم کی ضرورت بھی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سے بڑا کام لیا جسکی تفصیل کے لئے حالات مصلح الامت کے صفحات

متحمل نہیں۔ اور بقول قائل شنیدہ کے بودمانند دیدہ انکی دینی محنت اور انکی
ثمرات، ایک گاؤں کے اندر لوگوں کی دینداری۔ وضع قطع صا کمانہ۔ آبادی مسجد
اور عربی مدرسہ کا قیام۔ نیز علم دین کے طلبہ اور طالبین کی ہماہمی کا مشاہدہ آج
بھی برائی العین کیا جاسکتا ہے۔

حضرت والا سے تعلق کے بعد ہی سے عموماً اور بالخصوص حضرت اقدس
کے الہ آباد میں قیام فرمانے کے بعد سے مولانا محمد فاروق صاحب کا جذبہ اخلاص
بھی ترقی کرتا رہا اور اسی کے بقدر حضرت اقدس کے ساتھ انکا تعلق بھی بڑھتا
گیا۔ چنانچہ حضرت والا کبھی کبھی مولوی فاروق صاحب کے تعلق کے لحاظ سے
اتراؤں بھی تشریف لیجانے لگے۔ کبھی خود مولوی فاروق صاحب ہی درخواست
کرتے اور ہمراہ لوجا جاتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت اٹھتے اور مولوی عبدالمجید
صاحب کا یا کسی اور کا ہاتھ پکڑتے اور فرماتے چلو اتراؤں چلیں۔ غرض حضرت
اقدس کے اس طرح اچانک پہنچ جانے سے وہاں عید ہو جانے کا منظر مولوی صاحب
اکثر بیان فرماتے تھے۔ چونکہ یہاں کے عوام بھی مولوی صاحب کے تہ بیت یافتہ
تھے اور طلبہ تو ماشار اشد بہت ہی مہذب اور فہیم تھے اسلئے حضرت کو یہاں
بہت آرام ملتا پھر ماشار اشد ان سب پر مولوی صاحب کا حسن انتظام جسے مولوی
صاحب موصوف نے حضرت تھانویؒ کے حالات و ملفوظات اور خود اپنے حضرت
اقدس کی تربیت سے سیکھا تھا، یہ اور حضرت والا کے لئے راحت رساں
ثابت ہوتے۔ چنانچہ جانے کو تو حضرت متعدد وجہ تشریف لے گئے لیکن الہ آباد
سے باہر کہیں جانے کا مقصد یہیں حاصل ہوتا تھا۔ اسی بنا پر کبھی کبھی یہ فرمایا
کرتے تھے کہ مولوی فاروق! میں نے الہ آباد میں گھر لے لیا ہے اگر کہیں یہاں
میں رہنے کا ارادہ ہوا تو یہیں اتراؤں میں گھر بنواؤں گا۔

غرض یہاں یہاں سکون کے علاوہ طلبہ کا مجمع اور مشرع صورت انسانوں کا اجتماع
مولوی فاروق کا حسن نظم، لوگوں کا ایشارہ ان ساری چیزوں کے قیام کو موزوں راحت سا بنانا

یہی ارادوں وہ بہتی ہے جہاں حضرت حکیم الاسلام جناب قاری محمد طیب صاحب نے حضرت اقدس مصلح الامۃ سے آکر ملاقات فرمائی اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ حضرت سے یا تو بچپن کی ملاقات تھی یا اب بچپن میں ہوئی ہے اور اسی مقام کے متعلق غالباً مولوی فاروق صاحب کو حضرت قاری صاحب نے لکھا تھا کہ — اُتراؤں کا سفر الحمد للہ نہایت ہی پرسکون اور بہت سے دینی منافع کا سبب بنا اس پر میں جس قدر کبھی اُتراؤں کم ہے (او کما قال)

اس شمارہ کی تعلیمات مصلح الامرت میں آئے ہوئے ملفوظات نیز گزشتہ شمارہ کے ملفوظات زریں اسی اُتراؤں میں ارشاد فرمائے گئے ہیں چونکہ حضرت قاری محمد طیب صاحب گورکھپور کی طرف سے واپس تشریف لائے تھے اور اسی ریلوے لائن پر سید آباد (اُتراؤں کا ریلوے اسٹیشن واقع تھا اس خیال سے کبھی نیز یہاں مولانا محمد فاروق صاحب کے ذریعہ انکی رہائش اور آرام کا بھی اچھا انتظام ہو سکتا تھا پھر یہ کہ وہ حضرت والا سے ملاقات کے طالب ہو کر تشریف لارہے تھے شہر الہ آباد میں آکر مطلوب ہو جاتے ان مصاح کی بنا پر حضرت نے جائے ملاقات اُتراؤں ہی کو تجویز فرمایا۔

غرض اور تمام مقامات سے زائد حضرت اُتراؤں تشریف لے گئے اور بمبوی بھی متعدد بار گئے اس کے علاوہ حضرت نے غالباً دو بار چائل کا بھی سفر فرمایا حافظ محمد شفیع صاحب حضرت والا سے محبت کرتے تھے چائل کے باشندے تھے انھوں نے حضرت سے درخواست کی کہ حضرت ہمارا تعلق حضرت مولانا مدنیؒ سے تھا چنانچہ حضرت جب کبھی الہ آباد تشریف لاتے یا ادھر سے گزرتے تو خادم کے غریبانہ پر ضرور تشریف لاتے و عطا فرماتے دو ایک دن روح پرور دینی مجلسیں ہوتیں اور عام لوگوں کو نفع ہوتا تھا لیکن حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد یہ سلسلہ فیض و افادہ ختم ہو گیا اس لئے جی چاہتا ہے کہ حضرت کبھی چائل غریبانہ پر تشریف لیں

تو دیہات کی فضا سے افشار اللہ حضرت والا کو بھی راحت ہوگی اور ہم لوگوں کو دینی نفع حاصل کرنے کا ایک موقع ہاتھ آجائے گا اور بزرگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جواب بند ہے مسلسل ہو جائے گا۔ حضرت اقدس نے بھی (چونکہ محبت کا جواب محبت ہوتی ہے) انکی درخواست قبول فرمائی اور پھر شاید دوبارہ چائیل تشریف لے گئے جس میں سے ایک دفعہ راقم بھی ہمراہ سفر تھا اور بہت سے باہر کے مہمان اور علماء حضرات جو حضرت کے یہاں آئے ہوئے تھے وہ بھی شریک سفر تھے چنانچہ یاد پڑتا ہے کہ سوا اعظم گڑھ کے مدرسہ دارالعلوم کے ایک اعلیٰ مدرس جناب قاری ریاست علی صاحب نے وہاں جمعہ کے بعد جامع مسجد میں حضرت اقدس کے حکم سے تقریر بھی کی تھی اس لئے کہ حافظ محمد شفیع صاحب نے حضرت سے وہاں کسی کی تقریر کی خواہش ظاہر کی اور عرض کیا کہ حضرت یہاں اہل بدعت کی بھی خاصی تعداد ہے پہلے بھی ادب اب بھی یہ لوگ ہم لوگوں کے متعلق بہت پروا گنڈہ کر رہے ہیں کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے۔ بزرگوں کے منکر ہیں لہذا کوئی صاحب اگر آج جمعہ کے بعد مسجد میں کچھ تقریر فرمادیں تو عام لوگوں کو بھی کچھ دین کی باتیں سننے کا موقع مل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں سے انکی غلط فہمی دور ہو جانے کا ذریعہ ہو جائے، حضرت کی مجالس میں تو صرف خاص ہی خاص لوگ آتے ہیں۔ چنانچہ حضرت نے قاری ریاست علی صاحب سے فرمایا کہ آپ کچھ کہہ دیجئے گا۔ الحمد للہ قاری صاحب کے وعظ کا بہت ہی اچھا اثر پڑا جس کا اندازہ اس سے ہوا کہ اگلے دن مجالس میں مقامی لوگ زیادہ آئے۔ اس طرح سے حضرت والا نے اپنے بزرگوں کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری فرمائی لیکن خود الہ آباد کے مشاغل اس قدر کثیر تھے کہ اسکی وجہ سے وہاں زیادہ آنے جانے کا موقع نہ مل سکا۔ یہ چھوٹے چھوٹے اسفار تو حضرت والا کے الہ آباد سے شرقاً و غرباً

ہوئے یعنی اتر اڈوں شہر سے مشرق میں واقع تھا اور بمرولی، اسرولی شہر سے بجانب مغرب واقع تھا اسکے علاوہ حضرت شہر کے شمالاً و جنوباً بھی کبھی کبھی تشریف لیجاتے تھے جنوب سے مراد مہیوہ کا سفر ہے یہ دریا جمن کے پار لب دریا ایک چھوٹا سا موضع ہے دریا کے بالکل کنارے پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے دیکھنے والوں نے بیان کیا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جب الہ آباد تشریف لاتے تو یہاں بھی آتے تھے اور ایک آدھ شب مسجد سے باہر دریا کی جانب ایک پختہ چبوترہ تھا اس پر حضرت کا پلنگ بچھتا تھا اور حضرت آرام فرماتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ الہ آباد کے مشہور ٹھیکیدار شیخ عبداللہ صاحب مرحوم اسی بستی مہیوہ کے رہنے والے تھے ان کے صاحبزادے مولوی مسیح الدین صاحب مرحوم حضرت مولانا تھانویؒ کے شاگرد تھے جنہوں نے غالباً کانپور میں حضرت سے پڑھا تھا اسی تعلق سے حضرت یہاں تشریف لاتے تھے اور اسی نسبت کی وجہ شہر الہ آباد میں اکثر حضرت اقدس مولانا تھانویؒ نے مسجد شیخ عبداللہ مرحوم واقع ریلوے اسٹیشن الہ آباد پر ہی قیام فرمایا اور اکثر مواظ آپ کے اسی مسجد پر ہوئے یہ مسجد بھی انھیں شیخ عبداللہ صاحب مرحوم کنٹریکٹر ریلوے کی بنوائی ہوئی ہے۔ یوں حضرت تھانویؒ کا الہ آباد قیام اور وعظ عبدالہابی خان صاحب مرحوم ساکن چک الہ آباد کے یہاں بھی ہوا اسلئے کہ خان صاحب کا حضرت اقدس سے بیعت کا تعلق تھا۔ چنانچہ اس شاگردی اور اس بیعت کا اثر آج تک ان دونوں حضرات کے خاندان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے یعنی حضرت تھانویؒ سے عقیدت اور حضرت کے سلسلہ سے محبت آج بھی ان میں پائی جاتی ہے۔

پس کبھی کبھی حضرت والا از خود رکشہ پر کسی کو ہمراہ لیکر ۴-۵ میل سفر طے فرما کر مہیوہ تشریف لیجاتے تھے اور وہاں کے لوگ غایت ادب و تعظیم

و تکمیل کے ساتھ پیش آتے۔ اسی طرح سے شمال کی جانب تقریباً ۳ میل کے
 فاصلہ پر الہ آباد یونیورسٹی کے پاس محلہ کٹرہ واقع ہے جو شہر ہی کا ایک
 محلہ ہے کوئی دیہات تو نہ تھا مگر یہاں مسجد مینا شاہ کے امام جناب قاری
 حبیب احمد صاحب تلمیذ مظاہری حضرت کے دست گرفتہ تھے اس لئے حضرت
 کبھی کبھی فاصلہ جمعہ کے دن مجلس کے بعد وہاں بھی چلے جاتے قاری صاحب
 کے حجرے میں استراحت فرماتے اور نماز جمعہ کے بعد واپس تشریف لاتے
 اس مختصر سے سفر میں دیہات کا سادہ و سادہ طبع و انشراح تو نہ ہوتا تاہم مجمع سے
 الگ ہونے کی وجہ سے خلوت کی یکسوئی اور اسکا سکون ضرور حاصل ہو جاتا تھا
 اسی جگہ کا وہ واقع ہے جو ہم نے پہلے بھی کہیں عرض کیا ہے کہ ایک دن قاری
 صاحب کے حجرہ میں حضرت والا لیٹے ہوئے تھے ایک جانب قاری حبیب احمد
 صاحب بیٹھے تھے ایک جانب مولوی عبد المجید صاحب بیٹھے تھے حضرت والا
 قاری حبیب احمد صاحب کی جانب رخ کر کے باتیں فرما رہے تھے کہ اسی اثناء
 میں قاری صاحب نے حضرت اقدس کے تعجب اور تکان سفر کو محسوس کیا کہ مولوی عبد المجید
 صاحب نے کہا کہ حضرت کیلئے تو ضرورت تھی ایک کار کی جو دروازہ پر کھڑی رہتی اور
 جب اور جہاں حضرت تشریف لیجانا چاہتے اس میں بیٹھ کر تشریف لیجاتے
 آپ کے پاس کار تھی تو بہت آرام تھا اب اپنے اسکو بیچ دیا۔ بطور اپنی دلی
 خواہش کے قاری صاحب نے مولوی صاحب سے اسکا اظہار کیا مولوی صاحب
 تو اسکا کیا جواب دیتے خاموش تھے حضرت نے بھی اسکو سن لیا بس فوراً کروٹ
 عبد المجید صاحب کی طرف بدل لی اور ان سے فرمایا کہ مولوی عبد المجید! میں نے
 یہ جوتا بڑا مکان خریدا ہے وہ محض بچوں کے لئے تاکہ میرے بعد وہ یہ نہ کہیں کہ
 مجھ کو میرے باپ نے پردیس میں لا کر گھر سے بے گھر کر دیا اس لئے میں نے یہ
 مکان خریدا ہے کچھ اپنی راحت مقصود نہیں تھی کیونکہ میرے لئے تو کسی مسجد کا
 بس اتنا بڑا حجرہ کافی تھا۔ قاری صاحب کہتے تھے کہ حضرت کے منہ سے یہ جواب

سنکر میرے ہوش اڑ گئے اور میں تو پانی پانی ہو گیا اور مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ اظہار تمنا کیوں کر دیا۔

غرض اس طرح سے الہ آباد کے چاروں جانب شرقاً و غرباً اور شمالاً و جنوباً جو حضرت نے دورہ فرمایا تو شاید اس میں یہ مصلحت بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا چرچا پورے شہر اور اطراف میں عام ہو جائے اور لوگ دین اختیار کریں۔ چنانچہ بعد میں اسکے آثار بھی دیکھے جا رہے ہیں کہ اترائوں کے مولانا محمد فاروق صاحب اور وہاں کے دیندار عوام اور اسی طرح سے بمبئی کے چودھری حبیب الرحمان مرحوم جب تک زندہ رہے، اور اسرولی کے مولوی مقبول صاحب، اسی طرح اہل میوہ اور کٹرہ کے قاری حبیب احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ سب حضرات رفاقتِ قائمہ کا حق حضرت اقدسؒ کے بعد بھی اسی طرح سے انجام دے رہے ہیں جس طرح حضرت کی حیات میں دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنا تعلق نصیب فرمائے اور دین اور اہل دین کی محبت ان کے قلوب میں پیدا فرمادے۔ آمین۔

الہ آباد ہی کے زمانہ قیام میں حضرت والاؒ نے ایک سفر فتنچور ہسودہ کا بھی فرمایا۔ یوں تو حضرت اقدسؒ کے تمام ہی اسفار الہ آباد ہی سے ہوئے سفر علی گڑھ۔ سفر جوہنپور۔ سفر کوپا گنج۔ سفر وطن۔ سفر گھنوا اور اسفار بمبئی ان میں سے ہر جگہ کا سفر اپنی جگہ ایک مستقل شان رکھتا تھا اس لئے ہم نے ان سب کیلئے الگ الگ مستقل عنوان قائم کر کے وہاں کے حالات بیان کیے ہیں اور سفر فتنچور ایک مختصر سا سفر تھا جو اتفاقی طور پر پیش آگیا تھا اس لئے اسکا ذکر الگ سے نہیں کیا گیا بلکہ الہ آباد کے اطراف کے سفروں کے منجملہ شمار کر کے انھیں کے بیان کے ساتھ اسکا بیان کر دینا بھی مناسب معلوم ہوا۔

فتنچور کی مشہور ترین شخصیت اس زمانہ میں مولانا عبدالوحید صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ (فتنچور) کی تھی جو کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح

کے شاگرد رشید تھے اور حضرت حکیم الامت مولانا کھانویؒ کے طریق سے وابستہ
 اور حضرت کے بچہ معتقد تھے غالباً حضرت کھانویؒ ہی کے اس حکم سے کہ اب میں
 کام کے لائق نہیں رہا میرے خلفاء میں سے کسی سے رجوع کیجئے، مولانا عبد الوحید
 صاحب نے اپنا اصلاحی تعلق حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی سے قائم
 فرمایا لیکن حضرت مولانا کھانویؒ کے بعد مولانا الہ آبادی بھی زیادہ دنوں زندہ
 نہ رہ سکے چنانچہ مولانا کو شیخ کی ضرورت تھی لیکن ہنوز کسی کا انتخاب نہ کیا تھا
 کہ اسی اثناء میں راقم نے جو (اُن دنوں) مدرسہ اسلامیہ فتحپورؒ ہی میں مدرس تھا
 فتحپور تال نرجا (اعظم گڑھ) کا پہلا سفر کیا۔ واپسی پر جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ
 لوگ حالات اور تاثرات معلوم ہی کرتے ہیں مولانا عبد الوحید صاحب نے بھی
 حضرت مصلح الامۃ مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے حالات دریافت کئے
 راقم نے آپ بیتی اور آنکھ دکھی سنادی غالباً اسی سے مولانا عبد الوحید صاحب
 نے متاثر ہو کر حضرت والا سے مکاتبت شروع کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ اس سلسلہ
 میں مولانا عبد الوحید صاحب نے ایک دفعہ حضرتؒ سے یہ بھی دریافت کیا کہ یہاں
 فتحپور (میسورہ) میں ایک مولوی صاحب ہیں جو اپنی تقریروں میں یہ کہتے ہیں کہ
 حضرت کھانویؒ کو سیاست سے پہلے اختلاف ضرور تھا لیکن اگر آج حضرتؒ
 موجود ہوتے تو ہمیں شرکت فرماتے اور فلاں جماعت کو مناسب تصور فرماتے
 آپ بھی چونکہ حضرت کھانویؒ کے مزاج شناس رہ چکے ہیں اسلئے آپ استصواب
 کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ان مولوی صاحب کا یہ کہنا درست ہے۔ حضرت اقدسؒ نے
 فتحپور نرجا سے اسکا یہ جواب مرحمت فرمایا کہ وہ صاحب بالکل غلط کہتے ہیں حضرتؒ
 کھانویؒ کا جو مزاج اور اصول تھا اسکے پیش نظر یہ البتہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرتؒ
 اگر آج موجود ہوتے تو اپنے مسلک میں اور سخت ہو جاتے اور مسلمانوں کے لئے
 سیاست حاضرہ میں شرکت بالکل پسند نہ فرماتے۔ (مولانا صاحب موصوف
 اور حضرت اقدس کا یہ سوال و جواب روایت بالمعنی کے طور پر ہے الفاظ ہو سکتا ہے

کچھ بدل گئے ہوں لیکن مفہوم یہی تھا۔ چنانچہ مولانا کی یہ مکاہت کسی اخبار میں
میں نے خود دیکھی تھی)۔

مولانا موصوف کے اسی سوال فرمانے کی بنا پر راقم جب فتحپور ہسودہ
فتحپور تال نرجا حضرت اقدس کے پاس حاضر ہوا تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ یہ
آپ کے یہاں مولانا عبد الوحید صاحب کون ہیں؟ چنانچہ احقر نے مولانا کی تعریف
یا تعارف جو سمجھ میں آیا تفصیل سے حضرت سے عرض کیا اسکی وجہ سے حضرت کو بھی
مولانا کی جانب غائبانہ توجہ ہو گئی تھی بالآخر وہ تعلق بیعت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور
بعض حالات مولانا کے ہم حضرت والا کے قیام گورکھپور کے بیان میں لکھ چکے ہیں
کہ حضرت اقدس نے فتح الباری کے درس کے لئے اپنی علالت کے زمانہ میں
اپنا بدل مولانا ہی کو تجویز فرمایا۔ مولانا کی استعداد اور صلاحیت کے پیش نظر
حضرت اقدس نے کسی بار مولانا سے اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ مولانا
کچھ دنوں کے لئے مستقل طور سے حضرت کے یہاں قیام کریں لیکن مولانا کی
ضعیف والدہ اور پھر انکی علالت و خدمت نے مولانا کو فتحپور (ہسودہ) سے باہر
کہیں جانے کی اجازت ہی نہیں دی۔

فتحپور (ہسودہ) کا سفر حضرت اقدس کو یوں پیش آیا کہ مولانا عبد الوحید صاحب
فتحپوری کے غالباً خالہ زاد بھائی اور بہنوئی (جو اب راقم الحروف کے بھئی سمجھی
ہو گئے ہیں یعنی) جناب سید فخر الحسن صاحب حضرت اقدس سے بیعت تھے
ایک دن حضرت سے ملنے کے لئے مع اپنی اہلیہ کے تشریف لائے، حضرت کا
ادب کرتے تھے اور حضرت بھی ان سے بہت محبت کے ساتھ پیش آتے تھے
چنانچہ حضرت نے ان سے فرمایا کہ کہئے تو ہم آپ کے ساتھ فتحپور چلیں انھوں نے
عرض کیا کہ حضرت کی خدمت کی صلاحیت تو اپنے اندر پاتا نہیں تاہم حضرت کا
گھر ہے اگر تشریف لیچیں تو زہے نصیب اور اسکو میں اپنے لئے اتھائی سعادت
سمجھوں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ اپنے گھر میں بھی مشورہ کر لو اور تیار رہنا گاڑی

کے اوقات بھی معلوم کر لو اور جس وقت ہم کہیں فوراً چلے چلنا اب خدا معلوم حضرت اقدس کو کس بات کا انتظار تھا تا ہم اپنا خیال تو یہی ہے کہ ان حضرات کا مسلک تو

یہ ہوتا ہے کہ

رشتہ درگزر و نم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست
یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ دوست کی جانب سے گلے میں رسی پڑی ہوئی ہے بس جہاں
اسکی مرضی ہوتی ہے کھینچ کر لے جاتا ہے نہ اپنی رائے سے کچھ کرتے ہیں نہ اپنی
رائے سے کچھ کہتے ہیں بلکہ اشارہ غیبی جسکا دوسرا نام انشراح قلب ہے اسکے
منتظر رہتے ہیں جب انشراح پاتے ہیں تب ہی کوئی کام کرتے ہیں ورنہ ذرا سی
کھٹک بھی ہوتی ہے تو اس کام سے باز رہتے ہیں۔ چنانچہ اگلے دن صبح کی گاڑی
سے سفر کرنا طے ہوا۔ راقم السطور بھی ہمراہ تھا اور اسکے علاوہ دو ہی ایک آدمی
اور تھے۔ چونکہ حضرت نے علی الصباح اپنا فیصلہ ظاہر فرمایا اس لئے اسکا بھی موقع
نہ تھا کہ بذریعہ تاری ہی مولانا عبد الوحید صاحب کو حضرت کے تشریف بری کی اطلاع
کیجا سکے نتیجہ یہ ہوا کہ اچانک نو دس بجے دن کے وقت حضرت اقدس کا رکشا مولانا
عبد الوحید صاحب کے مکان پر موجود تھا۔ مولانا جب اندر سے نکلے تو بلا نشان
و گمان حضرت والا کو دیکھ کر محو حیرت رہ گئے جلدی سے اندر جا کر باہر کمرے میں
پلنگ اور بستر کا انتظام کر کے فوراً حضرت اقدس کو لیجا کر بٹھایا۔ ہم لوگوں سے
دریافت کیا کہ خیریت تو ہے یہ اچانک حضرت نے سفر کیسے فرمایا؟ ان سے پوری
تفصیل عرض کی گئی تب انھیں جا کر اطمینان ہوا۔ پھر اسکے بعد دیگر انتظامات
میں مشغول ہو گئے۔ ہمراہ جانے والے مہمانوں کے لئے جائے قیام تجویز کیا۔
اور فوراً عمائدین شہر کو حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع دی چنانچہ خبر پاتے
ہی لوگ زیارت و ملاقات کے لئے حاضر ہونے لگے بعد ظہر مدرسہ اسلامیہ کی مسجد
میں مجلس کا اعلان ہوا لوگ وہاں بھی حاضر ہوئے۔ چنانچہ پہلی مجلس مدرسہ ہی کی مسجد
میں ہوئی۔ (مدرسہ کی سیرٹیفکٹ چڑھتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ اب مجھے یاد آیا اسجگہ میں حضرت تھانویؒ کے ہمراہ ایجا رہا تھا)

خیال تھا کہ حضرت کے لئے اور آنے جانے والوں کے لئے مدرسہ ہی میں قیام مناسب رہیگا لیکن حضرت والا نے کسی وجہ سے وہاں کا قیام پسند نہیں کیا بلکہ مولانا عبد الوحید صاحب کے مکان کی بیٹھک اور باہری مختصر سے صحن میں آرام فرمایا۔ صبح کو یہیں مجلس کا بھی انتظام ہوا اور اسکے بعد تقریباً سارے دن ہی آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ بہت سے لوگ بیعت ہوئے بہت سے زیارت سے مستفید ہوئے۔ ایک صاحب جو غالباً پوسٹ ماسٹر تھے دمہ کے مریض تھے وہ تو حضرت کو پا کر اتنا خوش ہوئے کہ ہر وقت بیٹھے ہی رہتے تھے حضرت والا نے بھی انکی قدر فرمائی اور اجازت دیدی کہ جب تک آپ کا جی چاہے بیٹھے رہیں آپ ہی لوگوں کی خدمت کے لئے تو آیا ہوں۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ مولوی عبد الوحید صاحب! حضرت کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بھیجا ہے ہم مریض آدمی کسی قابل نہیں رہ گئے، یہ خدا کا انتہائی کرم ہوا کہ میاں کو یہاں بھیج دیا۔ یہ صاحب حضرت سے بیعت بھی ہوئے اپنے بچوں کے لئے متعدد تقویذ بھی حضرت سے لکھوائے چنانچہ انکی اس وارفستگی اور محبت کا راز بعد میں معلوم ہوا اس طور پر کہ حضرت کی واپسی کے چند ہی ایام یا ماہ کے بعد انکا انتقال ہو گیا اس سے پتہ چلا کہ جس کا حصہ جس کے یہاں مقدر ہو چکا ہوتا ہے کس کس طرح اللہ تعالیٰ اسکو حصہ مقدور پہنچاتے ہیں۔ غرض اسی دن یا دوسرے دن صبح کو حضرت کی واپسی ہو گئی اور فتحپور کے قصبات و دیہات میں حضرت کے تشریف لانے کی اطلاع اسوقت پہنچی جس دن حضرت وہاں سے روانہ ہو رہے تھے ورنہ جنگنی، مسی، عالم گنج اور نواہ سے خلق کثیر زیارت کے لئے آجاتی اسلئے کہ وہاں کے لوگ پہلے سے مولانا سید ظہور الاسلام صاحب سے وابستہ تھے اور الہ آباد آجانے پر حضرت والا سے بھی غائبانہ واقف تھے۔ اور اللہ والے متعلق باخلاق اللہ تو ہوتے ہی ہیں تو جس طرح سے حق تعالیٰ کا معاملہ ہے کہ جب کوئی بزرگ عالم میں مشہور ہوا اور جہاں اسکا کام پھیلا بس اسکو اپنے پاس

بلا لیتے ہیں یہی حال ان حضرات کا بھی دیکھا جاتا ہے کہ شہرت سے اس قدر بھاگتے ہیں اور اس کے فتنے سے مفتون ہونے سے اتنا بچتے ہیں کہ جہاں انکی شہرت ہوئی اور لوگ رجوع ہوئے بس اس بستی ہی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ بہر حال فقیہوں کا یہ مختصر سا سفر اپنے کوائف اور لطائف کی رو سے بہت خوب رہا فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

بھائی فخر احسن صاحب جنکے ہمراہ حضرت فقیہ تشریف لے گئے تھے کہتے تھے کہ میں بسلسلہ ملازمت کا پنور میں تھا وہاں ایک جگہ موقع سے پلاٹ فروخت ہو رہا تھا تو میں نے خیال کیا کہ ایک پلاٹ میں بھلی لے لوں اور یہیں مکان بنوا کر رہوں اسکے لئے میں نے حضرت کو لکھا مگر کسی وجہ سے وہاں زمین لے سکا۔ غیر بات آئی گئی ہو گئی، اسکے بعد جب حضرت فقیہ تشریف لائے تو حضرت کو میرا وہ لکھنا یاد تھا مجھے بلایا اور فرمایا کہ تم سے کہتا ہوں کہ تم مکان یہیں فقیہ میں بنوانا۔ میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ حضرت کیوں فرما رہے ہیں اس وقت تو حضرت سے عرض کر دیا کہ بہت اچھا لیکن برابر متر درہا کہ فقیہ میں وہ بھلی کسی موزوں محلہ میں بھلا مکان یا زمین مجھے کیونکر مل سکے گی اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کا مشورہ حقیقت بن کر سامنے آگیا اور مولانا عبدالوحید صاحب کے مکان سے تقریباً بالکل متصل ایک بہت بڑی زمین جس پر کچھ کھنڈرات رہ گئے تھے فروخت ہونے لگی اللہ تعالیٰ نے باوجود بے سروسامانی کے ہمت دیدی اور میں نے حضرت سے کہے ہوئے وعدہ کے بموجب اسکو خریدنے کا عزم کر لیا پھر کچھ نہ بچے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح غیب سے رقم کی فراہمی کا انتظام فرما دیا۔ چنانچہ الحمد للہ اب نشن کے بعد یہاں بڑے سکون اور راحت کی زندگی اپنے عزیزوں میں دیندا نہ ماحول میں گزار رہا ہوں اور اب جا کر حضرت کی وہ بات سمجھ میں آئی کہ نہیں جی تم یہیں فقیہ میں مکان بنوانا۔ اس طرح سے ایک نیک اور مفید مشورہ عطا فرما کر حضرت والا نے انکی محبت کا نقد صلہ انکو مرحمت فرما دیا۔

الہ آباد کے علماء اور مشائخ اور حضرت مصلح الامۃ

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت اقدسؒ نے علاج کے سلسلے میں
الہ آباد کو لکھنؤ پر کیوں ترجیح دی حالانکہ یہاں صرف دو ہی طبیب مشہور تھے ایک
مولانا حکیم سید فخر الدین صاحب جعفری اور دوسرے حکیم عثمانی صاحب بانی جامعہ
طبیہ الہ آباد اور لکھنؤ تو ماشارائے طبیبوں کا دیس ہی تھا۔ چنانچہ جس طرح یہاں
اطباء یونانی کی قلت تھی اسی طرح سے طبیب روحانی بھی یہاں شاذ و نادر ہی
رہ گئے تھے اور جو تھے بھی تو بہت ہی زیادہ گننام اور گوشہ خمول میں زندگی بسر کر رہے
تھے۔ اور دیگر سلاسل کا حال تو معلوم نہیں خاص اپنے سلسلہ چشتہ صابریہ
کے لوگوں میں سے یہی دو تین حضرات کا چرچا تھا۔ ایک تو یہی ہمارے
حکیم مولانا شاہ سید فخر الدین احمد جعفریؒ تھے کہ انکے یہاں سلسلہ ربیت اور
تعلیم و تربیت باطنی ذکر و اشغال کا کچھ معمول تھا لیکن خود حکیم صاحب کی زیادہ
شہرت طب میں تھی شیخ طریقت کے اعتبار سے چند ہی حضرات تھے جو
دست گرفتہ تھے اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگوں کو باوجود
حضرت حکیم صاحب موصوف سے بہت قرب تھا کہ انھیں کے قائم کردہ مدرسہ
عالیہ مصباح العلوم سے والد صاحب نے فاضل و کامل کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن
ہم کو حضرت حکیم صاحب کا یہ حال نہ معلوم ہو سکا تھا کہ حکیم صاحب نے اپنے
پیر و مرشد حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ
صاحب مہاجر مکیؒ قدس سرہ کے وصال کے بعد ہمارے حضرت مولانا رشید احمد
صاحب گنگوہیؒ سے رجوع فرمانا چاہا تھا (جبکی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں)
اس لحاظ سے تو حضرت حکیم صاحب بالکل اپنے ہی سلسلہ اور مسلک کے

تھے مگر افسوس ہم اس سے انہی زندگی میں نہ واقف ہو سکے۔ غرض ایک آپکی ذات تھی جو یہاں کچھ فیض پاشی فرما رہی تھی۔

دوسرے آپ کے شیخ و مرشد حضرت مولانا شاہ محمد حسین صاحب الہ آبادی کا گھرانا تھا جو حضرت الہ آبادیؒ کا اثر لے ہوئے تھا اور اپنے مخصوص طرز پر دین کا کام کرتے ہوئے ایک زمانہ تک الہ آباد کا دینی مرکز شمار کیا جاتا تھا حضرت مولانا الہ آبادی کے صاحبزادے مولانا شاہ ولایت حسین صاحب ہی سے تصدیق و رویت ہلال کر کے کلکٹر عید و بقر عید کی تعطیل کا اعلان کرتا تھا عید گاہ کی امامت بھی آپ ہی سے متعلق تھی اور آپ کے بعد آج بھی یہ امور یعنی رویت ہلال کی تصدیق اور امامت عید گاہ وغیرہ حضرت مولانا الہ آبادیؒ کے بنیرہ کلاں حضرت مولانا محمد میاں صاحب فاروقی الہ آبادی سے متعلق ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا الہ آبادی چونکہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی اسلئے ان کے صاحبزادے یعنی مولانا ولایت حسین صاحب نے اپنے صاحبزادے یعنی مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ کو برائے تعلیم و تربیت کچھ دنوں کے لئے تھانہ بھون بھی بھیجا تھا۔ ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ سے ابتدائی ملاقات مولانا محمد میاں صاحب کی یہیں تھانہ بھون ہی میں ہوئی تھی اسی انس و تعلق کا وہ اثر تھا جو آپ آئندہ سطور میں مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ کے تعلقات کے سلسلے میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ حضرت اقدسؒ سے کقدر عقیدت و محبت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

ان دو بگھوں کے علاوہ ایک تیسری جگہ اور بھی تھی جسے سلسلہ ریشتیہ صابریہ سے خاص شرف تعلق حاصل تھا اور وہ تھی شیخ اکبر ثانی حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہ کی خانقاہ اور حضرت کی اولاد و احفاد کا سلسلہ جنکی خدمات حضرت شیخ قدس سرہ کے بعد سے لیکر آج تک الحمد للہ دائرہ شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہ خالی نہیں رہا۔ چنانچہ حضرت اقدس شیخ محب اللہ

الہ آبادی کے آٹھویں وائسٹین حضرت مولانا حکیم شاہ نعمت اللہ صاحب ہوئے آپ کے حالات میں لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم مختلف حضرات سے حاصل کی کچھ دنوں کانپور میں بھی تعلیم حاصل کی پھر فرنگی محل تشریف لے لئے اور فرنگی محل میں مولانا عین القضاۃ صاحب مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی۔ مولانا عبد الباقی صاحب فرنگی محل سے کچھ کتابیں پڑھیں پھر وہاں سے مدرسہ عبدالرب ملی تشریف لے گئے اور وہاں مولانا عبدالعلی صاحب سے اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری سے تفسیر و حدیث پڑھی نیز وہیں حکیم عبد المجید خان صاحب سے طب کی سند بھی حاصل کی اور پھر اپنے وطن الہ آباد ہی واپس آ گئے۔ آپ کو اپنے والد ماجد سے فرقہ و خلافت ملی جو حضرت شیخ کی اولاد ہی میں سے تھے۔ آپ کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اپنے برادر معظم شاہ رحمت اللہ صاحب کے صاحبزادے حافظ شاہ عبید اللہ صاحب مدظلہ العالی کی تعلیم و تربیت میں کوشاں رہے اور اپنے سفر حج میں روانگی سے پہلے انکو سجادگی عطا فرمائی جو بعد اللہ اس وقت موجود ہیں۔ بڑے زندہ دل، متواضع اور خوش مزاج انسان ہیں۔ ہمارے حضرت مصلح الامۃ کی خدمت میں بھی نیاز مندانہ حاضری دیتے تھے حضرت والا بھی ان سے بید محبت فرماتے تھے اور ہمارے حضرت کا تو یہ خاص مزاج ہی تھا کہ مشائخ کی محبت و ادب سے قلب معمور تھا اس لئے جیسا کہ مشہور ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ کی گلی کے کتے سے بھی محبت تھی ہمارے حضرت کو اپنے سلسلہ کے بزرگوں سے خصوصی طور سے ایسی محبت اور شفقت تھی کہ اس دیار کا کوئی ادنیٰ سا انسان بھی تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے گویا کہ وہ شیخ کا فرستادہ ہو۔ چنانچہ الہ آباد میں ہمارے ایک دوست اور حضرت کے خداموں میں سے ایک صاحب ہیں جن کا نام اشرف علی ہے وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن حضرت والا تنہا اپنے حجرہ میں چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے میں حاضر ہوا اجازت لیکر سامنے فرش پر کچھ فاصلے سے بیٹھ گیا اتنے میں حضرت والا بھی پلنگ سے نیچے اتر کر اسی فرش پر

بیٹھ گئے میں نے ہر چند عرض کیا کہ حضرت آپ اوپر ہی تشریف رکھیں لیکن حضرت نے نہ مانا کچھ دیر کے بعد فرمایا کہ تم ہمارے شیخ کے ہمنام ہونا اسوقت اسی تصور کا غلبہ ہوا جسکی وجہ سے میں اوپر بیٹھنے پر قادر ہی نہ ہو سکا بھائی اشرف علی کہتے تھے کہ میں مارے شرم کے گڑا جاتا تھا لیکن حضرت نے اپنے اس ارشاد میں ایک ایسا ادب تعلیم فرمایا کہ انشاء اللہ عمر بھر بھولنے والا نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس سلسلہ صابریہ کی خصوصیت ہی ہے اور اسکا طغرائے امتیاز ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ صابر کلیریؒ کا واقعہ مشہور ہی ہے کہ بارہ برس مراقبہ میں مدہوش رہے لیکن پانچوں وقت جب اذان ہوتی آنکھ کھول دیتے اسی زمانہ میں انکے پیرومرشد حضرت فرید گنج شکرؒ نے ایک ڈوم خیریت حال طلب کرنے کے لئے بھیجا تو اس سے صرف اتنا پوچھا کہ ”پیرا چھ ہیں؟“ اور خود گولہ بال کر بدون نمک کے توش فرماتے تھے اسدن خادم سے فرمایا پیر کا ڈوم آیا ہے آج گولہ میں نمک ڈال دینا۔ اسکے بعد وہ حضرت نظام الدین اولیاء کے یہاں بھی گیا وہاں شاہی ٹھاٹھ تھا اسی کے مطابق اسکی خاطر اور استقبال ہوا چلتے وقت انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔ اس نے حضرت فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں آکر دونوں جگہوں کا حال بیان کیا اور کہا کہ حضرت نظام الدین تو بہت اخلاق سے ملے لیکن صابر کلیری صاحب بہت خشک معلوم ہوتے ہیں وہ مجھے تو کیا پوچھتے آپ کو بھی نہیں پوچھا۔ شیخ نے فرمایا کہ آخر زبان سے کچھ کہا بھی یا نہیں کہا ہاں بس یہ کہا کہ ”پیر کیسے ہیں؟“ اس پر حضرت فرید کو وجد آگیا اور فرمایا کہ جس مقام فنا میں وہ ہیں یہ انکا غایت کرم ہے کہ میں انکو یاد ہوں انکا اتنا پوچھ لینا ہی بہت ہے اور تمہارے لئے کھانے میں نمک ملائے کو جو کہا تھا یہ انکی طرف سے انتہائی خاطر تھی۔

غرض اس سلسلہ الذہب کا خاص تحفہ ادب تھا جس سے اللہ تعالیٰ

نے ہمارے حضرت مصلح الامۃ کو بھی نوازا تھا۔ چنانچہ شاہ عبید اللہ صاحب
تو شیخ کی اولاد ہی میں سے تھے اسلئے حضرت ان سے بھی بہت محبت
فرماتے تھے جس طرح کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ کی اولاد ہونے کی حیثیت
سے مولانا محمد میاں صاحب فاروقی مدظلہ کو بہت مانتے تھے۔

غرض ان ہی تین مقامات سے سلسلہ صابریہ کی کچھ جھلک ملتی تھی۔
لیکن حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ نیز حضرت مولانا نعمت اللہ شاہ
صاحبؒ اور مولانا حکیم سید فخر الدین احمد صاحب جعفریؒ کے وصال کے
بعد الہ آباد تقریباً اس سلسلہ سے خالی ہو رہا تھا چنانچہ ایک موقع پر جبکہ
حضرت مصلح الامۃ الہ آباد کے لوگوں سے ناراض ہو کر اہل فقیہور (تال نرجا)
کی درخواست پر وطن تشریف لے گئے تو شہر الہ آباد سے بھی بہت سے حضرات
ہمراہ سفر تھے اور فقیہور آتے جاتے رہے۔ اسی سلسلہ میں یکبار حضرت شاہ
عبید اللہ صاحب محب الہی بھی تشریف لے گئے وہاں الہ آباد کے اور
بہت سے حضرات تھے۔ شاکر خان صاحب، وکیل انعام الحق صاحب بھی تھے
کسی نے شاہ عبید اللہ صاحب سے یہ کہا کہ حضرت الہ آباد سے ناراض ہو کر
تشریف لائے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اب الہ آباد واپس نہ جائیں کچھ
اس سلسلہ میں آپ حضرت سے کہیے شاہ عبید اللہ صاحب مدظلہ کا خود بیان
ہے فرمایا کہ

”مجھے جب اس بات کا علم ہوا تو میں حضرت کی خدمت میں حاضر
ہوا اور عرض کیا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے کچھ کہنا ہے حضرت نے
فوراً لوگوں کو ہٹا دیا اور خلوت کر دی میں نے عرض کیا کہ اب
اس زمانہ میں سلسلہ چشتہ صابریہ کی حضرت ہی تو جان تھے۔ مولانا
محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ۔ مولانا شاہ نعمت اللہ صاحب محب الہیؒ
اور مولانا حکیم شاہ فخر الدین صاحب جعفریؒ تک کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا

اور ہم لوگ تو ابھی صاحبزادے ٹھہرے، اس لئے آپ جب الہ آباد تشریف لائے تو بڑی تسلی ہو گئی تھی کہ اگر کہیں گاڑی اٹھے گی تو حضرت سنبھال لیں گے اب سنا ہے کہ حضرت تشریف نہیں لیجائیں گے، یہ سنکر بڑا رنج اور قلق ہے۔

شاہ عبید اللہ صاحب مدظلہ فرماتے تھے کہ میری زبان سے یہ الفاظ سن کر حضرت نے میرے مونڈھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ نہیں میں الہ آباد کو نہیں چھوڑوں گا۔ الہ آباد کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے لوگوں سے آکر کہا کہ آپ لوگ اطمینان رکھیں حضرت الہ آباد واپس تشریف لیجلیں گے۔

اسی طرح سے ایک موقع پر حضرت اقدسؒ نے مولانا محمد میاں صاحب فاروقی سے دریافت فرمایا کہ :-

”آپ نے تو حضرت مولانا تھانویؒ کو بھی دیکھا ہے اور وہاں جو کام ہوتا تھا وہ بھی آپ کے پیش نظر ہو گا اس لئے آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہاں مجھ سے بھی اس نوع کا کچھ کام ہو جائے گا؟ مولانا محمد میاں نے عرض کیا کہ :-

”حضرت یوں جانے کو تو میں تھا نہ بھون بھی گیا اور حضرت تھانویؒ کا زمانہ بھی پایا لیکن اپنی بد نصیبی کی وجہ سے محروم ہی رہا اور حضرت کے وصال کے بعد تو یہ سمجھ لیا تھا کہ اب کیا کوئی ایسا شفیق مصلح ملے گا لیکن اللہ تعالیٰ کا کچھ ایسا فضل ہوا کہ حضرت (الہ آباد تشریف لائے اور حضرت) سے تعلق ہو گیا اور اصلاح و سکونِ قلب کا کامل ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ حضرت والا کی شفقت کچھ اس درجہ اپنے اوپر بڑھی دیکھی کہ اب اپنی اصلاح کی امید ہونے لگی ورنہ تو تھا نہ بھون جا کر بھی یہ نالائق محروم ہی رہا۔

باقی حضرت نے جو یہ دریافت فرمایا ہے کہ مجھ سے طریق کا بھی کچھ نفع لوگوں کو پہنچے گا یا نہیں اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ آئندہ حضرت کے فیوض و برکات کا سلسلہ کتنا وسیع ہو گا یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن ہم تو ان دو چار سالوں میں دیکھ رہے ہیں کہ ایسے ایسے لوگوں کو ہدایت ہوئی ہے جنکو دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہی الہ آباد میں دیکھ رہا ہوں، یہی علی گڑھ کے بارے میں سنا اور یہی بمبئی میں دیکھا مجھے علی گڑھ کا حال پہلے کا بھی معلوم ہے، اور حضرت والا کے تشریف لیجانے کے بعد سے انگریزی دانوں اور ان لوگوں میں جنھیں آزاد خیال سمجھا جاتا تھا دین کی جانب بہت زیادہ نمایاں میلان پیدا ہو گیا۔ بمبئی خود میرا آنا جانا برابر ہوتا ہے میں جانتا ہوں کہ بعض میرے احباب جو بہت زیادہ آزاد تھے انکو نماز باجماعت اور تلاوت کا شوق پیدا ہوا اور الہ آباد تو میرا وطن ہی ہے میں یہاں کی فضا سے اور یہاں کے حالات سے بخوبی واقف ہوں لوگوں کی طبیعتوں کا پہلا رنگ بھی میرے سامنے ہے اور حضرت کی تشریف آوری کے بعد سے جو رنگ بدلا ہے وہ بھی میرے سامنے ہے۔ چنانچہ میں تو حضرت کے فیض کو روز افزوں ہی دیکھ رہا ہوں اور یہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں حضرت کے باطن کا اور روحانیت کا فیض پہنچ رہا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

ان دونوں حضرات (یعنی محمد میاں صاحب فاروقی اور شاہ عبید اللہ صاحب محب اللہی) کا بیان پیش کرنے سے مقصود یہ تھا کہ حضرت والا نے اپنے قیام الہ آباد کو جو تجویز فرمایا آپس حضرت کس قدر مصیب تھے کہ یہاں کے خواص بھی محسوس کر رہے تھے کہ اب الہ آباد کسی چشتی صابری شیخ سے خالی ہے اور عام لوگوں میں طریق کی پیاس موجود ہے اللہ تعالیٰ نے اسی لئے حضرت والا کے قلب میں ڈالا کہ الہ آباد قیام فرمائیں۔ چنانچہ الحمد للہ صرف حضرت اقدس

تشریف لے آنے کے بعد یہ جگہ دین و شریعت اور سلوک و تصوف کا ایک مرکز بن گئی اور خود اہل الہ آباد کو حضرت سے بہت نفع ہوا۔

(بعض خواص اہل الہ آباد کے حالات)

ان تمام حضرات کا ذکر کرنا جنکو حضرت اقدس سے فیض پہنچا بہت مشکل ہے اور شاید حالات مصلح الامت کے طالب کے لئے تطویل کا باعث بھی ہو اس لئے بطور نمونہ میں پہلے چند علماء پھر اہل علم و دانش اور پھر چند ارباب محبت اور خدام کا ذکر کرتا ہوں

(۱) مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہرئی: جہاں تک میرا خیال ہے الہ آباد کے علماء میں حضرت اقدس سے استفادہ و قرب کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ مرتبہ پر جناب والد ماجد مولانا سراج الحق صاحب ہی کا نام پیش کیا جاسکتا ہے۔ آپ درس نظامیہ کے فارغ التحصیل عالم تونہ تھے بلکہ الہ آباد ہی کے کامل و فاضل وغیرہ فارسی میں اور پرائیویٹ ایف۔ اے کا امتحان انگریزی میں پاس کیا تھا لیکن حضرت مولانا تھانویؒ سے تعلق کے بعد سے حضرت کی کتابوں کے مطالعہ کا نیز حدیث و تفسیر کی کتابوں کا بھی دیکھنے کا شوق ہوا، استعداد علمی، اشار الہیہ جیسے تھی چنانچہ جلالین شریف، بیضاوی شریف، تفسیر ابن کثیر اور روح المعانی وغیرہ تفسیریں اور فتح الباری، بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف، مرقات وغیرہ حدیث میں اور ہدایہ نعتہ میں بلا تکلف سمجھ لیتے تھے۔ حضرت تھانویؒ کی کتابوں کا مطالعہ اردو ہی میں کر لینے والا نصرت عالم ہو جاتا ہے پھر والد صاحب تو عربی داں بھی تھے اور اُس زمانہ کے عالم و فاضل پاس تھے جبکہ نقل بازی کا رواج نہیں تھا اسی لیاقت کی وجہ سے گورنمنٹ کالج الہ آباد میں فارسی عربی کے مدرس ہو گئے یہاں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کے فیض صحبت سے دین اور تصوف کا

رنگ اور زیادہ ہو گیا۔

حضرت الہ آبادیؒ کے بعد ہمارے حضرت مصلح الامۃؒ سے تعلق پیدا ہوا۔
حضرت توالہل علم کے قدر داں تھے ہی اہل الہ آباد میں سے والد صاحبؒ کو نہایت
قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اپنی نظر توجہ فرماتے رہے۔ حضرت کے مضامین
مجلس جیسے کچھ دقیق ہوتے تھے جاننے والوں پر مخفی نہیں والد صاحبؒ کو ان مضامین
پر وجد آ جاتا تھا اور بہت داد دیتے تھے جس سے حضرت کو بہت مسرت ہوتی تھی۔

علم ادب اچھا تھا اسلئے حضرت والا کسی عربی یا فارسی کتاب کے بعض حصے کا
ترجمہ کرنے کا بھی حکم فرماتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! مبین
اور قمر الزماں کو بھی کوئی کتاب ادب کی پڑھا دیجئے! اس کے ساتھ ہی ساتھ

والد صاحبؒ کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا لیکن ذہن بچپن ہی سے چونکہ
اہل تشیع کی تردید کا خوگر تھا اسلئے اسی قسم کی کتابیں لکھیں مثلاً تحفہ رکر بلا سیرت
زمین العابدین۔ اہلبیت والہدنت۔ وفات سرور کائنات۔ اور اصلاح مسلمین
کے لئے فلاح و ترقی کے اصول تیز مسائل حاضرہ میں خلافت و ملکیت کی حقیقت
تصنیف کیں اور مسلمانوں کو سنت سے قریب کرنے کے لئے معمولات نبویؐ بھی

جو بہت مقبول ہوئی اور مناجات مقبول کریم میں جو اضافات ہیں وہ بھی جناب

والد صاحبؒ کے ذہن کی پیداوار ہیں ان اضافات نے اسکو بہت زیادہ مقبول کر دیا ہے چنانچہ مناجات مقبول کریم کے علاوہ وہ کہیں اور ملتے بھی نہیں۔
جو حضرات مجلس حضرت والا میں شریک ہوتے تھے وہ جانتے ہیں کہ

حضرت والا مولانا موصوف کو اپنے قریب ہی بلا کر بٹھاتے تھے اور کبھی کبھی صاحبؒ کے
مجلس آپ ہی سے مخاطب ہوتے۔ والد صاحبؒ مرحوم حضرت والا کے الہ آباد کے قریب
تشریف لانے کے قبل کسی کسی مسجد میں قرآن شریف کا ترجمہ سنایا کرتے تھے

لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو ہر ایک سے مناسبت نہیں ہوتی اس لئے
اسکی سب باتیں پسند نہیں ہوتیں چنانچہ بعض حضرات والد صاحبؒ سے خوش

اور جب حضرت تشریف لائے اور وہ سب حضرات بھی حضرت کی مجلس میں آئے تو دیکھا کہ مولوی سراج صاحب کا یہاں بھی خاص مقام ہے لیکن حضرت کے طور و طریقے سے ناواقفیت کی بنا پر جب ایک روز یہ منظر دیکھا کہ حضرت والا بہت خفا ہیں اور مولوی سراج صاحب کے سر کے اوپر اپنا ہاتھ مار رہے ہیں تو مجلس سے باہر آنے کے بعد اس قسم کے لوگوں نے باہم کہا کہ دیکھو ہم لوگ مولوی سراج صاحب کو جیسا سمجھتے تھے حضرت نے بھی آج اپنے عمل سے اسکی تائید فرمادی دیکھو نا آج کتنا پٹے ہیں (اگر ان میں خرابی نہ ہوتی تو انکی یہ پٹائی کیوں ہوتی)۔

خدا جانے انکی یہ بات حضرت والا کے کانوں تک کیسے پہنچ گئی، فرمایا انا اللہ وانا الیہ راجعون ان جاہلوں کے سامنے تو کچھ بات کرنا مشکل ہے دیکھو تو میں لوگوں کی عام بد حالی پر خفا ہو رہا تھا اور مولوی سراج صاحب سامنے بیٹھے ہوئے تھے اس سے انھیں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ رہا تھا اور اس شخص نے اس سے کیا نتیجہ نکالا۔ خیر وہ دن تو گزر گیا اب دیکھئے حضرت والا نے اپنی خدا داد بصیرت سے ان کے خیالات فاسد کو کس طرح سے زائل فرما دیا کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا اور ان کا پورا علاج فرما دیا۔

ہوایہ کہ دوسرے دن جب لوگ مجلس میں آئے تو حضرت والا اپنی جگہ سے مجلس میں ذرا دیر سے تشریف لائے اور آئے بھی تو جلال میں بھرے ہوئے آتے ہی فرمایا کہ اب میں یہ نہ کرنگا کہوز آکر ٹخ ٹخ کروں اور آپ لوگ ٹس سے مس نہ ہوں میں مجلس ہی بند کر دوں گا جب تک یہ جان نہ لوں کہ کون مخلص ہے اور اخلاص کیسا تھا آتا، کون لوگ ہمارا تماشا بنانے کے لئے آتے ہیں اور سب حاضرین سے فرمایا کہ آپ لوگ نیچے کے کمرے میں چلے اور ایک ایک شخص آکر مجھ کو اطمینان دلائے کہ وہ اخلاص سے کام کرنے کے لئے آتا ہے اور والد صاحب سے فرمایا کہ مولوی سراج صاحب آپ سب کو لیکر جائیے پہلے لوگ آپ کو مطمئن کریں اور آپ جب ان سے مطمئن ہو جائیے تو انکو لیکر میرے پاس آئیے۔

اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ان لوگوں جنہوں نے کل کچھ اور کہا تھا آج کیا گذر گئی ہوگی اس طرح سے حضرتؑ نے سب پر یہ ثابت کر دیا کہ یہ معتبوب نہیں ہمارے محبوب ہیں۔ آپ کے شہر کے عالم دین ہیں، انہیں حضرات سے تو مجھے کام لینا ہے جب یہی آپ کی نظروں میں معیوب ہونگے تو کام کیسے چلے گا؟ چنانچہ سب وعدہ کیا بالآخر والد صاحبؑ کی سفارش سے سب کی رسائی مجلس حضرت والا میں ہوئی۔

راقم عرض کرتا ہے کہ یہی وہ انداز اصلاح تھے حضرت مصلح الامتؑ کے دل جس کے لئے ترستا ہے اور اکوئی نظر نہیں آتا۔

بے تیر و بے کماں کے جو دل شکار کر لے

ہم تو جلیل ایسے قاتل کو ڈھونڈھتے ہیں

یوں والد صاحبؑ کو حضرت والا کی طرف سے اجازت تھی لیکن والد صاحبؑ کے مزاج میں تو واضع و انکار حد درجہ تھی جس کے سبب چند ہی لوگوں کو اسکا علم ہوسکا حضرت اقدسؑ کی حیات مبارک میں تو کسی کی کیا مجال تھی جو اپنے اس منصب کا کسی سے ذکر کرتا بعد میں بھی والد صاحبؑ کا مذاق طبع اس قسم کی باتوں میں اخفار ہی کا تھا۔ بہر حال بمبئی میں بھی کسی دفعہ حضرت کی خدمت میں حاضری دی۔ سفر حج کے وقت بھی موجود رہے بلکہ حضرتؑ کے ایما سے معیت سفر کی تیاری میں لگ گئے روزانہ حج کمیٹی کا چکر لگاتے اور مایوس ہو کر واپس آجاتے کہ درخواست کی منظوری کی کوئی شکل نہیں نکل رہی ہے بالآخر ہم لوگوں کو پانی کے جہاز سے رخصت کر کے خود ہوائی جہاز سے سفر کا ارادہ کر لیا لیکن افسوس کہ مدینہ منورہ میں ہم سب سے تو ملاقات ہوئی مگر حضرت اقدسؑ تو جدہ ہی میں ہم سب سے جدا ہو چکے تھے۔

حضرت والد صاحبؑ بھی ان چند حضرات میں سے تھے جن سے حضرت والا اپنے گھر کے لوگوں کے متعلق مشورہ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ والد صاحبؑ فرماتے تھے کہ حضرتؑ نے قاری مبین صاحب مدظلہ کے سلسلہ میں میری رائے معلوم فرمانا چاہی اور اپنے خیال کا

اظهار فرمایا میں نے حضرت کی تائید کی جس سے حضرت خوش ہوئے چنانچہ حضرت قاری صاحب مدظلہ سے فرماتے تھے کہ آپ کو حضرت والا نے اپنی جگہ بٹھایا ہے اسلئے آپ کو بلا خوف و ہراس کام کرنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے شامل حال ہوگی چنانچہ جب تک زندہ رہے برابر مجلس میں شرکت فرماتے رہے۔ مدرسہ میں بعض اسباق کے درس دیئے اور ہر طرح قاری صاحب مدظلہ کے رفیق و معین بنے رہے درمیان کے چند ماہ فقیہ مسودہ کے مدرسہ اسلامیہ میں گزارے بالآخر پھر الہ آباد آگئے اور ۲۲ جون ۱۹۰۷ء کو اس عالم فانی سے عالم جاوداتی کو رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مولوی عبدالقدوس رومی سلمہ : راقم الحروف کے چھوٹے بھائی ہیں اور آپیں شک نہیں کہ الہ آباد سے فتحپور تال نہ جا جانے والوں میں سبقت انھیں کو حاصل ہوئی انھوں نے اپنا حال کسی موقع پر خود ہی لکھا ہے جو پہلے بھی کسی جگہ آچکا ہے تاہم یہ موقع اس کے لئے زیادہ موزوں تھا اسلئے مکرر عرض ہے وہ لکھتے ہیں کہ :-

” حضرت مصلح الائمۃ کی زیارت پہلی بار مسجد خواص لکھنؤ میں ہوئی تھی جبکہ حضرت حکیم الائمۃ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے حضرت کی عبادت کیلئے حضرت مصلح الائمۃ بھی لکھنؤ تشریف لائے تھے جبکی اطلاع خط کے ذریعہ مجھ کو بھی ہو چکی تھی میں اندنوں سہارن پور میں زیر تعلیم تھا چنانچہ وہاں سے الہ آباد جاتے ہوئے لکھنؤ آکر گیا بعد مغرب مسجد خواص پہونچا رات اندھیر شروع ہو چکا تھا سوچتا ہوا گیا کہ مسجد خواص پہونچکر کسی سے دریافت کرنا پڑے گا کہ حضرت مصلح الائمۃ کون ہیں اور کہاں مقیم ہیں، پھر اطمینان سے حضرت سے ملونگا مگر وہاں صورت عجیب پیش آئی وہ یہ کہ میں متجسناہ انداز میں جیسے ہی مسجد میں داخل ہوا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب یہاں کسی سے دریافت کروں کہ ایک دم سے ایک بزرگ شخصیت نے شاید میرا طالب علمانہ حلیہ

اور انداز تجسس دیکھ کر ہی مجھ کو پہچان لیا اور خود ہی آگے بڑھ کر مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑی آہستہ اور دھیمی آواز سے فرمایا "وصی اللہ" مزاج پر سی وغیرہ کی ضروری بات چیت کے بعد میں نے باہر جا کر کھانا کھانے کے لئے حضرت سے اجازت چاہی اور خیال تھا کہ ابھی واپس آتا ہوں لیکن مجھے کچھ دیر ہو گئی اور یہاں بعد عشا مسجد کی روشنی بجھا دی گئی اور شب خیز حضرات طریقہ مسنونہ کے مطابق بعد عشا فوراً ہی محو استراحت ہو گئے تھے اسلئے حضرت سے بھی اسوقت ملاقات نہ ہو سکی اور میں رات کی گاڑی سے الہ آباد چلا آیا۔

پھر اسکے بعد سے خط و کتابت جاری رہی اور کچھ دنوں بعد جی چاہا کہ حضرت حکیم الامتہ سے کم از کم بیعت ہی کی درخواست کروں اسکا ذکر پہلے اپنے حضرت مصلح الامتہ سے عریفہ میں کیا اجازت و توفیق معلوم ہو جانے کے بعد حضرت حکیم الامتہ سے درخواست کی جواب آیا کہ تعلیم کے زمانہ میں بیعت مناسب نہیں ہے جواب پڑھ کر مایوسی ہوئی اور اسی مایوسی میں حضرت مصلح الامتہ علیہ الرحمۃ کو بھی ایک عریفہ تحریر کیا جسکا جواب سراپا تسلی یہ آیا کہ "آپ اپنے کو حضرت ہی سے بیعت سمجھیں"

پھر دوسری بار حضرت مصلح الامتہ کی خدمت میں حاضری فتنہ پورہ ۱۹۴۲ء کے تاریخی زمانہ میں ہوئی جس سے کچھ ہی قبل اسٹیشنوں کی سوخت اور لائبنوں کی توڑ پھوڑ ہو چکی تھی اور اسکے بعض آئنا اسوقت بھی موجود تھے۔ الہ آباد سے اندازاً وہاں گھوڑی وہاں سے براہ کار سیا تھا۔ فتنہ پورہ پہنچا۔ حضرت والا کے مکان سے متصل جانب غرب مکتب کی عمارت میں قیام تھا اسوقت علیحدہ سے خانقاہ کے نام سے کوئی عمارت نہ بنی تھی۔ کھانے کا انتظام حضرت مصلح الامتہ کے دولت خانہ ہی سے تھا حضرت کی نشست گاہ ہی میں ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا مجھے کھلا دیا جاتا تھا۔ چونکہ کوئی خادم وغیرہ مکان میں نہ تھا اس لئے

حضرت والاہی کو یہ زحمت اٹھانی پڑتی یعنی اندر کھانا حضرت ہی کو بے نفس
لانا پڑتا لیکن کرتا کیا مجبور تھا بعد ظہر مجلس عام ہوتی جس میں قرب و جوار کے حضرات
اور باہر سے آئے ہوئے جہاں شریک ہوتے۔ اشراق کے بعد کبھی کبھی کبھی
مجلس خاص ہو جاتی تھی بالکل وہی صورت تھی جو حضرت حکیم الامتہ کی خانقاہ
اشرفیہ میں دیکھی تھی۔

اس دفعہ حاضری شاید دو تین ہی دن کے لئے ہوئی تھی اسلئے جی چاہتا تھا
کہ حضرت کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزرے چنانچہ حضرت والا سے مجلس
اور اوقات حاضری سے متعلق معلوم کرنا چاہا تو فرمایا کہ تم دور سے تھوڑے وقت
کے لئے آئے ہو جس وقت چاہو آجایا کرو چنانچہ دن کا اکثر حصہ حضرت ہی کی
خدمت میں گزرتا تھا۔

جب دایسی کا دن ہوا تو صبح حضرت نے نہایت شفقت و محبت کیسا تھ
ناشتہ کرایا اور دایسی کے سفر خرچ کے متعلق دریافت فرمایا کہ کرایہ ہے؟ پھر
فرمایا کہ کتنے روپے پاس موجود ہیں؟ احق کے عرض کرنے پر جب اچھی طرح اطمینان
ہو گیا کہ موجودہ رقم کرایہ کے لئے کافی ہے تو کوپا گنج کے ایک حاجی صاحب کے
ہمراہ (غالباً حاجی سلیمان صاحب مرحوم تھے) مجھے رخصت کر دیا۔ میں کوپا گنج
سے مو پھر وہاں سے الہ آباد چلا آیا۔

الہ آباد سے تال نر جانے والوں میں سبقت کا پہلو راقم السطور کے لئے
مقرر ہو چکا تھا بعد میں تو الدال علی الخیر کفاعلہ (بھلائی کا بتانے والا
بھی مانند کرنے والے کے ہے) کی صرف تسلی ہی بنکر رہ گیا۔

میرے ساتھ تو حضرت اقدس کی یہ کرم فرمائیاں رہیں لیکن افسوس کہ اتنا کارہ
(دومی) کا ساتھ محرومی نے نہ چھوڑا اسلئے عمل تو کچھ نہ سکا البتہ محبت اور تعلق کی وجہ سے
امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں اللہ تعالیٰ حضرت والاہی کے زمرہ میں فرمائے
کہ امر بمع مناجاء ارشاد نبوی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے۔
(انہی آ)

۴۔ ”مولوی قاری حبیب احمد صاحب مظاہری آپ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے فارغ التحصیل ہیں الہ آباد ہی کے ایک دیہات کے باشندے ہیں شہر کے ایک مشہور محلہ کٹرہ میں مینا شاہ کی مسجد میں آپ کے والد صاحب بچوں کو قرآن حفظ کراتے تھے ان کے وصال کے بعد لوگوں نے قاری صاحب موصوف ہی کو انکی جگہ مقرر کر لیا، اسوقت سے آپ اسی مسجد میں بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور اپنے آنے کے بعد مدرسہ کو ترقی دی اور حفظ و ناظرہ کے علاوہ فارسی اور ابتدائی عربی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا۔ نیز مسجد سے متصل زمین خرید کر اس پر مدرسہ کی مستقل عمارت تعمیر فرمائی۔ چنانچہ ”مدرسہ عربیہ نعمانیہ کٹرہ الہ آباد“ کے نام سے وہ ماٹھارا سوتا سوقت ترقی پر ہے۔ آپ کا تعلق بھی ہمارے حضرت مصلح الامۃ؎ سے ہوا اور حضرت والا کے الہ آباد تشریف لانے پر آپکو بھی استفادہ کا زیادہ موقع ملا۔ حضرت اقدسؒ نے آپکو بھی اجازت دی چنانچہ اکملہ حضرت کے صحیح طریقہ کار پر غمool اور گنمی کے ساتھ دین کی اشاعت کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔“

آپ نے اپنا واقعہ خود بیان کیا کہ میں دور سے آتا تھا اسلئے دیر ہو جاتی تھی لہذا مجلس میں پیچھے ہی جگہ ملتی تھی، ایک دن حضرت نے فرمایا قاری صاحب یہاں آگے تشریف لائیے چنانچہ مجھے قریب بٹھالیا۔ اسکے بعد سے جب آتا وہیں قریب بیٹھتا تھا۔ ایک دن پھر کچھ دیر ہو گئی تو پیچھے ہی بیٹھ رہا حضرت کی نظر پڑی تو فرمایا ”اور دور بیٹھو کہیں چھینٹ نہ پڑ جائے“ مجھے یہ سنکر بڑی ندامت ہوئی اسکے بعد سے قریب بیٹھنے کا اہتمام کرنے لگا۔

قاری صاحب فرماتے تھے کہ مجھے یہ بھی تمنا تھی کہ حضرت اور لوگوں کے سر پر ہاتھ مارا کر انکو متوجہ فرماتے ہیں کاش یہ ثمرت مجھے بھی نصیب ہوتا چنانچہ اسکے بعد ہی سے حضرت میری جانب بھی اسی طرح متوجہ ہونے لگے اور دونوں ہاتھ سے میرے سر پر تھپکی دینے اور متوجہ کرنے کیلئے میرا بھی سر ملانے لگے اور پھر تو بعد میں زور زور سے سر پر ہاتھ پڑنے لگا۔ حضرت انکو ٹھکی بھی پہنے ہوئے تھے اس لئے

بعض مرتبہ کٹاک سے وہ سر پر لگتی جس کی وجہ سے کچھ چوٹ بھی لگ جاتی تھی لیکن اس امر میں تخلف ہوتے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت والا نے بعد مجلس بوقت مصافحہ میرے سر کو اپنے سینہ مبارک کے قریب کر کے میرے کان میں پیچکے سے فرمایا کہ قاری صاحب آپچی تو ہین کرتا ہوں معاف کیجئے گا۔ حضرت کے اس فرمانے کی وجہ سے میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا۔

قاری صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ ایک دن فجر کے بعد میں اپنے کمرہ میں سو رہا تھا خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا انجن جو کہ بہت ہی خوبصورت بھی تھا میری طرف چلا آ رہا ہے اور تنہا انجن ہی تھا اس کے ساتھ ڈبے نہیں لگے تھے۔ مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ یہ انجن کیوں میری طرف چلا آ رہا ہے۔ اسی اثنا میں کسی نے حجرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا میں اٹھ کر باہر نکلا اور دریافت کیا کون ہے؟ تو ایک صاحب نے کہا کہ حضرت مولانا تشریف لائے ہیں رکشے پر میں فوراً نیچے گیا اور حضرت کو لیکر اوپر کمرہ میں آیا، خیر اس وقت تو مجھے کچھ خیال نہ ہوا لیکن کچھ دنوں بعد پھر جب خواب یاد آیا تو ذہن گیا کہ اچی وہ انجن ہمارے حضرت والا ہی تھے ہماری اپنی گاڑی کا چلنا حضرت ہی کی ذات مبارک سے وابستہ ہے۔

ایک اور واقعہ حضرت کی کرامت کے سلسلے میں قاری صاحب سے سنا فرماتے تھے کہ میرے استاد مولوی جلیل صاحب بتلاتے تھے (اور مولوی صاحب موصوف کو حضرت اقدسؒ سے احقر ہی نے ملایا تھا) کہ میں اپنے چھوٹے بچے کو لیکر ایک دن حضرت کی مسجد میں حاضر ہوا میں ابھی وضو ہی کر رہا تھا کہ وہ اندر جا کر نماز پڑھنے لگا اسی وقت حضرت والا بھی تشریف لائے دیکھا کہ بچہ دعار مانگ رہا ہے۔ جب وہ دعار سے فارغ ہوا تو حضرت نے انگلی کے اشارے سے اسکو بلایا اور اس سے فرمایا کہ تم کیا دعار مانگ رہے تھے اس نے کہا کہ حضرت میرا بھائی پاکستان میں ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعار مانگ رہا تھا کہ یا اللہ تعالیٰ میرے بھائی صاحب آجائیں۔ حضرت نے برحمتہ فرمایا اچھا گھر جاؤ وہ آگئے ہیں۔ چنانچہ

نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ جب گھر پہنچے دیکھا کہ واقعی وہ لڑکا آچکا تھا میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کوئی شان نہ گمان حضرت کو اسکا آ جانا کیسے معلوم ہو گیا اور کس طرح حضرت نے میرے بچے سے فرمایا کہ جاؤ وہ آگئے ہیں، سوا اسکے کہ یہی کہا جائے کہ یہ حضرت والا کا صریح کشف اور کھلی کرامت تھی۔

(قاری حبیب احمد صاحب کا ایک فیضہ حضرت مصلح الامتہ کے نام)

عرض حال : ابتداء سے جب سے کہ اصلاحی تعلق پیدا ہوا آج تک کبھی بجز اللہ اسکا وسوسہ بھی نہیں آیا کہ میں کسی کو بیعت کروں، ہمیشہ ہمہ تن اپنا ہی غم رہا جب کبھی کوئی اس قسم کی فرمائش کرتا ہے تو حیرت اور بہت ہی ندامت ہوتی ہے سمجھا بجھا کر اسکو اپنے سے بے فکر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی بھی آج تک یہ نہیں ہوا کہ جی خوش ہوا کہ اچھا ہے ایک آدمی ہاتھ لگا۔ اگر کوئی نہ مانا تو حضرت کی خدمت اقدس میں عرض کیا اس شرمسار و بدکار کو اسکا بچہ اہتمام رہتا ہے کہ اپنی وجہ سے دین اور اکابر دین کی کسی درجہ میں بدنامی و انگشت نمائی نہ ہو۔

ارشاد مرشد : اللہ تعالیٰ آپ کے ارادہ میں برکت عطا فرمائے۔

عرض حال : مجھ سے بڑھ کر قیامت اور دنیا میں کون رو سیاہ ہوگا اگر محبوب بندوں کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں میری وجہ سے برا وسوسہ بھی پیدا ہونے لگے حق تعالیٰ ہی سے استمداد ہے کہ اس نسبت قدسیہ کی حفاظت فرمائے جو آئینہ سے بھی زیادہ نازک ہے۔ بندہ میں ایسی طاقت کہاں۔ حضرت سے تعلق محض حفاظت دین و ایمان کے لئے پیدا کیا ہے۔ بڑی خواہش یہی ہے کہ سنت کی حلاوت کو طمع نصیب نہ جائے

ارشاد مرشد : آمین۔ آمین۔

عرض حال : عزت و جاہ کے بارے میں حضرت ہی کی جوتیوں کے طفیل میں یہ عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ یہ چیزیں اپنی جدوجہد سے حاصل نہیں ہوسکتیں، خدا جب چاہتا ہے عنایت فرمادیتا ہے۔

ارشاد مرشد : بیشک، بیشک
 عرض حال : انہی طلب شعبہ دنیا ہے بالخصوص دین کی راہ سے قابل گریہ ہے۔
 حضرت والا سے بھی دعا کی درخواست ہے انشاء اللہ تعالیٰ یہ خادم کبھی امانت میں نجات
 کا قصد نہیں کر سکتا۔

ارشاد مرشد : دعا کرتا ہوں۔
 عرض حال : حق تعالیٰ صدق اور اخلاص نصیب فرمائے، روز و شب
 ایسی سعی میں ہوں کہ دونوں جہان میں کام آوے تاکہ آخرت میں نجات اور دنیا میں
 حیوۃ طیبہ نصیب ہو۔

ارشاد مرشد : آمین۔ آمین (رجسٹریٹڈ ۱۷۱)

(دوسرا ایک خط ملاحظہ فرمائیے)

عرض : بحمدہ تعالیٰ ... نہایت شوق و ذوق سے ہر کام ادا ہوتا رہتا ہے طبیعت
 ہلکی رہی اور کسی قسم کا تھکان وغیرہ نہ رہا تو ثمرہ عاجلہ یعنی کیفیات وغیرہ سے بھی محرومی
 نہیں رہتی لیکن کسی حال میں کبھی بھی اس ثمرہ کے عدم سے متاسف نہیں ہوتا۔
 ارشاد : بارک اللہ۔

عرض : معمولات پر استقامت کی توفیق کو خواہ کسی حال اور کسی طرح ہو ہزار نعمت
 سمجھتا ہوں۔ ظاہر و باطن تیزی کے ساتھ اپنے کام میں لگ رہے ہیں۔ قلب میں
 قوت یادداشت الہی اور عقیدت و محبت مرشد کا روز افزوں عقلاً و طبعاً اضافہ محسوس
 کر رہا ہوں۔ نماز میں دل ہدیت و عظمت الہی سے اکثر اوقات دبا ہوا پاتا ہوں۔ اکثر
 ذات پاک کی طرف توجہ رہتی ہے۔

ارشاد : الحمد للہ۔ الحمد للہ۔

عرض : ایسی نماز اس عاجز کو آج تک نصیب نہیں ہوئی تھی جیسی پیہم صحبت بابرکت
 کی بدولت ہو رہی ہے۔ صبح کی مجلس میں ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ تمام دن اسکا اثر

باقی رہتا ہے۔

ارشاد : مبارک ہو۔ مبارک ہو۔

عرض : مجلس کی حاضری میں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا جنت میں بیٹھا ہوا ہوں۔ الحمد للہ دنیا و مافیہا بھولی رہتی ہے۔

ارشاد : الحمد للہ۔ بارک اللہ۔

عرض : مجلس ختم ہوتے ہوتے ہر دن قلب میں ایک نئی لذت اور جدید مہمت اور حوصلہ لیکر اٹھتا ہوں۔ بیچ یہ ہے کہ ساری عمر میں ایمان کی لذت اب کچھ مل رہی ہے اور ایمان کے راستوں سے اب کچھ روشناسی ہو چلی ہے۔

ارشاد : الحمد للہ۔

عرض : شکوہ بر شکوہ یہ کہ الہ آباد کی تشریف آوری کی نعمت غیر مترقبہ سے نوازا۔ ان حضرات کو بھی حق تعالیٰ جزا و غیر عطا فرمائے کہ جنہوں نے حضرت والا تک ہمکو پہنچایا اور جنہوں نے اپنے کو اس طرح پیش فرمایا کہ حضرت والا نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے قیام فرمایا۔ اور ہم تشنہ کام خدام الہ آباد کو ابنی عنایت و کرم کی بارش سے سیراب فرمایا

ارشاد : یہ سب افضال خداوندی ہے۔

عرض : (حضرت والا کی مجلس میں سنا ہوا) راہب کا یہ جملہ کہ ”اے صنیعی ایک ساعت کی مشقت ابد الہ آباد کی راحت کے لئے برداشت کر لے“ تمام اعمال میں بجلی کا کام دیتا ہے۔ اور حضرت کا یہ آیت تلاوت فرمانا کہ بِئْسَ دَلِيلًا بَدَلًا اکثر دہراتا رہتا ہوں اور بیشمار نفع ہوتا ہے۔

ارشاد : الحمد للہ۔

عرض : نیز اس ارشاد کی تکرار بھی اپنے لئے اکسیر اعظم پاتا ہوں کہ اگر ہمارے باطنی عیوب پر لوگ مطلع ہو جائیں تو منہ پر اس قدر تھوکیں کہ ہم منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں، اللہ تعالیٰ کی ستاری کہ وہ ہماری حفاظت فرماتا ہے۔

ارشاد : بیشک۔

عرض : اسکی برابر کوشش کرتا ہوں کہ ہر کام خدا کے لئے ہو اور نیت خیر کے ساتھ ہو
نیت کا اہتمام کرتا ہوں۔ حضرت نے اپنی خاص عنایت سے اس طرف توجہ دلا کر قرب کے
ایک بڑے وسیلہ سے روشناس فرمادیا۔
ارشاد : بیشک یہ قرب کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔

(قاری حبیب احمد صاحب کا تیسرا خط سفر حج میں جاتے ہوئے)

عرض : ہم خدامِ جہوت رخصت ہوئے حضرت کا مزاج مبارک کچھ نا ساز تھا اسلئے
جی لگا ہوا ہے حق تعالیٰ کے دربار عالی میں درخواست ہے کہ حضرت کو شفا کے کامل
عنایت فرمائے امید کہ اب طبیعت ٹھیک ہوگی
ارشاد : الحمد للہ ٹھیک ہے۔ میری طبیعت آپ لوگوں کی طبیعت ٹھیک رہنے
سے ٹھیک رہتی ہے۔

عرض : حضرت والا کی دعاؤں سے سید آرام رہا۔ ہمارے ڈبہ میں صرف حاجی ضا
تھے اس ناکارہ خادم کو حضرت والا کے صدقہ میں تمام رفقا سفر نے بہت آرام پہنچایا
بہت خیال رکھتے تھے۔

ارشاد : کیا یہی سب اس سفر کا مقصد اعلیٰ ہے۔ انا للہ۔
عرض : جس دن سے حضرت نے یہ فرمایا ہے کہ یہ میرا ہے (اگرچہ اس روسیاء کے
اطوار ایسے نہیں) سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ کے بندے کس قدر خلوص و محبت سے پیش
آتے ہیں۔ یا اللہ! اپنے نیک بندوں کے ظن کے مطابق اس نامہ سیاء کو بھی نیک فرما دے
اور حضرت ہی کے صدقے میں آخرت کی عزت بھی نصیب فرما اور شرمساری سے بچا۔

ارشاد : میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔

عرض : حضرت والا نے فرمایا تھا کہ تین چیزیں خلاصہ تصوف ہیں۔ ازالہ غفلت۔ دفع
رذائل اور حذر خواطر۔ الحمد للہ مختصر نسخہ سنکر سید خوشی ہوئی اور اسی وقت سے پتلے
باندھ لیا۔

ارشاد: صرف خوشی سے کیا کام چل سکتا ہے۔
 عرض: ذہن میں برابر انکا تکرار کرتا رہتا ہوں اور عمل کی کوشش کرتا ہوں۔
 اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچہ نفع محسوس کر رہا ہوں۔
 ارشاد: اگر یہ سب ہے تو غنیمت ہے۔
 عرض: دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس سفر کا ہم لوگوں کو کامل نفع نصیب فرمائے اور
 اس دنیا کے دوں سے نفرت عنایت فرما کر اپنا بنائے۔
 ارشاد: آمین۔

۱) اسکے ہمراہ یہ تحریر بھی بھیجی گئی (سفر حج میں اصل نکر یہ ہونی چاہیے کہ جا تو رہا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم قبول فرمائیں تو سب کچھ ہے ورنہ سارا سفر ایک تعب ہی ہے اور احباب کی خدمت بھی سب ضایع۔ آپ نے اپنے خط میں مقصود کا ذکر تک نہیں کیا اور جو چیز بالکل غیر مقصود تھی اسکا سب سے پہلے ذکر کیا۔ یہ کیوں؟ اگر ان سب باتوں کا ذکر اسلئے کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک احسان کا جو اپنے اوپر ہے ذکر مقصود ہے تو خیر کر سکتا ہے لیکن اپنے شیخ سے جس کے سامنے فنا ہو کر پیش ہونا چاہیے اس قسم کے عزائم سے اپنے کو پیش کرنا تو کسی طرح مناسب ہی نہیں تھا۔ بڑے لوگوں کی نظر بڑی چیزوں پر رہتی ہے۔ ایک عالم نے حضرت والا کو اسی سفر سے لکھا تھا کہ "حضرت سرتنگوں جا رہا ہوں" اور چھٹ بھیا لوگوں کی نظریں انھیں چیزوں پر محصور رہتی ہیں۔ اس قسم کے لوگ اس زمانہ میں زیادہ ہیں۔
 یہ اسلئے کہا جا رہا ہے کہ اگر ان چیزوں پر نظر جم گئی تو یہ کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ نہایت مضر ہے۔ بہت لوگوں نے انھیں چیزوں میں مشائخ کو لے لیا ہے، یعنی انھیں اپنے درجے سے گرا دیا ہے، والسلام۔

(موصوف کا چوتھا خط سفر حج سے واپس آنے کے بعد)

عرض: مجلس مبارک کی برکت سے دل میں محبت الہی اور عظمت و تعلق کا روز افزوں فنا

پاتا ہوں۔ ارشاد : ماشاء اللہ۔
 عرض : محبت الہی سے زیادہ کسی چیز میں لذت نہیں پاتاؤں کی غذا ہی محبت الہی ہے۔
 ارشاد : خوب بیشک یہی بات۔
 عرض : معاصی سے قلبی نفرت اور طاعت کی طرف طبعی رغبت بڑھتی جا رہی ہے۔ لوگوں کے معاملات سننے سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ ارشاد : الحمد للہ۔
 عرض : ہمہ وقت کیسوی کے اسباب پر نظر رہتی ہے اور اسکو حق تعالیٰ کی ایک نعمت عظمیٰ سمجھتا ہوں۔
 بدون اس کے حق تعالیٰ سے تعلق رہنا مشکل ہے۔ ارشاد : بیشک یہی بات ہے۔
 عرض : پوری نماز میں بار بار توجہ کی تجدید کرتا ہوں اور باری تعالیٰ سے ادائیگی حق کے قصور کا اعتراف کرتا رہتا ہوں۔ ارشاد : خوب بات ہے۔
 عرض : اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرت والا کے صدقہ میں "احسان" نہیں تو اسکی ادنیٰ جھلک ضرور پاتا ہوں۔ وہ عارفائیں اللہ تعالیٰ پورا احسان نصیب فرمائیں۔ ارشاد : ماشاء اللہ۔ دعا کرتا ہوں۔
 عرض : تلاوت کا بھی یہی حال ہے کہ اس کا انداز طبعی طور پر بہت بدل گیا ہے۔ بجائے ادھر ادھر جانے کے دل ادھر ادھر کے خیالات سے جان بچا کر زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ارشاد : خوب۔ الحمد للہ۔
 عرض : نماز و تلاوت ختم کرتا ہوں تو دل میں ایک بڑے رنج کا اثر محسوس کرتا ہوں کہ انیسویں بڑا قصور ہوا ادنیٰ حق بھی ادا نہ ہوا یہ عمر جو گزر رہی ہے واپس نہیں آسکتی قصور کا یہ حال ہے کس طرح منہ دکھاسکوں گا۔ بعد طاعات استبشار شاذ و نادر ہی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ استغفار کرتا رہتا ہوں اور دل سے نادم ہوتا ہوں۔ ارشاد : بہت مبارک حال ہے۔
 عرض : دل کا ہمہ وقت تقاضا ہے کہ عیدِ مخلص بننے کی جلد از جلد کوشش کر۔ چنانچہ برابر زیادہ "اخلاص" کی کوشش کرتا ہوں۔ الحمد للہ کہ حضرت کے یہاں یہ چیز بہت بڑی ملی۔ ارشاد : الحمد للہ علی احسان۔
 عرض : دونوں پاک درباروں میں اسی کی بہت زیادہ دعا مانگی۔ ارشاد : خوب کیا۔
 عرض : اپنی سعادت سمجھ کر دونوں درباروں میں حضرت اور حضرت کے متعلقین کیلئے خوب ہی دعا کی بالخصوص فلاح دارین اور خدمت دین کی مزید توفیق مزید اخلاص و مقبولیت کی۔ ارشاد : بہت خوش ہوا خدائے تعالیٰ۔
 بڑا احسان کیا۔